سوندھی مٹی کے بت



اقبال متین

سوندھی مٹی کے بُت

شخصیات

اور

خاکے

اقبال متین

کتاب ــــــ "سوندھی مٹی کے بت"

مصنف ــــــ اقبال متین

موضوع ــــــ شخصیات اور خاکے

سرورق ــــــ عزیز

کتابت ــــــ فضل محمد خوشنویس 18.7.425/83
روڈ نمبر (7) بھوانی نگر۔ حیدرآباد ۔ 2

طباعت ــــــ اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد

ناشر ــــــ مکتبہ شعر و حکمت، پنجہ گٹہ

تعداد ــــــ (۷۰۰)

طابع سرورق ــــــ اعجاز پرنٹنگ پریس

قیمت ــــــ ہندوستان میں ۹۷ روپے
بیرونی ممالک میں۔ آٹھ پونڈ ۔ دس ڈالر
بارہ ریال

سنہ اشاعت ــــــ ڈسمبر ۱۹۹۵ء

ناشر :- مکتبہ شعر و حکمت 6-3-659/2
کیاڈیہ لین ۔ پنجہ گٹہ ۔ ۴۸۲ ۔ ۵ حیدرآباد

آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی اور
ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کی جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی۔

کتاب ملنے کے پتے

- مکتبۂ شعر و حکمت :- 2/659-3-6 کیاٹھ پیلس پنجہ گٹہ، حیدرآباد - 500482
- سیل کاونٹر - روزنامہ "سیاست"، جواہر لال نہرو روڈ - حیدرآباد
- حسامی بک ڈپو - مچھلی کمان، حیدرآباد
- مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ - دلی - بمبئی - علیگڑھ
- نصرت پبلیشرز - حیدری مارکٹ، امین آباد - لکھنو - 226018
- شب خون کتاب گھر - ۳۱۳ رانی منڈی - الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳
- انشاء پبلیکیشنز - 25.B زکریا اسٹریٹ کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳
- بک امپوریم ——— سبزی باغ - پٹنہ ۴ -
- کہانی کتاب نگر - نظام آباد
- الکتاب، گن فونڈری - حیدرآباد
- اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش اے سی گارڈ - حیدرآباد -

فہرست

شخصیات

صفحات

دیدہ

۱) شعور کی شخصیت، مخدوم محی الدین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰
۲) صبا در دیدہ، سلیمان اریب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۹
۳) سرگوشی، شاذ تمکنت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶۶
۴) چھیڑ خوباں سے، ڈاکٹر سید عبدالمنان ۔ ۔ ۔ ۔ ۹۲
۵) سنگ مرمر کا گداز، حسن چشتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۱۴
۶) سن برج کے شمس، مولانا ابراہیم ہارون سیٹھ ۔ ۔ ۔ ۱۴۶

نا دیدہ

۷) کہانی بغیچے سے اڑی بلبل کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۶۰
۸) میاں خستہ کا لرٹکین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۷۶

صفحات

خاکے

۹۔ آوارۂ خلوص، لطیف ساجد ۱۸۷
۱۰۔ عرفان گزیدہ تمکین سرمست ۲۱۱
۱۱۔ بھیا صاحب، پروفیسر یوسف سرمست ۲۲۱
۱۲۔ سرخ ٹیلیفون، راشد آذر ۲۳۶
۱۳۔ سیل بند بوتل، ڈاکٹر غیاث صدیقی ۲۴۹
۱۴۔ گلہ نہیں ہے صدائے فقیر ہے بابا، ابراہیم شفیق ۲۶۴

پوشیدہ

۱۵۔ ایک ناتراشیدہ بت خود ساختہ
مولانا سید فخرالدین ۲۷۵

لیل و نہار

۱۶۔ تعارف نامہ ۳۳۹
۱۷۔ بسیرے ۳۴۵

انتساب

مُغنی تبسّم کے نام

وہ خود سے انتقام لیے صدائی
وہ خود ہی بے دلی سنبھلی ہوئی سی

اقبال متین

شخصیّات

دیدہ

اقبال متین

شعور کی شخصیت

مخدوم

آمد ۴ فروری ۱۹۰۸ء ۔ ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء رخصت

جیتیا شاہ ولی کا عرس ہے۔ درگاہ کے گنبد روشن روشن سے ہیں۔ جھل مل کرتے دیئے گنبد کے اطراف منڈیروں پر سجے ہوئے اپنی نورانی پلکیں جھپکا رہے ہیں۔ درگاہ کے وسیع احاطے میں کئی چوبی شہتیر ادھر ادھر گڑے ہیں۔ جن پر پٹرومکس ٹنگے ہیں۔ سارا ماحول بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ جیتا پور کی اندھیری راتوں نے اس سے پہلے ایسی روشنیاں کبھی نہیں دیکھیں۔

درگاہ کے کلس تک اس طرح چمک رہے ہیں جیسے ان پر آسمان سے دھوپ نچھاور کرنے والا سورج اب زمین سے دھوپ اچھال رہا ہو۔

مشاعرہ شروع ہونے میں ابھی دیر ہے۔ میرے چچا تمکین سرمست شعراء کو مدعو کرنے کے لیے حیدرآباد گئے ہوئے ہیں۔ تار کے ذریعہ اطلاع

دی ہے کہ مخدومؔ آرہے ہیں۔ ٹرین کا وقت قریب آرہا ہے۔ دو روز پہلے ہی سے درگاہ کے احاطے میں خیمے تان دیئے گئے ہیں۔ اباکو بس ایک ہی فکر ہے۔ شاعروں کے آرام کے خیال میں وہ بے آرام ہوئے جارہے ہیں۔ ایسے بڑے بڑے شاعر جیتاپور کی تاریخ میں پہلی بار مشاعرے میں شرکت کررہے ہیں۔ مشاعروں کے لئے جو خیمے مختص کیے گئے ہیں ان کا معاینہ ابا نے دن کو ہی کرلیا۔

پرال کی گھاس پر شطرنجیاں، شطرنجیوں پر توشکیں اور گدیلے، ان پر بھک سفید چاندنیاں ـــــ یہ ہوا خیموں کا اندرونی کروفر ـــــ برآمدوں میں کرسیاں بکھری ہوئیں ـــــ اندر باہر پیٹرومکس جل رہے ہیں ۔ ابا کچھ مطمئن سے ہیں ـــــ جیسے سارے ماحول میں بے چینی سی پھیل گئی ہے ۔ ابا پذیرائی کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں ـــــ میں لطیف ساجدؔ، حسینی شاہدؔ کچھ فاصلے پر پیچھے پیچھے ہیں ـــــ بڑے لوگوں کو دیکھنے کا اشتیاق اب اضطراب بن گیا ہے۔

حضرت تمکینؔ سرمست ابّا سے تعارف کروا رہے ہیں ـــــ

علی صائبؔ میاں، نذیرؔ دہقانی، صمد رضوی ساز۔ صاحبزادہ میکشؔ مخدوم محی الدین، شعیب حزیںؔ ـــــ ابا رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں ۔ ابا سب سے گرمجوشی اور خلوص سے مصافحہ کررہے ہیں ـــــ لیکن مخدومؔ سے ملے ہیں تو اپنی وضعداری بھول گئے ہیں ۔ مصافحے کی جگہ معانقے نے لے لی ہے۔ کہہ رہے ہیں۔

تمکینؔ کے خط سے مجھے آپ سب کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔

لیکن صرف آپ کی مصروفیتوں نے مجھے مایوس کردیا تھا۔ آج تار ملا کہ آپ بھی آرہے ہیں ـــــ دو نوجوان سہمے سہمے مخدوم کے پیچھے سے کچھ اس طرح برآمد ہوئے جیسے کہ ان کی پناہ میں تھے ـــــ ایک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جیسی کوئی شئے تھی دوسرے کے ہونٹوں پر کچھ بھی نہ تھا البتہ آنکھوں میں کچھ حیرانی سی تھی۔ مجھ سے زیادہ شاہد اور ساجد کے جانے پہچانے تھے۔ ساجد سے تو وہ زیادہ ہی قریب لگتے تھے۔ چچا صاحب نے تعارف کرایا۔ ابا نے مصافحہ کرکے پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ رکھا نظر حیدرآبادی، سلیمان اریب۔

میں امی کے پاس بھاگا کہ ساری خواتین سے مخدوم کا تعارف کروانے کا سہرا اپنے سر باندھ لوں ـــــ مخدوم کونسے ہیں ـــــ کہاں ہیں مخدوم؟ مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہورہا ہے۔ امی، چچی ماں، پھوپی جان اور جانے کون کون خواتین جمع ہیں۔ سبھی سے میں ذرا اپنی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہتا ہوں۔

ارے بابا میں آیا ہی اس لئے ہوں کہ آپ لوگوں کو بتلا دوں۔

مخدوم کون ہیں۔

چلمنیں، ہمین پردے، اب کچھ اسطرح ہلنے لگے ہیں، جیسے ہوا کے جھکڑ چل رہے ہوں ـــــ شاہی سے مخدوم کی نتیجہ آزمائی نے اپنی اولین کشاکش میں انھیں ہیر دینا دیا ہے۔ چچا صاحب نے یہ راز کی باتیں اپنے حسنِ بیان کی داستان زیبی کے سہارے خواتین کے کانوں میں کچھ اسطرح پھونکی ہیں کہ انھوں نے اپنی کانوں سنی آنکھوں کو سونپ دی ہے۔ شعرا اپنے خیمے کی طرف

پڑھ رہے ہیں ــــ وہ رہے مخدوم   وہ وہ رہے   ابھی جنھوں نے اپنے بال برابر کیئے ہیں۔ ہاں ہاں وہی ــ لمبے لمبے بالوں والے نہیں جی بال اتنے لمبے بھی کہاں ــ کیا یہین رکھا ہے؟ــــ یہین رکھا ہے یہین رکھا ہے۔ کسی نے دیکھا کسی نے نہیں دیکھا۔ میں اپنی اہمیت جتلا چکا تھا۔ اب مجھے کیا کسی نے نہ بھی دیکھا ہو۔ پھر میں شعراء کے کیمپ میں چلا آیا۔

کتنی اہمیت تھی میری خواتین کے کیمپ میں۔ــــ اس خیمے میں آکر مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں کچھ ہوں ہی نہیں۔ــــ ہر ایک کا منہ تکتا ہوں پھر ذہن میں ان کے ناموں کا ورد کرتا ہوں۔ــــ لیکن ہر پھر کر نظر مخدوم محی الدین پر ہی ٹک جاتی ہے۔ چہرے مہرے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ آنکھیں اُن کو دیکھنے کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں۔ سارے شاعر ہنس بول رہے ہیں۔ لیکن مخدوم کچھ مطمئن نظر نہیں آتے جانے کس چیز کی کمی ہے۔ وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ احباب کے لئے کچھ ہنس بھی لیتے ہیں۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اندر سے کچھ ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں کامریڈ رندیوے کی کوئی کتاب ہے دونوں پاؤں فرش میں دھنس رہے ہیں۔

تمکین صاحب سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں۔

انتا آرام کہ جی گھبرانے لگے۔

تمکین صاحب مخدوم کے مداحوں میں ہیں ــــ اُن کو مشاعرے

یں مدعو کرنے سے پہلے ہی انھوں نے گھر بھر میں مخدوم کی بہت سی باتیں کی ہیں۔ انھوں نے بہت رفیقانہ پوچھا۔

"کیوں؟ ـــــ کچھ مطمئن نہیں ہو۔"

کہا ـــــ ہاں زیادہ آرام کی بے آرامی سے غیر مطمئن ہوں۔

تمکین صاحب بات کی تہہ تک پہنچ نہ سکے ـــ کہا

"کچھ دیر آرام کرنا چاہو تو پلنگ لگوا دوں۔"

مخدوم مسکرائے ـــــ کہنے لگے ـــــ میں مزید کچھ منگوانے کی بات نہیں کر رہا ہوں، جو ہے اس کو اٹھوانے کی بات کر رہا ہوں ـــــ آپ لوگوں نے تو یہ احساس ہی چھین لیا کہ ہمارے پیر زمین پر ہیں ـــــ شاعروں کو ہمیشہ اپنے پیر زمین پر رکھنے چاہئیں" ـــ

مجھے مخدوم سب سے مختلف کچھ نرالے سے لگے ـــ میں کونے میں کھڑا انھیں تکتا اور سوچتا رہا کہ یہ عجیب فقیر منش آدمی ہے ـــ ایسی بھی کیا قلندری کہ آدمی اپنی راہ سے پھول ہٹا کر کانٹے بچھانے کا مطالبہ کرے ـــــ

مشاعرہ شروع ہونے والا ہے۔ سامعین اور مقامی شعراء حیدرآباد کے بڑے شاعروں کے منتظر ہیں ـــــ مگر وہ ابھی مشاعرہ گاہ کی طرف چلنے کیلئے مائل نہیں ہیں ـــــ شغل جام و مینا شباب پر ہے ـــــ مشاعرہ شروع کروا دیجئے تمکین صاحب! بس ہم آتے ہی ہیں ـــ کسی نے کہا۔

مخدوم اٹھ کھڑے ہوئے ـــــ کہنے لگے ـــــ

نہیں نہیں یہ بری بات ہے ـــــ وہاں بھی بہت

سے شاعر ہیں جو ہمارے منتظر ہیں ___ ہم سے سننا اور
ہمکو سنانا چاہتے ہیں" ___ مخدوم کا اٹھنا تھا کہ
محفل تحیات و دعائیات ساتھ ہوئی ۔

لطیف ساجد نے مجھے ٹہوکا دیا ___ حسینی شاہد یوں مسکرایا جیسے
ساحر یہ زندہ باد کا نعرہ لگا رہا ہو ___ کوئی احترام، کوئی بے نام سی عظمت
سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہی تھی ۔

مشاعرہ شروع ہوا ۔ مقامی شعراء کے بعد مہمان شعراء نے نظمیں اور غزلیں
سنائیں ۔ خوب خوب داد حاصل کی ___ نظر حیدرآبادی صاحبزادہ میکش اور شعیب حزیں
نے سماں باندھ دیا ___ اس مشاعرے کے سب سے نو عمر شاعر لطیف ساجد تھے ۔
چنانچہ مہمان شعراء میں اُن کا نام سب سے پہلے پکارا گیا ۔

لطیف ساجد

ترنم میں پڑھتے تھے اور ڈوب کر پڑھتے تھے ___ ابھی کالج کے
طالب علم ہی تھے کہ مخدوم نے اُن کی آمد آمد کا مژدہ اہل ذوق کو سنا دیا تھا ۔
اس کم عمری میں زبان پر ایسی دسترس ، لہجے میں ایسا گداز کہ شعر کی تہ داریاں نکھر
جاتیں ___ تیور کہہ رہے تھے کہ مستقبل اُن کا منتظر ہے لیکن اس میرے
عزیز ترین دوست نے ۔ اس بار طرحدار نے مستقبل کو انتظار کی زحمت ہی نہیں
دی اور اس درجہ شتابی سے نکل گیا جیسے محفل میں آیا ہی نہیں تھا ___
میرا حیدرآباد دفنانے اور دفنا کر بھول جانے کے ہنر میں بڑا مشاق ہے ۔

لطیف ساجد نوجوانی میں مرگیا تھا، کچھ اور زندہ رہتا تو شاید حیدرآباد کی توقیر کے سامان اردو شاعری کی وسیع مملکت میں فراہم کرتا اور اپنے وطن کے ناموس کو سرفراز کرتا۔ ہندو پاک کے موقر جرائد میں ابھی ابھی اس کا کلام شائع ہونے لگا تھا ــــ باہر سے اگر آپ اپنی توقیر اور ناموس کا سامان فراہم کرتے ہیں تو میرا حیدرآباد آنکھ اٹھا کر آپ کی طرف ایک نظر دیکھ سکتا ہے ــــ وہ خود سے کسی کو کچھ نہیں دیتا ــــ ہنستا بستا قبرستان آپ نے کیوں دیکھا ہو گا۔ اُداس آنکھیں ــــ شعر میں ان ہی آنکھوں کی اداسیاں شاید گھل مل گئی تھیں ــــ سنا رہے ہیں۔ ــــ

آخر آخر شکستگی دل کی
زندگی کے شعور تک پہنچی

سلیمان اریب

سلیمان ادیب سنبھل کر اُٹھے ہیں ــــ گورا چٹا رنگ، تیکھے نقوش، بشرہ بتا رہا ہے کہ میں شاعر ہوں ــــ چہرے پر چیچک کے داغ لگتا ہے انھوں نے بڑے چاؤ سے سجا رکھے ہیں ــــ اس کے باوجود پرکشش شخصیت لانبے سنہری بال ــــ زندگی کو شاید ابھی یہ اندازِ دگر نہیں دیکھا ہے ــــ ابھی تو چلنا اور چاہے جانے کے دن ہیں۔ یا پھر خود انھوں نے اس مدت جمیل کو توسیع دے رکھی ہے ــــ ان منزلوں سے گذر کر سلیمان اریبا

نے جلد ہی عروسِ حیات کے چہرے سے جب اُس کا گھونگھٹ الٹا تو اسی لغزشِ پا نے اور دور تک اُن کا ساتھ دیا جس کے بل بوتے پر وہ اردو شاعری کی زلفیں سنوارنے چلے تھے۔ لیکن عروسِ حیات گریزاں تھی۔ ترنم میں زیرِ لب مسکراتے ہوئے سُنا رہے ہیں۔ عنوان ہے بنتِ عم سے۔

گوری باہیں مری گردن میں حمائل کر دیں
مجھ میں اللہ میں خود بینیاں حائل کر دیں

نظر حیدرآبادی

سانولا سلونا رنگ — دکن کا یہ شاعر بہت تیزی سے مقبولِ خاص و عام ہوتا جا رہا ہے — شاعری ورثے میں ملی ہے۔ علی اختر کا بیٹا حضرتِ باغ کا پوتا جن کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا۔ یہ وہی علی اختر ہیں جن کے قولِ فیصل کو علامہ نیاز فتح پوری نے کبھی جوش ملیح آبادی کے حرفِ آخر پر فضیلت دی تھی — نظر حیدرآبادی ترنم میں پڑھتے ہیں۔ رنگ اتنا کم ہے کہ گندمی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن نقوش ایسے تیکھے ہیں کہ دیکھنے والے کی آنکھوں کو چہرے کی کشش اپنا لیتی ہے۔ پاٹ دار آواز اور آواز کے زیر و بم پر ایسی قدرت کہ بیتیاں لگ کر مزہ دیتی ہیں۔ بہت اطمینان سے نغمہ سرا ہیں۔ شہرت حیدرآباد سے آگے نہ جا سکی ورنہ ہندوستان کے اچھا پڑھنے والے اچھے شاعروں میں شمار ہوتا۔ کراچی میں پیوند خاک ہوئے۔ وہاں ان کی مقبولیت کا جانے کیا حال رہا۔ لیکن میرا یہ مضمون ماہنامہ "دائرے

کراچی میں شائع ہوا تو اس رسالے کے مدیر اعلیٰ نے یہ حاشیہ آرائی کی تھی کہ وہ وہاں کی محفلوں کے بھی روحِ رواں ہیں - یہ پڑھ کر کتنی خوشی ہوئی تھی -

نغمہ سرا ہیں سہ

فسانہ سُنانے کو جی چاہتا ہے
انھیں بھی رُلانے کو جی چاہتا ہے

علی صائب میاں

لیجئے صاحب مشاعرے کے سنجیدہ ماحول میں کچھ پھلجھڑیاں بھی تو چھوٹیں دراز قد کا یہ شاعر کہیں سے شاعر نظر ہی نہیں آتا - ایسے بھورے دیدے جن کی بے وفائی جھوٹ موٹ شہرت پا کر رہ گئی ہے - کھلا رنگ لیکن اس گورے پن میں بھی چہرے پر دور دور تک کوئی ایسا بَرتو نہیں جو دیکھنے والوں کی نظروں کو گھڑی بھر اپنے پاس ٹھہرا سکے - نہ دیکھو تو آنکھیں دیکھنے کا تقاضا نہیں کریں گی - اور جو دیکھو تو کسی نہ کسی بہانے کچھ اور تلاش کریں گی - وردی پہنا دو تو پھکڑ فوجی لگے - کمبل اوڑھا دو تو جانگلو کسان لگے - حیدرآباد کی کھڑی بولی میں شعر کہتے ہے اور خود بھی ہمیشہ بیٹھا ہو بھی تو کھڑا کھڑا لگتا ہے - مقامی زبان میں اس کی شاعری سچ پوچھئے تو شاعری کا حق ادا کرتی ہے تحت میں اسطرح پڑھتا ہے جیسے گھاس کاٹ رہا ہو - لیکن جب اپنی مشہور نظم "مٹھا، جواب مٹھا" سناتا ہے تو معاشرے کے استبداد کی ایسی علامتی تصویر میں کھینچتا جاتا ہے کہ آپ اس کی نظم کا حصہ بنکر رہ جاتے ہیں - گویا یہ بات

سے بھی ہوتی کہ گھاس بڑے سلیقے سے کاٹتا ہے۔ اور شعر میں ایسی صلابت ہے کہ آپ کا ذہن گرفت سے نکل نہیں سکتا۔ یہ توی ہیکل دہقانی شاعر بڑی توی ہیکل شاعری کرتا ہے۔ عنوان جنگ ہے۔ سامعین ہنسنے کی بجائے سنجیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ سہ

قبر میں بند ہو کر اب سفر انسان کرتا ہے
دبابے کیا چلے ہیں، ایک قبرستان چلتا ہے

نذیر دہقانی

اب جو نکہ مشاعرے کا رنگ بدل گیا ہے اسلئے نذیر دہقانی کو زحمتِ کلام دی جاتی ہے۔ بہت کم رو، مشتِ استخواں، علی صائب میاں کی ضد۔ حیدرآباد کی کھڑی بولی کو اس کے محاوروں اور مرکبات کی صحت کے ساتھ استعمال کرنے والا ایسا شاعر کہ اس کے کلام سے دہقانی زبان کو استناد حاصل ہو۔ گویا یہ دکنی دہقانی زبان کے میرا نیس ہیں۔ بہت سُریلی مگر باریک آواز میں۔ اتنی باریک کہ پردے کے پیچھے سے اس کی جنس پہچانی نہ جائے۔ پڑھتا ہے تو ایک سماں باندھ دیتا ہے۔ سہ

آفتاں سہتا جا، ہنستا جا، گاتا جا
ہنڈی والے

اشعار یاد نہیں رہے۔ ہر بند کے بعد ہنڈی والے کا ٹکڑا، دد

بیلوں کی اس سواری اور سواری کے چلانے والے سے کچھ اس درجہ تعلق خاطر پیدا کر دیتا ہے کہ آپ شاعر کی آواز میں ہمدردانہ آواز ملانے لگتے ہیں۔ اگر آداب مشاعرہ مانع نہ ہوں۔

اب مشاعرے کو پھر اس کی سنجیدگی عطا کر دینا ذرا مشکل ہے۔ لہٰذا تھوڑی دیر کیلئے وقفہ دیا جاتا ہے اور چائے کے دور کے بعد دو ایک مقامی شعرا پڑھائے جاتے ہیں جو قریبی قصبات سے تاخیر سے پہنچے ہیں اور اپنا کلام سنانے کے خواہشمند ہیں۔ مشاعرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ حضرت تمکین سرمست منتظم مشاعرہ سے اپنا نام پکارنے کی خواہش کرتے ہیں تاکہ مشاعرہ پوری طرح اس کیفیت کو چھولے جس کو محسوس کر کے انھیں یہ طمانیت ہو سکے کہ باقی مہمان شعراء کے لئے انھوں نے سامعین کا اشتیاق فزوں تر کر دیا۔

تمکین سرمست

حیدرآباد کی فضاؤں اور ہواؤں نے عنفوانِ شباب کے آتے آتے تنفس کو اس قدر معطر ہی نہیں عطر بیز کیا کہ جوانی نے وہ سارے رنگ نکھارے جو اسی دیوانی عمر کے حصے میں آتے ہیں۔ ان سارے آئینوں کو صیقل کیا جن کے پیش ویس حسین چہروں کا اژدھام اپنا اپنا وجود منوانے کے درپے ہوتا ہے ـــــ اور تمکین سرمست اس تماشہ گاہ میں کبھی بھی ہاتھ مل مل کر صرف اپنے دیدوں سے سمجھوتہ کرنے والے نہ تھے ـــــ

انھیں ٹُک ٹُک دیکھنا آیا ہی نہیں — ہاتھ بڑھا کر حاصل کر لینے کا ہنر
انھیں شاید وہیں سے ملا جس سر برآوردہ خانوادے کے وہ چشم و چراغ تھے۔
محبتوں کو اسطرح پالینا، برتنا، کھو دینا، انھیں اس نگری کی ریت میں وہاں
تک لے آیا۔ جہاں انھوں نے محبتوں کے لئے ترسنا سیکھا، فتح و شکست
کا یہ زادِ سود و زیاں اُن کی زندگی کا حاصل ہے۔ یہیں سے شاید انھیں عشق کا
وہ عرفان حاصل ہوا جو عشق مجازی میں غم کی لذت کوشیوں کو سمندر کا
عمق عطا کرتا ہے اور وسعتوں کو یہاں تک اختصار
فراہم کرتا ہے کہ چلو بھر پانی کا گھونٹ بن جاتے ہیں اُن کی شاعری کے اس اختصار میں وسعتوں کی
تفصیلی بات کبھی چھیڑوں گا۔ اب یہاں اس کا محل نہیں ہے۔

اب تو صرف اتنے پر اکتفا کرنا ہے کہ تمکین سرمست ترنم میں
پڑھتے ہیں۔ آواز بہت سریلی پائی ہے۔ لیکن سُر دھیمے ہیں۔ اپنی مشہور
نظم "آنکھ مچولی" سُنا رہے ہیں جو کبھی علامہ نیاز فتح پوری کے "نگار" میں شائع
ہوکر اس درجہ مقبول ہوئی تھی کہ تمکین حیدرآباد میں آنکھ مچولی والے تمکین کی
مناسبت سے یاد کئے جانے لگے تھے۔ تمکین سرمست اور تمکین کاظمی کی پہچان
میں گویا اس نظم نے اپنا حصہ ادا کیا — نظم کی غنائیت، لفظیات
کی نرم روی اس پر مستزاد حسن و محبت کا موضوع — یہ نظم اپنی گیرائی
اور تہ داری و معنی آفرینی کے سبب بلند ہے۔ عہد طفولیت کی معصومیت
بھی اس میں ہے، غرورِ حسن و عشق کی آنسیت و تمکنت بھی — بچے پڑھیں
تو اپنی سمجھیں، نوجوان پڑھیں تو سوچ سوچ کر سر دھنیں — چنانچہ اس نظم
نے ہر عمر سے ازبر ہوکر داد لی — مشاعرے نے پھر سے اپنی تہذیب و تکمیل

کے سامان فراہم کر لئے ہیں۔ سے

چور بنے تم حیراں ہوں میں !!
کیا کروں اور اب کیا نہ کروں میں
کس کے دل میں جا کے چھپوں میں
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

صاحبزادہ میکش

اس کے بعد تمکین سرمست نے صاحبزادہ میکش کے نام کی فرمائش کر دی تمکین جانتے تھے کہ مخدوم کے بعد حیدرآباد کی مقبول ترین شخصیت صاحبزادہ میکش کی ہے۔ مشاعرہ جس کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ تخلص کی مناسبت سے کلام کی سرمستی اور سرمستئی کلام کی نزاکت سے ان کی مخمور نگاہی کا پرتو ساری شخصیت کو شرابور کیئے ہوئے۔ میکش بھی ترنم میں پڑھتے ہیں۔ رندی و سرشاری کو تجسیمی پیکر عطا کرنے والا یہ جواں سال شاعر اپنی آنکھوں سے شراب چھلکاتا ہوا پڑھتا ہے۔ پُرگوئی کا یہ عالم کے مرض الموت نے ذہنِ رسا کو بے بس نہیں کیا۔ خاصہ ضخیم دیوان چھوڑ کر اس نے آسمان کی پہنائیاں وقت سے پہلے ناپ لیں۔

شراب ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا
پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا

•

وہ آرہا ہے میکشِ مخمور جھومتا !!
پوچھیں گے میکدے کا پتا اس جواں سے ہم

صمد رضوی ساز

صمد رضوی ساز جامعہ عثمانیہ کے جانے مانے شاعر ہیں۔ گورا رنگ میانہ قد گٹھیلا بدن، صورت سے شاعر کم عہدیدار زیادہ لگتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں مجلّہ عثمانیہ کے مدیر رہ چکے ہیں۔ وکالت کا پیشہ ضلع ورنگل میں اختیار کر رکھا ہے۔ یہ وہی ورنگل ہے جس نے نظام شاہی دور میں کمیونسٹ پارٹی کی شاہی کے خلاف مسلح جدوجہد میں سرزمین تلنگانہ سے ستارے ہی نہیں چاند اگائے تھے ــــ ساز بڑے تکلّف اور رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں۔ ترنم میں شعر سناتے ہیں۔ اور اس ترنم میں جو دھیمی دھیمی لے ہے وہ اسی رکھ رکھاؤ نے اُن کے شعر کو ودیعت کی ہے۔ نظم سناتے ہیں۔ معلوم دہقانوں کا مرثیہ جیسے خود دہقانوں کو لوری دے رہے ہوں۔ موضوع سے احساس کی زیریں سطح کتنی الگ الگ سی، کٹی کٹی سی ہے۔ نہ سپردگی نہ وابستگی ــــ اس غیر فطری، پُرتصنّع اندازِ فکر نے انھیں شعر کی گیرائی تک پہنچنے نہ دیا اور وہ پاکستان منتقل ہونے سے پہلے ہی بہ حیثیتِ شاعر بھلا دیئے گئے۔ ہاں شعرائے عثمانیہ کی جلد اول میں محفوظ ہیں۔ سہ

بوڑھے املی بن میں مفلس دہقانوں کی اک وادی
یعنی تمدن کی لعنت، تہذیب کی خانہ برباد ی

اب سامعین میں بے چینی بڑھ رہی ہے ۔ ابّا حاکم وقت ہیں۔ اُن کی موجودگی میں نظم و ضبط کا مظاہرہ سامعین کیلئے ضروری ہے۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی گوشے سے دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ مخدوم ــــــــ

مخدوم محی الدین ۔ ابّا نظریں اٹھا کر، اُس گوشے کی طرف دیکھ رہے تھے جدھر سے آوازیں آرہی تھیں ۔ گویا تنبیہ تھی ۔ تاکید بھی اس بات کی کہ ' ملحوظ و ملزوم رہے کہ مشاعرہ صرف تفریح طبع کے لئے نہیں ہے۔ سخن فہمی ذہن و دل کی ایسی شائستگی کا نام ہے جو دل کی پاسبانی بھی کرتی ہے اور ذہن کو کبھی زنجیر بھی نہیں کرتی لیکن اس عمل میں متابعت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا سوائے موانست کے ۔ تمکین سرمست بھی بھانپ گئے تھے کہ بے چینیاں اب رنگ لاکر رہیں گی ۔ چنانچہ انھوں نے خود اعلان کیا کہ ہمارے مہمان شاعر (؟) شعیب حزیں نے اپنے کلام سے ابھی ہمیں نہیں نوازا ہے ۔ ان کے بعد مخدوم محی الدین کو آپ جی بھر کر سن سکتے ہیں ۔

شعیب حزیں

شعیب حزیں آئے ۔ شعرائے عثمانیہ میں غزل گو شاعر کی حیثیت سے حزیں کو بڑا اعتبار حاصل ہے ۔ لکھتے بھی بڑی منجھی ہوئی اور سجل غزل

تھے۔ ان کے نوک پلک سے درست اشعار غزل کا مزاج پہچانتے تھے۔ کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ڈوب ڈوب کر مضامین کی کھوج شاعری کے بحر بے کنار میں ان کی غوّاصی کا پتا دیتی تھی۔ پڑھتے بھی اچھا تھے۔ عجیب کھن کھناہٹ تھی۔ آواز میں، جیسے چاندی کے سِکّے شیشے کے فرش پر گر رہے ہوں۔ گھنگھرو والی پازیب لگتا تھا رقاصہ کے پاؤں سے نکل کر ان کے گلے میں بج رہی ہے۔ پاکستان چلے گئے پھر کسی کو کچھ خبر نہ ملی۔ اللہ کرے حیات ہوں۔ ؎

ہم تو حسنؔ یہ سمجھے تھے دامن جو بھگو دے پانی ہے!!
آنسو تو وہی اک قطرہ ہے، پلکوں پہ جو تڑپے بہہ نہ سکے

مخدوم محی الدین

اب مشاعرہ گاہ میں انجانی سی ہل چل مچ رہی تھی۔ کچھ جانا پہچانا سا ماحول انگڑائی لے کر سنبھل بھی رہا تھا، ہاتھ سے نکل بھی رہا تھا۔ آبا کی اٹھتی ہوئی نظریں زیر لب مسکراہٹ کے تحت جھک بھی جاتی تھیں۔ لوگ اپنی نشستیں درست کر رہے تھے۔ جس کو جس قدر قریب آنے کا موقع تھا، کھسک آتا۔ مخدوم کی شاہی سے نبرد آزمائی کا تصور سامعین کے ذہنوں کو ان کے رونگٹوں سے گزار رہا تھا۔ مخدومؔ سے تمکینؔ نے نام پکار کر گذارش کی۔ مخدوم اُٹھے۔ مسکراتے ہوئے۔ دبتا ہوا رنگ، تیکھے نقوش، کھب جانے والا چہرہ، لانبے لانبے بال، چھریرا بدن، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس

شخص میں کیا ہے اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس شخص میں کیا نہیں ہے — لوگ کسی شخص سے نہیں شاید شخصیت سے مل رہے تھے۔ کلام کا سحر، آواز کا فسوں، سینوں میں دل جیسے رک رک کر دھڑک رہے تھے۔ کون جادوگر تھا وہ، لوگ مسحور تھے، مبہوت تھے۔ مخدوم جتنا اچھا کہتے تھے اتنا ہی اچھا پڑھتے بھی تھے۔ اُن کی آواز کا درد شعر میں ڈھلتا رہتا اور شعر کی غنائی جراحتیں آواز میں ڈھلتی رہتیں۔ ؂

جو چھلکتا میں ان کو وہ بہا جاتے پسینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں

فرمائش ہوئی کہ آواز نے روح پر کمندیں پھینکیں۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

یوں محسوس ہوتا کہ مشاعرہ گاہ میں سارے کے سارے جسم اپنی روح کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ منچلا شاہی سے سب کچھ چھین کر عوام میں کس طرح بانٹ دے گا۔ مت ماری گئی ہے اس کی۔ اللہ تو رحم کر حفاظت کر اس کی جیسی شاعری کرتا ہے ویسا ہی سناتا بھی ہے۔ بس یہی کار شیشہ گراں کرتے رہو۔ ہمارے مخدوم۔ مخدوم دلوں کی اس آواز سے شاید اس وقت بے خبر تھے۔

•

بانسری سی بجائے جاتا ہے
آگ تن میں لگائے جاتا ہے

نئی دلہن کی تھرتھری بن کر
اس کے ہونٹوں کی کپکپی بن کر
میرے دل میں سما گیا کوئی
میری ہستی پہ چھا گیا کوئی

نظم سجدہ ختم ہوئی کہ تلنگن کا شور اٹھا۔ تلنگن سنانے لگے تو مشاعرہ گاہ میں کتنی ہی آوازیں تھیں جو مخدوم کے ساتھ نغمہ سرا تھیں۔ مخدوم نظم سناتے سناتے رک کر مسکرانے لگے، لیکن مشاعرہ سامعین کے ہونٹوں پر جاری رہا۔

دختر پاکیزگی نا آشنائے سیم و زر
دشت کی خود رو کلی تہذیب نو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جھک پڑے سب بام و در
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا بانکی تلنگن گائے جا

اب مخدوم سامع کی حیثیت سے اپنی نظم سن رہے تھے۔ یہ باتیں ۱۹۳۹ء کی ہیں۔

(۲)

میں سٹی کالج میں دسویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ لطیف ساجد اور حسینی شاہد انٹرمیڈیٹ میں ہیں۔ مخدوم استاد بن کر سٹی کالج آ چکے تھے۔ ایک دن ہم نے سنا کہ اردو کی کلاس اب مخدوم محی الدین لیا

کریں گے۔ ہماری خوشی چھپائے نہیں چھپتی ہے۔ اردو کے استاد آدمی بھلے سے تھے۔ لیکن مزاج دینیات کے مولوی کا رکھتے تھے۔ ادبیات پڑھانے اور دینیات پڑھانے میں جو فرق ہے اس کو محسوس کرنا بھی بے چاروں کے بس کا روگ نہ تھا۔

کسی استاد کے لئے شاگرد کو علم سے نواز دینا کوئی بات نہیں ہے کہ وہ روٹی اسی کی کھاتا ہے۔ کتنے ایسے استاد ہیں جنھوں نے اپنے شاگردوں کو شعور سے نوازا۔ علم اور بات ہے، آگہی اور ہی کچھ۔ مخدوم محی الدین کلاس میں آئے تو درسی کتابیں بستوں میں دھری رہیں۔ پہلا سوال استادِ محترم نے یہ کیا۔

تم لوگوں میں شاعر کون کون ہے؟ ارے یہ تو آتے ہی دوست بن گئے ۔ یہ دوست بننے والا استاد کچھ ہی دنوں میں اپنے شاگردوں کا دل بن کر دھڑکنے لگا۔ میں غلو سے کام نہیں لے رہا ہوں ۔ مخدوم محی الدین کسی شخص کا نام نہیں ہے۔ ایک محبت کا نام ہے۔ ایسی محبت کا جو دل میں بستی ہے اور دل میں بسا بھی لیتی ہے۔ حیدرآباد ہو سکتا ہے کہ مخدوم سے بڑا شاعر پیدا کرے لیکن مخدوم سے بڑے انسان کے لئے جانے کتنی صدیاں وقت کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر چلائیں گی کہ سارے سمندر کھنگال ڈالے کسی منہ بند سیپی میں ویسا موتی نہیں ملا۔

تو صاحب، ارشاد ہوا ۔" کلاس میں جتنے شاعر اور ادیب ہیں؟ ہاتھ اٹھائیں"۔

ہاتھوں کو گن کر مسکرائے۔ کہنے لگے۔ کلاس کی اکثریت میرے ہی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔

کہا — "اپنا اپنا تعارف کراؤ"

ہم اٹھتے جاتے۔ اپنا اپنا نام اور تخلص بتلاتے جاتے۔

اختر شاہ خان عادل۔ غلام مصطفےٰ ساغر، عاشق شاہ خان، منیر احمد شرر۔ نورالدین خاں نور، سیف الدین سیف، رحمت اللہ رحمت، ناظم علی ناظم، سبحان علی نشتر سید مسیح الدین خاں متین وغیرہ — اور بھی نام ہیں — ایک نام جو اپنے تخلص کی بناء پر اہم ہے، رہ گیا ہے — اسد علی نی ہو۔

پوچھا۔ یہ نی ہو کیا ہے۔

منیر احمد شرر بڑے شریر تھے۔ واقعی شرر تھے۔ تعارف بھی انھوں نے ہی کروایا تھا — کہنے لگے۔

"جی ان کا پاتابون (موزوں) کا کارخانہ ہے۔ فائین ہاوزیری ورکس اس کا مخفف ہے نی ہو — اور یہ تخلص بھی یہی کرتے ہیں۔"

اسد علی کھڑے ہوئے خجل ہو رہے تھے۔ طبعاً بڑے شریف اور کم گو آدمی تھے۔ مخدوم کو ان کی شرم و حیا پر ترس آیا ہوگا — اسد سے محبت سے بات کی — اور منیر احمد شرر سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا جناب اب آپ بیٹھ جائیے۔"

مخدوم کو ان کی جسارت بری نہیں لگی۔ لیکن دوسروں کو شرمندہ کر کے بے زبانی سے خوش ہونے والی ادا کچھ بھائی نہیں۔ شاید اسی لیے۔

"دگر بہ کشتن دوزاول" کے مصداق انھوں نے شروع کو آپ اور جناب کہہ کر مخاطب کیا۔

کچھ ہی دن میں ہم جان گئے کہ مخدوم کسی طالب علم سے خفا ہو کر بات کریں تو تم کے بجائے آپ کہیں گے۔ جناب کہہ دیں تو سمجھو کہ زیادہ ہی خفا ہیں۔

ہم لوگ محسوس کرتے کہ یہ شخص دوسرے استادوں سے مختلف ہے۔ خفا ہوگا تو تم سے تو کے بجائے تم سے آپ کہے گا۔

کلاس میں الٹا سیدھا جواب دے دیں یا سبق یاد کئے بغیر پڑھنا چاہیں تو وہ۔

جناب آپ بیٹھ جائیے' کہہ کر کھڑے ہوئے طالب علم کو بٹھا دیں گے جہاں دوسرے استاد بیٹھے ہوئے طالب علم کو دیر تک کھڑا کر دیتے ہیں۔

آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مخدوم کا آپ کہہ دینا ہمارے لئے کتنی بڑی سزا تھی اور ہم کتنے ملول ہو جاتے تھے ــــ کلاس میں اُن کے تم کہہ کر مخاطب کرنے تک جی نہ لگتا ــــ لگتا کوئی چیز ہم نے کھودی ہے۔

ایک بار کلاس میں مشاعرہ ہو رہا تھا ــــ شاگردوں سے کلام سُننے کے بعد مخدوم اپنا کلام سُنا رہے تھے ــــ ہوتا یوں تھا کہ اکثر و بیشتر ایسے مواقع پر جب کہ کلاس درس و تدریس سے نکل کر شعر خوانی کے حوالے ہو جاتی تھی تو کلاس کے دروازے بند کر دیئے جاتے تھے تاکہ قریب کی دوسری کلاسیں بھی نہ شریک ہو جائیں اور اُن کے لئے باعثِ خلل نہ ہو ۔ اس دن شاید باہر کی ہوا کے جھونکوں کو بھی ضد تھی کہ مخدوم کو سُنیں ــــ بھیڑے ہوئے پٹ کھل گئے ۔ مخدوم نظم سُنا رہے تھے ــــ کسی نے کھلے دروازے کی طرف نظر بھی نہیں کی ۔

اعظم صاحب راؤنڈ لینے کے لئے نکلے ۔ وہ پرنسپل تھے ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کلاس کے دروازے میں داخل ہو کر وہیں رک جاتے اور آٹھ دس سکینڈ بعد آگے بڑھ جاتے یا کسی کلاس پر نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے گزر جاتے اور اتنا ہی احتسابِ نظم و ضبط اساتذہ کیلئے بہت تھا۔

چپراسی نے لپک کر بتایا کہ اعظم صاحب آرہے ہیں ـــ مخدوم نے کچھ اسطرح چپراسی کو دیکھا کہ وہ خفیف سا ہو کر چلا گیا، اور وہ نظم سُناتے رہے ـــ بعد میں اعظم صاحب کے اردلی نے بتایا کہ جب وہ کلاس کے قریب پہونچے تو مخدوم کی آواز سُن کر ٹھہر گئے ۔ منٹ، دو منٹ، تین منٹ اعظم صاحب کو اسطرح کھڑا دیکھ کر طالب علم تو رہے ایک طرف، اساتذہ نے بھی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ مخدوم کے نظم ختم کرتے ہی اعظم صاحب لوٹ گئے ـــ آگے نہیں بڑھے۔ انھیں مخدوم کی کلاس کے سامنے سے ہو کر گزرنا گوارا نہ ہوا۔

مخدوم کی مقبولیت ان کے ساتھی اساتذہ میں بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ بہت کم سہی ان کے بعض ساتھی ایسے بھی تھے جو ان سے یا تو حسد کرتے تھے یا نظریاتی اختلافات کو ذاتی ناپسندیدگی کا جواز بنا کر اپنی جگہ کٹے پھٹے رہتے تھے۔

جغرافیہ کے استاد سوراج بھان مخدوم کے اس حد تک مداحوں میں تھے کہ جو طالب علم مخدوم کو عزیز تھا وہ انھیں بھی عزیز ہوا۔ میرے ساتھ بھان صاحب کے التفات کے اسباب مزید براں یوں تھے کہ میں ہائی اسکول کا مقبول شاعر تھا۔ مخدوم کا چہیتا تھا اور جغرافیہ کی کلاس میں ایک مدرس نے

ایک چھوٹی سی بات سے بھان صاحب کے دل میں جگہ بنالی تھی۔

وہ پڑھا رہے تھے۔ خسوف وکسوف سمجھا رہے تھے۔ خسوف عربی میں چاند گرہن کو کہتے ہیں اور کسوف سورج گرہن کو۔ ہماری درسی کتابوں میں اُن دنوں یہ عربی آمیز اصطلاح مروّج تھی۔ ہم جماعت طلباء ان ادق اصطلاحات کو یاد رکھنے میں دقّت محسوس کررہے تھے۔ چاند گرہن اور سورج گرہن سامنے کی بات تھی جو زبان زد ہوسکتی تھی اور مانوس تھی۔ خسوف وکسوف ان کے اذہان پر گراں تھے ادھر کا اُدھر اور اُدھر کا ادھر کردیتے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اجازت مانگی۔ سورج بھان صاحب نے مسکرا کر اجازت دی تو میں نے کہا کہ جناب ایک آسان بات مجھے سوجھی ہے اجازت ہو تو۔

کہا۔ بتاؤ شاعر بتاؤ بھی۔

میں نے عرض کی۔ فارسی میں خرد کہتے ہیں چھوٹے کو اور کلاں کے معنی ہیں بڑا اور خرد وکلاں بہتوں کو معلوم ہے۔ ہم فارسی پڑھنے والوں کے لئے تو اور بھی آسانی ہے۔ چاند چھوٹا ہے اور سورج بڑا اسی مناسبت سے چاند خرد ہے اور سورج کلاں۔ خسوف خ سے آتا ہے اور کسوف ک سے۔ ہم اسی مناسبت سے خسوف وکسوف یاد رکھ سکتے ہیں۔

بھان صاحب خوش ہوگئے۔ قریب بلایا، پیٹھ ٹھونکی۔ کہا۔
مخدوم کو عزیز ہو تو کوئی ایسی بات تم میں ہونی ہی چاہیئے۔
اس کے بعد ہر تعلیمی تقریب میں خواہ میری جماعت شامل ہو کہ نہ ہو وہ کلاس ٹیچر سے اجازت لیکر مجھے ضرور ساتھ رکھتے اور کلام سُنکر خوش ہوتے۔

اُس دن میرے ساتھیوں نے گرڑے کے ہوٹل کی بالائی بھری چائے پلائی۔ اس پذیرائی کے لئے اکسانے والے سبحان علی نشتر تھے۔ مرنجان مرنج آدمی تھے۔ بہت ہنستے تھے ہنسنا ہو تب بھی نہ ہنسنا ہو تب بھی۔ تخلص نشتر کی مناسبت ان کی ہنسی سے اسطرح ہوگئی تھی کہ ان کا ایک اوپر کا درمیانی دانت۔ سارے دانتوں سے اونچا تھا اور نکیلا بھی۔ انہوں نے اس دانت پر سونا چڑھا رکھا تھا۔ آواز بالکل زنانی تھی۔ دانت بھینچے رہیں تب بھی سنہرا دانت جھانکتا اور جگمگاتا رہتا۔ ہنستے تو اس دانت کی دمک دوسرے دانتوں کو جگمگاتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اپنی اسی ہیئت کذائی میں سجتے تھے اور مقبول تھے۔ جانے اب کہاں ہیں۔ بقول فراق گورکھپوری ؎

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

مخدوم پرنسپل سٹی کالج سید محمد اعظم صاحب کے چہیتے تھے۔ لیکن وہ بھی اعظم صاحب کا پاس و لحاظ کرتے۔ سٹی کالج کا گولڈن جوبلی فنکشن تھا۔ پرنس آف برار، ولی عہد، اعظم جاہ بہادر۔ فنکشن کی تقاریب میں شرکت کرنے والے تھے۔ احکام صادر ہوئے تھے کہ پرنسپل سے لیکر سارے اساتذہ، دستار اور بگلوس لگا کر تقاریب میں شریک ہوں۔ مخدوم کے لئے یہ آدابِ شاہی کھلا چیلنج تھے۔ ان کے وقار کا مسئلہ تھا۔ وہ شخص جو شاہی کا مخالف تھا وہ شخص جس پر ان کے پیچھے پیچھے آنے والی نسل کی آنکھیں لگی تھیں، وہ شخص جسے بادشاہِ وقت سے اسطرح مخاطب ہونا تھا ؎

بڑی ہے فرق مبارک پہ ضربت کاری
حضور آصف سابع پہ ہے غشی طاری

بھلا وہ شخص شاہ کے فرزندِ ارجمند کے آگے دستار اور بگلوس لگا کر کورنش بجا لا سکتا ہے؟ ـــ جو کام دوسروں کے لئے بہت آسان تھا۔ باعثِ صد افتخار تھا۔ مخدومؔ کے لئے ناممکن تھا، باعث ندامت تھا۔ انھوں نے اپنے بعد کی نسل کو اس درجہ تیزی سے متاثر کر دیا تھا کہ کالج کے نوجوانوں کی اکثریت انھیں تکنے لگی تھی ـــ اگر ارشادِ خسروی یہ ہوتا کہ طالب علم بھی دستار اور بگلوس لگا کر آئیں تو ہم احتجاج کرتے یا آخری صورت میں کالج چھوڑ دیتے۔ یہ تھا اس وقت نوجوانوں کا ردِ عمل، انھیں تو اپنے اساتذہ کا بھی اسطرح شاہی کے آگے جھکنا بڑا اہانت آمیز لگ رہا تھا۔ یہ اندازِ فکر، دین تھی مخدوم محی الدین کی کہ شاہی کو تعلیم و تدریس گاہوں کو محکوم و مطیع کرنے کی اجازت نہیں ملنی چاہیئے۔

مخدومؔ دستار لگا کر آئیں گے؟ مخدوم بگلوس باندھ کر کمر بستہ دست بستہ کورنش بجا لائیں گے۔؟

"ناممکن، یہ ہو ہی نہیں سکتا"

یہ ہو کر رہے گا حضور۔ طلبہ کے ایک مخصوص گوشے سے آواز آئی۔ جن کے پائجاموں کے پائینچے ٹخنوں کے اوپر تھے۔ آصف سابع کو ظل اللہ اور ظل سبحانی سمجھنے والے وفاداران علم و ہنر اپنی ٹولیاں الگ بنا کے سازشوں میں مبتلا بھی تھے مگن بھی۔

یہ تو حسرت ہی رہ جائے گی دوست۔ ہمارے گروپ نے آواز پھینکا

لہجے بدل گئے اور دلوں کا اضطراب کلاس میں اپنے جسم پھینک کر پرنسپل کے اجلاس کے گرد بڑھا کہ آخر کیا کھچڑی پک رہی ہے ـــ جتنے منہ اتنی باتیں بعض اساتذہ نے جو مخدوم کو چاہنے والے تھے اور جوان کے طالب علموں کے گروپ

کو بھی عزیز رکھتے تھے بڑے اعتماد سے یہ بات پھیلا دی کہ مخدوم نے اعظم صاحب کو ان کے پاس و لحاظ کے ساتھ بہت ہی انکسار سے سمجھایا کہ آپ بھی اعظم ہیں۔ آپ کے مہمان خصوصی تو اعظم جاہ ہیں اور بد نصیبی یہ ہے کہ میں بھی خادم نہیں مخدوم ہوں۔ یہ مثلث آپ غور کیجئے بن ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ لکیریں کہیں مل ہی نہیں سکتیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ میرا استعفیٰ قبول کر لیں۔

"تو پھر مخدوم استعفا دے دیں گے؟"

"مخدوم کالج چھوڑ دیں گے؟"

"ہم دیکھیں گے کہ تقاریب کس طرح ہوتی ہیں"

آج یہ باتیں جو میں آپ کے سامنے اسطرح آسانی سے کہہ رہا ہوں۔ ان دنوں بڑی مشکل تھیں۔ سرگوشیوں کے لئے بھی دیواریں کان رکھتی تھیں۔ ایک شخص کے ماتھے کی تیوری حیدرآباد کے ہر فرد کی ہتھیلی پر کی لکیر بن سکتی تھی۔ بہت پہلے جوش ملیح آبادی، ہم نے سنا ہے صرف اس بات پر کہ ؎

"دو کسی کی آئی سواری کسی کی جان گئی"

شہر بدر کر دیئے گئے تھے۔ مخدوم کا معاملہ تو پھبتی کسنے اور طنز کر کے گذر جانے کا نہیں تھا۔ وہ تو سر ہتھیلی پر رکھ کر چلے تھے ــــ اور حیدرآباد کے ہر اس فرد کی ہتھیلی پر قسمت کی لکیریں نہیں ہیں، سر ہے ــ جو مخدوم کے شانہ بشانہ تھا۔ اور پھر یوں ہوا تھا کہ ہتھیلی پر رکھے ہوئے اس سر کے لئے بڑے بڑے انعام و اکرام کا اعلان ہوا۔ یہ باتیں کچھ بعد کی ہیں ــــ قصہ مختصر ــ مخدوم کالج ڈے میں اس طرح شریک ہوئے کہ بہت دیر سے آئے۔ تقاریب میں شرکت نہیں کی۔ ڈنر میں اپنی

سیٹ پر موجود تھے ـــــ میں مجروح سلطانپوری کا یہ شعر ذراسی زمانی ترمیم کے ساتھ نقل کر رہا ہوں۔ ـــــ

سر پر ہوائے ظلم چلی سو جتن کے ساتھ
اس کی کلاہ کج تھی اسی بانکپن کے ساتھ

ایک شاخسانہ اُس وقت بھی پیدا کیا گیا، جن دنوں مخدوم، سبط حسن کی ادارت میں چھپنے والا رسالہ "نیا ادب" اور "کلیم" کالج میں لاکر بیچا کرتے تھے۔ چند اساتذہ نے پرنسپل صاحب تک یہ بات کچھ اس انداز سے پہنچائی کہ مخدوم کمیونسٹ لٹریچر کالج کے نوجوانوں میں بانٹ رہے ہیں اور اس طرح کالج کی علمی اور ادبی فضا مسموم ہو کر رہ گئی ہے اور الحاد اور ارتداد کی ظلمتوں کا شکار ہو رہی ہے ـــــ پھر مخدوم "قومی جنگ" لانے لگے، خود بیچتے اور اپنے ہم خیال شاگردوں کے توسط سے بکواتے۔

اسی زمانے میں مخدوم نے اپنی بے پناہ نظم "انقلاب" کہی تھی جس کے دو بند یہ ہیں۔ ـــــ

نہ تابِ نالۂ مرغ سحر، نہ کا کلوں کا ہجوم
ہے ذرّہ ذرّہ پریشان کلی کلی مغموم
ہے کل جہان متعفّن، ہوائیں سب مسموم
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے!
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے
قفس میں بند ترے ہم صفیر ہیں کب سے

گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

آخرش مخدوم سٹی کالج کی لکچرر شپ سے مستعفی ہو گئے اور کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن بن گئے۔

اس طرح مخدوم کا جسمانی وجود ایک حد تک ہم سہل پسندانِ بساطِ ادب سے دور ہو گیا لیکن مخدوم جاتے جاتے ہمارے قلم کی روشنائی میں اپنا تھوڑا سا لہو بھی ملاتے گئے اور دیکھتے دیکھتے وہ خون ہماری روشنائی کا جز بن گیا۔

یہ باتیں ۱۹۴۱ء کی ہیں۔ ؎

جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد
آج وہ لوگ ہیں کہاں آباد

اقبال متین

صبا دریدہ

سلیمان اریب

آمد: ۵/اپریل ۱۹۲۲ء ـــــ ۷/ستمبر ۱۹۷۰ رخصت

مجھے صحیح طور پر یاد نہیں کہ سلیمان اریب سے میری ملاقات کس سنہ میں ہوئی۔ اریب سے پہلے میں نظر حیدرآبادی سے واقف ہوا۔ پھر نظر نے ہی اریب سے ملایا۔ غالباً یہ ملاقات ناپلی روڈ پر سرِ راہے ہوئی تھی۔ ان دنوں میں سٹی کالج میں طالبِ علم تھا۔ اریب سے ملا تو اُن کی نظم "بنتِ عم" یاد آئی جس کا آخری شعر مجھے یاد ہے۔

گوری باہیں مری گردن میں حمائل کر دیں
مجھ میں اللہ میں خود بینیاں حائل کر دیں

یہ نظم میں نے کسی رسالے میں پڑھی تھی۔ غالباً سب رس میں یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ابا کی ملازمت کے سلسلے میں ضلع پر تھا۔ ماہنامہ جامعہ میں اریب کی نثر بھی پڑھی تھی اور ان کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ شاعری

حیثیت سے بھی، نثر نگار کی حیثیت سے بھی اپنی ہی کم آمیزی کے باعث اریب
سے دوستی کی منزل تک پہونچنے میں ہماری رسمی ملاقاتوں نے بہت وقت لیا۔
ویسے اریبؔ دوست نواز اور کشادہ دل کے انسان تھے۔ لیکن بنتِ عم
کون تھیں انہوں نے کبھی نہیں بتایا۔ صفیہؔ نے بھی نہیں پوچھا ہوگا۔ اس لئے کہ
محبت کے بعد صفیہ نے اریبؔ کی بیوی بن کر کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ اردو
شاعری میں معشوق کی عشوہ طرازیاں کیا ہوتی ہیں صفیہ نے اپنے غمزے بھی
اریب کو سونپ دیئے۔ اریب نے اس تحفے کو اپنی نرگسیّت بنا کر بہت کام
لیا اور صفیہ اریبؔ کی عاشق بنی رہیں۔

بدیر سہی لیکن جب وہ وقت آیا کہ ہم ایک دوسرے کو بہت عزیز ہوئے
اور ہماری دوستی مثالی سمجھی جانے لگی تو اریب کے دو تین دوستوں میں یہ
غلط فہمیاں بھی چھپے چھپے دلوں میں جاگزیں ہوئیں کہ اریب دوستوں میں
سب سے زیادہ رفاقتیں مجھ سے نبھاتا ہے۔ عزیز قیسی یہی سمجھتے تھے، سردار
سلیم یہی سمجھتے تھے خود اقبال متین یہی سمجھتا تھا۔

اریب طبعاً مجلسی آدمی تھے اور میں گھر گھسنا۔ ہوسکتا ہے کہ اسی بعد
طبع نے ہم دونوں کو زمانے تک ایک دوسرے سے دور رکھا ہو اور ہم جب
ایک دوسرے کے گھر سے دوست ہوئے تو میں اریبؔ کا اس درجہ رازداں
ہوا کہ صفیہ خاندان بھر سے ٹوٹ کر میرے گھر اریب کی دلہن بن کر آئیں۔

منیرہ مرحومہ میں اور صفیہ میں بہت گھلنے لگی۔ میں تو پہلے ہی اریب
کا ہو چکا تھا منیرہ بھی صفیہ کی ہو رہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اب اریب صفیہ کی

رفاقت میں اپنی گھریلو زندگی کے لئے سبھی اپنی لاؤ بالی مصروفیات کے اوقات کا ایک قابلِ لحاظ حصہ مختص کردے گا. لیکن اس بندۂ خدا میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی. بجائے اس کے کہ اریب گھر کا ہو رہتا، صفیہ اریب کا سایہ بن گئیں. ایسا سایہ جو روشنی اور اندھیرے کی تفریق کے بغیر اریب کے ساتھ ساتھ رہا۔

اریب نے شروع ہی سے وہ وہ بینترے کاٹے کہ صفیہ سنبھل کر تحمل کا بوجھ دل میں نہ چھپا لیتیں تو آغاز و انجام دونوں ہی ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ جاتے اور ہمارا سارا کیا دھرا سامنے آکر تہس نہس ہوجاتا۔ اریب مجھ سے عمر میں بڑا تھا لیکن حالات اور وقت نے اریب اور صفیہ کی محبتوں کو پروان چڑھانے کے لئے مجھے اور منیرہ کو ان کی سرپرستی سونپ دی تھی۔ منیرہ بے حد اخلاق کی خاتون تھیں۔ میں ایک قدم آگے بڑھتا تو وہ دس قدم بڑھ جاتیں۔ آخر شا جب وہ دن آگیا کہ بہت راز داری میں دوچار احباب میرے مغل پورہ کے گھر میں جمع ہوئے اور اریب و صفیہ کے عقد کی گھڑی آئی۔

مہر کی بات چھڑی تو کسی نے پانچ ہزار کہا۔ میری رگ حمیت پھڑکی کیوں کہ ہم دلہن کے بھی تو کچھ تھے — میں نے اریب سے کہا۔

"پیارے مہر کم ازکم گیارہ ہزار تو ہونا ہی چاہیے"

مان گیا —

شادی کے دو روز بعد ہی رات بہت دیر سے گھر لوٹا۔

صفیہ انتظار کرتی رہیں اور منیرہ، صفیہ کی دل جوئی — میں اریب کی

اس حرکت پہ پیچ و تاب کھاتا رہا ۔ رات دیر گئے آیا تو سارا میکدہ ہی جیسے کندھوں پر اٹھا لایا ۔ بوجھ سے سنبھل نہ سکتا تھا ۔ پاؤں ڈگ مگاتے تھے ۔ میں نے بڑھ کر صحن ہی میں تھام لیا ۔ صبح ہوئی تو میں نے بہت کھچائی کی ۔ ازدواجی زندگی کی سپردگی اور تقدیس پر لکچر پلایا ۔ ہم تخت پر بچھے سفید فرش پر بیٹھے تھے آلتی پالتی مارے سر جھکائے محبوب میرا بُرا بھلا سنتا رہا ۔۔۔۔
منیرہ بھی پاس ہی بیٹھی تھیں ۔ میں دل ہی دل میں بڑا مطمئن تھا کہ اب کی اصلاح ہو نہ ہو منیرہ کے ذہن میں میرا امیج تو بن رہا ہے کہ بھئی شوہر ہو تو ایسا ہو ۔

میری لعن طعن سے عاجز آ کر کہنے لگا

تو چاہتا ہے کہ اس تخت پر بچھی سفید چادر بن جاؤں کیوں کہ تخت پر بچھا ہوں ۔ اپنے دھبوں سمیت زمین پر بچھ جاؤں گا ۔ کیا تو نہیں جانتا کہ مجھ میں کتنے دھبے ہیں جب تو مجھے اچھی طرح جانتا ہی تھا تو مہر صرف گیارہ ہزار روپے تو نے کیوں باندھ دیا ۔ وہ تو سارے خاندان کو چھوڑ کر تیرے گھر بہو بن کر آئی تھی ۔

میں نے کہا ۔ " اچھا بیٹا " ۔ تب بھی نہیں مسکرایا اس کے ریشمی لمبے لمبے تیل میں چپڑے بال ماتھے کو ڈھانک رہے تھے ۔ تھوڑی پکڑ کر میں نے چہرہ اٹھایا تو مجھے بغور دیکھا ، آنکھوں کی شرارت چھپا رہا تھا ۔
کہنے لگا میں جانتا ہوں منیرہ کا مہر ۲۵ ہزار روپے ہے ۔ میں نے کہا وہ بھی تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر میرے گھر آئی تھی ۔

کہا — جب ہماری ریت یہی ہے تو صفیہ کا مہر بھی کم سے کم ۲۵ ہزار باندھا ہوتا — گیا ۵۰ ہزار روپے — یہ بھی کوئی مہر ہے۔ اتنا تو خود صفیہ ادا کر لے گی۔

صفیہ ذرا دور بیٹھیں سب سن رہی تھیں — اپنی ہنسی روک نہ سکیں۔

کہا — لو — اور سنو — صفیہ خود ادا کر لے گی۔

میرے اور منیرہ کے دل کا بوجھ ذرا کم ہوا۔

سارے اوبڑ کھابڑ راستوں سے گزر کر جب صفیہ اور اریب کی رفاقتوں نے اپنا انفرادی رنگ چنا اور لہو کو ندھ کر بنا یا تو اس نئے رنگ سے بھی کتنے ہی لوگ کبیدہ خاطر تھے جن کو اریب سے خلوص کا زعم بھی تھا — کیسے کیسے دوست نما لوگ نفرتوں کو ہوا دیتے ہیں۔ محبتوں کو سہہ نہیں سکتے — اریب سے صفیہ کے اس تعلقِ خاطر کو بھی لوگوں نے کئی نام دیئے۔ غیبتیں، نکتہ چینیاں پھبتیاں، سب ہوئیں — نہ اریب کے پاؤں زنجیر ہوئے نہ صفیہ نے تعاقب چھوڑا سڑکوں پر صفیہ اریب کے ساتھ ہے۔ دوستوں کی محفلوں میں صفیہ اریب کے ساتھ ہے صیاد کے دفتر میں صفیہ اریب کے ساتھ ہے۔

آخر کار اس سائے نے جس کا جسم کھو گیا تھا اپنے سائے کو حلول کر کے اسی کی تجسیم کر لی۔

صفیہ میں تمہاری محبتوں سے تنگ آ چکا ہوں مجھے آزادی سے سانس لینے دو۔ ڈرتا ہوں کہ مر جاؤں بھی تو تم پیچھا کرو گی۔

اریب نے بہت قریب سے مغل پورہ میں میرے اچھے دن دیکھے تھے چراغ علی گلی

میں فرید اقبال میرے سب سے بڑے بیٹے کے انتقال کے بعد میرے اچھے دن نہ رہے تو اریب اور صفیہ نے سر جوڑ کر سازش کی۔ اور مجھ پر کیا ہوا احسان اس طرح مجھ سے چھپایا جیسے وہ نہیں میں ان کا محسن ہوں۔ ایک دن یہ دونوں چراغ علی گلی میں واقع میرے گھر پہنچے۔ یہ گھر نشو گاہ حیدرآباد کے پہلے موظف ناظم محبوب علی صاحب کے بہت بڑے گھر کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا جہاں ہم کرائے سے رہتے تھے۔ اریب نے صفیہ کے حوالے سے یہ بات رکھی کہ صفیہ کے آبائی مکان موقوعہ معظم جاہی مارکٹ کے تعلق سے کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کا وہاں منتقل ہونا ازبس ضروری ہے ہم لوگ اُن سے اتنا تعاون کریں کہ اریب کے مکان میں جو وجے نگر کالونی میں تھا منتقل ہو جائیں تاکہ یہ لوگ معظم جاہی مارکٹ کے آبائی مکان میں مقیم رہ کر اپنا قانونی موقف استوار کر سکیں۔ ہم لوگ اریب کے گھر منتقل ہو گئے اور زمانے تک آرام سے اریب کے گھر میں رہے۔ صداقت کیا تھی وہ اب صفیہ ہی جانے۔ "ماما کی تنخواہ" کے عنوان سے میں نے بہ اصرار مکان کا کرایہ طے کیا جو چراغ علی گلی کے مکان سے کم تھا اور جو کبھی ادا ہوا کبھی نہیں ہوا۔ اریب اور صفیہ شاید اس بات کا انکشاف نہیں کرنا چاہتے تھے کہ میں ان کے گھر میں کرائے سے ہوں۔ غالباً "ماما کی تنخواہ" کے محذوف معانی اسی لئے توضیح طلب تھے جو مجھ میں اور اریب میں اُس وقت طے تھے۔ آج وہ بھی صحیح وضاحت کے ساتھ مجھے یاد نہیں رہے۔

اریب ان دوستوں میں سے تھا جس کی دوستی پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا تھا۔ بے لاگ، بے لوث، مصلحتوں کے منہ پر تھوک کر گزر جانے والا۔

اس کی کیا کیا باتیں کروں۔

سردیاں تھیں اور خاصی تھیں۔ چراغ علی گلی سے ایک نشست کے بعد جانے لگا تو میں نے اپنا اوور کوٹ یہ کہتے ہوئے حوالے کیا کہ پہن لو، باہر تو اور بھی سردی ہو گی۔ مجھے گھر ہی پر رہنا ہے اوور کوٹ پہن کر چلا گیا۔ ہفتہ بھر ہو گیا لوٹایا ہی نہیں۔ میں دیکھتا رہا۔ نہ خود پہنتا ہے نہ مجھے دیتا ہے۔

آخرش میں نے پوچھ لیا۔ کہنے لگا۔

تجھے شرم نہیں آتی وہ تو "لیڈیز" کا تھا اور تو پہن کر اتراتا پھرتا تھا۔ میں نے اس ہستی کو دے دیا ہے جس کے بدن پر سجتا تھا۔ یہ نہیں کہ یہ بات صفیہ سے راز میں کہی ہو۔ صفیہ نے سن کر کہا۔ حد کرتے ہو ادیب مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔

اور دیجئے متین بھائی اور دیجئے۔ اب "منیر کا، فر، کا اوور کوٹ دے دیجئے۔ دیکھیے وہ کس بدن پر سجتا ہے۔

صفیہ جانتی تھیں۔ بہت نرمی سے پچکار کر پوچھا ذرا ذہن پر بار ڈالو، سوچو کبھی کہاں بھول آئے ہو۔

ایک دن کچھ خاموش سا ملا۔ میں نے کہا کیا ہوا چہل کہاں گئی تمہاری۔ کہا۔ تم نے کس بے وقوف لڑکی کے پلو سے مجھے باندھ دیا ہے۔ اس طرح بھی کوئی کسی کو چاہتا ہے بھلا مجھے تو کبھی کبھی اس پر ترس آتا ہے یار۔ اب میں اس کو پوشاک بنا کر پہن لینے سے تو رہا۔

ادیب کے بعد صفیہ نے مجھے ادیب کا ایک خط بتلایا تھا جو اس نے حیدرآباد

کے باہر کہیں سے صفیہ کو لکھا تھا۔ وہ لمحہ آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ صفیہ کے تو دل میں محفوظ ہو گا۔ جب صفیہ نے یہ خط مجھے بتایا تھا اور میں نے دیکھا تھا — میں بلا شبہ کہہ سکتا ہوں کہ الفاظ اپنے معانی اور مفاہیم ایسے ہی مقامات پر کھو دیتے ہیں جہاں بے زبانی نطق کے اسرار و رموز منکشف کرتی ہے ——

ادیب نے سادہ کاغذ پر سینکڑوں بار صفیہ کا نام لکھ کر سارا بڑا سا صفحہ بھر دیا تھا۔ اور خط کے اختتام پر اپنے نام کی جگہ پھر صفیہ لکھ دیا تھا —— خط کی تحریر اس کے سوا کچھ نہ تھی۔

میں نے اتنا موثر خط آج تک نہیں پڑھا۔ کچھ ہی دن بعد مجھے کسی نے بتایا کہ ادیب کے اس خط کی تحریر مٹ رہی ہے جس میں صفیہ کے نام کے بار بار اعادہ نے محبت کی ایک کائنات چھپا رکھی تھی اس لئے کہ کتنے ہی ادیب کے احباب انک رموور (INK REMOVER) لے کر ادیب کے گھر کی طرف دوڑ پڑے ہیں کہ صفیہ کی دل جوئی کریں۔

ادیب کہتا تھا کہ وہ مرنے سے قبل اپنی وصیت ضرور چھوڑ جائے گا جس میں اس کی یہ خواہش مرقوم ہوگی کہ اس کے مردہ جسم کو جلا دیا جائے اور اس کی استھیاں اس کے گھر کے اندرونی باب الداخلے پر طاق بنا کر رکھ دی جائیں۔ سوچتا ہوں ادیب کے اس قدر با اثر خط نے کیا کر لیا جو اس کی استھیاں کر لیتیں — دوست بہر حال دشمن نہیں ہوتے۔ پہچانے جاتے ہیں تب بھی دوست رہتے ہیں۔ نہ پہچانے جائیں تب بھی — اور ادیب کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔

ادیب کا مردہ جسم ہاسپٹل سے ابھی اس کے گھر کو بھی نہیں لایا گیا تھا کہ ہمارے

چاہنے والے ایک دوست نے جو مجھے بھی پسند کرتے تھے اور اریب کا تو دم بھرتے تھے، حلقۂ احباب میں ارشاد فرمایا کہ اب صفیہ اریب صفیہ اقبال متین بن جائیں گی اس لئے کہ ادھر منیرہ نہیں رہیں اور ادھر سلیمان اریب نہیں رہے۔

میں صم ہو کر رہ گیا ــ ایسے قیاف کوئی گناہ نہیں تھے۔ ایسا رشتہ اگر ہو سکتا تو نہ غیر آئینی تھا نہ غیر شرعی۔ لیکن میرے معاشرے میں غیر انسانی ضرور تھا۔ اس لئے کہ کوئی بھی مرد کسی بھی عورت سے ازدواجی تعلقات قائم کر سکتا ہے لیکن اپنی بہن یا بیٹی سے نہیں ــ یہ فرق میرے معاشرے میں انسانی رشتے کی ایسی نفری جبلت ہے جس کی نفسیاتی گرہیں آپس میں مرد و زن کا تصور ہی مٹا دیتی ہیں ــ اس میں نہ میرا کردار بلند ہوتا ہے نہ صفیہ کا ــ وہ ایک مجبوری تھی اور وہ ایک مجبوری یہی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اس نگاہ سے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے جس کے چند کرم فرما متوقع تھے ــ مجھے بہت دکھ ہوا۔

چنانچہ میرے ایک دوست ساغر ملک نے دفتر باگیرات موقوعہ عابڈس روبرو گرامر اسکول اریب کے انتقال کی خبر دی تو اس خبر نے دل دہلا کر نہیں رکھ دیا کہ ہم سب ہی دو تین روز سے اریب کی موت کو اس کے سرہانے بیٹھا ہوا دیکھ رہے تھے ــ دغدغہ یہی تھا کہ کب یہ موت کا عضریت نما فرشتہ اریب پر جھک کر اس کے جسم کو ڈھانک لیتا ہے۔ اریب کی موت کے ساتھ جانے میں نے کس جذباتی لمحے میں صفیہ کی موت کو بھی تسلیم کر لیا ــ میں اریب کے گھر پہنچا، گیٹ کے پتھر لے ستون کچھ تھا بھگو سکتے تھے میرے آنسوؤں نے بھگو دیا ــ باہر ہی سے لوٹ آیا۔ نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی۔ اس کے بعد میں نے برس ہا برس صفیہ

کے گھر کا رخ نہیں کیا ــــ صفیہ لاعلم تھیں اور انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ میں نے
اریب کے بعد پلٹ کر خبر تک نہیں لی۔ حسین سیاتا ہونے لگا تو وہ بھی دکھی ہوا۔
صفیہ کی زندگی میں اریب کے بعد وجے نگر کالونی سے رام کوٹ کے حالیہ فلیٹ تک
وقت نے اتنے لمبے فاصلے طے کر لیئے ہیں کہ میں اور صفیہ بوڑھے ہو چکے ہیں۔

ایک شام صفیہ کے اس موجودہ ہما اپارٹمنٹ والے فلیٹ میں حسین کے مواجھ
میں یہ راز میں نے فاش کیا۔ حسن صاحب نے اپنی الہامی کیفیات سے مستقبل میں
ہونے والے ان رشتوں کی بشارت دی تھی اب وہ بھی دنیا میں نہیں رہے تھے۔
حسین نے نام سنتے ہی ان کی قماش اور سرشت پر اپنے انداز میں روشنی ڈالی۔
صفیہ کا ردعمل یوں تھا کہ موصوف سے جو خود بھی مرحوم ہو گئے تھے ایسی کوئی
بات بعید نہیں تھی ــ اریب کی زندگی میں سنا کہ انہوں نے صفیہ اور اریب کو
متوسل کر کے اپنے ہی انداز میں کچھ اور بھی انکشافات کیئے تھے ــ اریب کی
دوست نوازی اور صفیہ کی روشن خیالی نے کردار کے اس کابوس کو تابوت بنا کر
رکھ لیا اور مسکراتے رہے۔

لیکن اس شام ایک عجیب و غریب بات یہ ہوئی کہ ہم تینوں کے علاوہ
اریب کے لئے 'صبا' کی مشقتوں اور صعوبتوں کے زمانے کے ایک اور ساتھی
بھی موجود تھے ــ اُن کی دانست میں انہوں نے نہ صرف صبا کا سرگرم دیکھا
تھا بلکہ ایسے وقتوں میں اریب کے مربّی رہے تھے ــ میرے اس انکشاف
پر انہوں نے جھُنجھلا کر کہا کہ یہ سب بے کار باتیں ہیں میں اپنا امیج بنا رہا ہوں۔
دراصل ان کی اس خفگی کا تعلق کچھ اور ہی تھا ــ ان کی مجلسی زندگی کے

کے چند دروازے میرے اجتناب کے سبب ان پر بند ہو گئے تھے اور وہ اپنے پندار کا لہو اپنی پیشانی سے پونچھ کر ان بند دروازوں کے روزن سے جھانک رہے تھے کہ پھر انہیں ان دروازوں میں داخل ہو جانے کا موقع ملے ۔ مجھے اعتراف ہے کہ بہت پہلے کبھی وہ اس قدر پُرخلوص اور باوضع شخصیت کے حامل تھے کہ ان کی دوستی پر اعتماد کیا جا سکتا تھا لیکن اب اپنی " سوجھ بوجھ " کا ہوا کھڑا کر کے وہ اتنے بلند ہو گئے کہ انہیں زمین پر سوائے اپنے ہم مزاج ایک اور شخص کے جو اپنے ہی تضادات اور تصنع کا طاغوتی مرقع تھا کوئی اور ہم سر نظر نہ آتا تھا ۔ یہ معاملہ ان کا بالکلیہ ذاتی معاملہ تھا جس سے مجھے کوئی سروکار نہیں ۔ لیکن مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ وہ اپنی ذہنی پراگندگی کی معذوری کی بنا پر اس شخص کو پھر سے میرے سر پر بٹھا دینے کے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے جس کو میں نے اپنی قریب ترین رشتہ داری کے باوجود اپنی زندگی سے الگ کر لینے میں اپنی عافیت جانی تھی کیوں کہ اس شخص کے ہاتھوں میں نے بے قصور بہت دکھ اٹھائے تھے ۔ میرے تحمل کی آزمائش درمیان میں ایک ایسی ہستی کر رہی تھی جو مجھے بہت زیادہ عزیز تھی ۔ ادیب اور صبا کے یہ دوست سب کچھ جانتے تھے جو میرے بھی دوست تھے لیکن اپنی ان مجبوریوں کا احتساب کرنے کے وہ خود اہل نہیں رہے تھے کہ اب عزتِ نفس کے سارے فسانے جن کو وہ کبھی اپنی نجابت کے ساتھ ساتھ اپنے پندار کا عنوان بنائے رہتے تھے اُن سے چھن گئے تھے ۔ محنت ، مشقت اور محبت کا سوالیہ نشان بن کر دل میں کھب جانے والا میرا یہ بے ریا دوست ، تساہل ، مجہولیت اور بے عملی

کا شکار ہو کر اس شانِ عارفانہ سے زندگی بسر کرنے کا عادی ہو گیا تھا کہ جس کے برملا اظہار سے کبھی اس کا منظر ہونا ممکن نہ تھا۔

زندگی کی گیند کو اپنے سانسوں کے بلّے سے چھکّے اور چوے کے اسٹروک لگانے والا یہ کھلاڑی سلیمان پوسے لین کو واپس ہونے تک اسی طرح کھیلتا رہا۔ ٹھٹک کر، تھم کر مور بے جاں سے کھیلنا اور زندگی سے مخلصانہ برتاؤ کرنا، اس کو آیا ہی نہیں ۔ صفیہ اریب کے سانسوں کا کبھی گن گن کر حساب نہ رکھتیں تو پانچ دس سال پہلے ہی اس نے اپنا یہ سرمایہ لٹا دیا ہوتا جس کا نام زندگی ہے اور جو کبھی اُس کے لئے صفیہ بھی تھا ۔ لیکن زندگی اور موت کے اس فصل کو صفیہ نے اریب کے بعد جس طرح پاٹنے کی کوشش کی اس بِشتابی نے صفیہ سے صفیہ کا رہا سہا بھی چھین لیا۔

اریب نے بہت سارے رسالوں کی ادارت کی ۔ جس کسی میں جوہر دیکھا اُس کو ادبی دنیا سے روشناس کرایا ۔ نئے لکھنے والوں کے ساتھ مربیانہ برتاؤ کیا ۔ زبان و بیان کا وہ بہت خیال رکھتا تھا۔ صبا کے لئے آئے ہوئے مضامین کو بغور پڑھتا۔ زبان کی غلطیوں پر جھلّاتا ، درست کرتا ، اور مضمون میں جان ہوتی تو شریکِ اشاعت کر لیتا ۔

اریب جس قدر لاابالی تھا، اتنا ہی بعض معاملات میں اصولوں کو نباہتا۔ صبا کی ادارت کے آخری دور میں صبا کا افسانوی حصہ میرے تفویض کر دیا تھا ۔ ساری کی ساری کہانیاں وہ مجھے بھجوا دیتا ۔ افسانوی حصّہ میں مرتب کر کے لوٹاتا اور وہ اُسے من وعن شامل کر لیتا ۔ ترتیب تک وہی

ہوتی ۔ ایک کہانی کی ایک بار اریب نے مجھ سے سفارش کی کہ اس کو صبا میں شامل کرلوں ۔ کہانی مجھے جچی نہیں ۔ حالانکہ افسانوی ادب پر بھی اریب کی نظر گہری تھی لیکن بعض اوقات وہ مروت میں مارا جاتا تھا ۔ یہی بات خود میرے تعلق سے بھی شہرت پا گئی تھی ۔

لیکن میں نے صبا کے افسانوی حصے کی ذمہ داری سوچ سمجھ کر قبول کی تھی کہ کل معیار کے پیشِ نظر نہ مجھے سبکی ہو، نہ اریب کو شکایت کہ مروتیں درمیان آگئیں ۔ معیار سے ہم کناری کا کوئی بھی دعویٰ نہیں کرسکتا ۔ ایسے میں میرا کیا ۔ اور میں کیا ۔ لیکن یہ احساس ہی ادبی دیانت کی بے سروسامانی کے متاثر تھا کہ میں نے کوئی کوتاہی کسی بھی زاویۂ نگاہ سے روا رکھی ہے ۔

جب اریب کی سفارش کے باوجود میں نے کہانی منتخب نہیں کی تو دبی زبان میں اریب نے پھر ایک بار کہا ۔ میں نے اس کے اصرار پر کہانی مکرر پڑھی اور خاموش ہو رہا ۔ جب صبا کے تازہ شمارے کا افسانوی حصہ مرتب کرکے میں نے بھجوا دیا تو وہ افسانہ شامل نہ تھا جس کے لئے اریب اتنا بے چین تھا ملاقات ہوئی تو پوچھا ۔

تو نے وہ کہانی دیکھ لی ہے ۔ ؟

میں نے کہا ۔ ہاں ۔ تمہیں اپنی مروتیں اور دوستیاں عزیز ہیں بابا ؟ ۔ کہنے لگا ۔ دوستی کے آگے صبا کی کیا حیثیت ہے ۔ میں نے کہا ۔ یہ ساری محبتیں تم شعری حصے میں بنا ہو ۔ اور تیجیے کہ محنت کرکے اس پر اصلاحیں کیں اور شعری حصے میں کتنی ہی محبتیں نبا ہیں ۔ نثر میں بھی کسی یار نے دامن پکڑ لیا تو وہ اس کے مضمون

سے سر پھوڑتا رہا۔ میں اور صفیہ ہنس ہنس کر ٹوکتے رہے کہ آخر یہ دردِ سر مول لینے کی اُسے کیا ضرورت ہے۔

بات آئی گئی ہوئی۔ اریب نے ان صاحب کے تقاضے پر جن کا یہ افسانہ تھا بالآخر کہہ دیا کہ بھائی ۔ میں مجبور ہوں ۔ افسانوی حصہ بالکلیہ اقبال متین دیکھتے ہیں انہوں نے پسند نہیں کیا۔

افسانہ نگار صاحب مجھ سے ملنے آئے ۔ بات ہوئی ۔ بُرا نہیں مانا ۔ صبا کے لئے دوسری کہانی بھجوانے کا وعدہ کیا ۔ بعد میں بھی دوست رہے ۔ حالانکہ اُن دنوں جدید افسانہ نگاروں کی صف میں وہ اپنی جگہ بنا رہے تھے ۔ لیکن اب برسوں میں کبھی کہیں ان کا نام ادبی مجادے میں سر فہرست نظر آتا ہے اور وہ بھی صرف اس حد تک کہ فلاں نقاد نے افسانہ نگاروں اور شاعروں کے ناموں کی کھتیاونی میں ان کا نام نہیں رکھا ۔ بس اس کے بعد وہ اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے ۔

اس واقعہ سے اریب کے مزاج کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ جتنا لاابالی تھا اتنا ہی بااصول بھی تھا ۔ ایسے تضادات ہی اریب کی شخصیت کی تحریف بھی ہیں تکمیل بھی۔

اریب نے کئی بار یوں بھی کیا کہ بعض مضامین جو کسی طرح بھی قابلِ اشاعت نہ تھے وہ تعلقات کی بنیاد پر صبا میں شائع کئے ، لیکن صبا میں چھپنے تک اس مضمون کی صورت ہی بدل کر رہ گئی ۔ اس طرح اُس نے جملے نہیں مضمون ہی بدل کر رکھ دیا ۔ اس حد تک کہ خالق سے بھی اپنی تخلیق نہ پہچانی گئی ۔

صفیہ بھی ایسی صورتوں میں دبا دبا احتجاج کرکے رہ جاتیں تھیں اتنا سب کچھ

کرنے کی کیا ضرورت ہے اریب۔

اریب مسکراتا ۔ اپنے لمبے بالوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا سر اٹھا کر قصوروار کی طرح صفیہ کو دیکھتا ۔ اس مضمون کا ایک آدھ پیراگراف پڑھ کر سناتا ۔ ہم ہنستے تو خود بھی ہم سے زیادہ ہنستا ۔ پھر کہتا دیکھو میں نے اس کو یوں بنادیا اور یوں ہنستے ہنستے مضمون ہی دوسرا بن جاتا ۔ اتنی محبتیں اس پاس و لحاظ کے ساتھ اس دور میں اب کون نبا ہتا ہے ۔

وہ شخص اس دنیا سے اٹھ گیا جس نے اس مضمون کی سفارش کی تھی وہ تھے اشفاق حسین اپنے وقت کی مرنجان مرنج پہلو دار شخصیت ۔ اقبال شناس ادیب سے آئی آر کے ڈائرکٹر رہ چکے تھے ۔ اخلاص کو گالی گلوج کی زبان عطا کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ۔ آپ اس بات پر شاید یقین نہ کرسکیں کہ گالی اُن کی زبان سے موتی بن کر جھڑتی تھی اور پیار بن کر دمکتی تھی ۔ فیض احمد فیض نے راجندر سنگھ بیدی کو خط لکھا تو یہ بھی لکھا کہ وہ اپنا گالیاں دینے والا اشفاق کیسا ہے اس کو سلام کہو ۔ مخدوم، اشفاق حسین اور میر حسن کے لطیفے پرانے عثمانین سے سینہ بہ سینہ آج کی نسل تک چلے آئے ہیں اور یادوں کے جھرد کے بن گئے ہیں ۔ اریب کے لئے بھی اشفاق حسین پیار اور احترام کی ملی جلی شخصیت تھے ۔ ایسے میں وہ ان کی سفارش کیسے ٹال دیتا ۔ اور مضمون نگار تھے ، نواب عمر خاں ۔ نواب قسم کے آدمی ہوتے کے باوجود اپنے عہد کے شاعروں اور ادیبوں کے دل دادہ ۔ یہ وہی نواب عمر خاں تھے ، اریب کے بعد صفیہ حسن کی زوجیت میں آئیں ۔ میں صفیہ کی اس دور کی زندگی سے کما حقہ، واقف نہیں ہوں جیسا کہ میں نے لکھا ہے یہ

دوریاں میں نے خود پیدا دلی تھیں اور پھر ضلع نظام آباد پر تبادلے کے باعث مجھے حیدرآباد چھوڑنا پڑا تھا۔ اریب یاد آتا تھا جیسے اپنا ہی یہ شعر مجھے باربار سنا رہا ہو۔

مرا یہ حشر بھی ہونا تھا اک دن
کبھی اک چیخ تھا، اب خامشی ہوں

اریب کو شاعر کی حیثیت سے جو کچھ ملنا تھا وہ اس سے محروم رہا۔ ہم نے اس کو اس کی وہ منزلت نہیں دی جس کا بلاشبہ وہ حق دار تھا۔

وہ فکر سخن جو لفظیات کے پیرہن میں اپنی انفرادیت کو چھوتی نظر آتی ہے اب اریب کا اسلوب فن بن رہی تھی۔ اریب کی شاعری کا ہم تفریق و تقسیم کے ابواب میں روفاتی، ترقی پسند یا "جدیدی" نام دے لیں بھی تو اس کا مرکزی کردار ترقی پسند رجحانات کا احاطہ کرتا ہے۔ اریب کی بعد کی شاعری میں موضوعاتی تنوع بھی اس بات کی نفی نہیں کرتا کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ترقی پسندی سے وہ اپنا دامن بچا سکا ہے۔ احمد آباد کے فسادات پر اس کی مشہور اور منفرد نظم اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ غیر شعوری طور پر بھی انسان دوستی کی ان صالح اقدار سے جو اریب کے فکر و شعور کا جز بن گئی تھیں کنارہ کش ہونا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ درآنحالیکہ اریب اپنی اس نظم کو جدید نظم یعنی "جدیدی" نظم کہتا تھا۔ ایک نجی بیٹھک میں اریب سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی تھی۔ مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد بھی اس وقت موجود تھے جو ان دنوں نقش، نہ تھے۔ اریب نے آخرش یہ تسلیم کیا تھا کہ اریب کی یہ نظم جدیدی

نظم کی تعریف میں نہیں آتی۔

یہاں اہم بات یہی ہے کہ کسی نظم کے حسن و قبح کا مدار اس کے ترقی پسند یا جدیدی ہونے پر نہیں ہے۔ اچھی شاعری بہرحال اچھی شاعری ہو خواہ وہ کسی مکتبۂ خیال کی نمائندگی کرتی ہو یا سرے سے نہ کرتی ہو۔ اس کے ساتھ کوئی خاص رجحان یا رویہ یا ازم چھاپ بن کر نہیں چلتا صرف زندگی اپنی بوقلموں حشر سامانی کو ساتھ لئے لئے چلتی ہے۔

اریب کو ادھر کچھ دنوں سے جدیدیوں کی صف میں شامل ہو جانے کا یہاں تک خبط ہو گیا تھا کہ وہ اچھے شعر کی تعریف سننے سے زیادہ جدیدی کہلانا پسند کرتا تھا۔

اریب صاف گو اور خلیق انسان تھا لیکن اپنی شاعری کے لئے اس کا اعتماد غلو کی حد تک تھا۔ اس معاملے میں وہ بہت ایگو یسٹک تھا۔ نرمی اور خلوص سے کوئی اس کے شعر پہ معترض ہوتا تو وہ ایک حد تک گوارہ کر لیتا۔ بات کرنے والے کی نیت مشتبہ ہوتی تو پھر اریب اسے کسی قیمت پر نہ بخشتا۔ اپنے مخصوص انداز میں بگڑ کر کہتا کہ غالب کے بعد اگر کہیں نظر ٹھہرتی ہے تو پھر سلیمان اریب ہی پر۔

اریب کی انا، تین پگ کے بعد خود اس کو پہچاننے سے انکار کر دیتی تھی۔ اریب کی اس انانیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بات بہت دور تک جاتی ہے۔

یہ پھکڑ پن، یہ جھنجھلاہٹ، دنیا بھر کو بزعم خود کمتر سمجھنے کی خود بینی کسی شاعر یا فن کار کے لئے نئی بات نہیں ہے۔ اریب نے بھی دکھ اٹھائے تھے۔ مصیبتیں جھیلی تھیں بھری جوانی کا رنگا رنگ قیمتی اثاثہ جیل کی کال کوٹھڑیوں اور سلاخوں کے پیچھے گنوایا تھا۔ آدمی زاد سے اس کے حقوق چھین لینے والوں کے

اُس نے اردو شاعری کو ایسے شعر دیئے جن کی آفاقی تہہ داری ہر دردمند دل سے اپنا رشتہ استوار کرلیتی ہے۔

اے تہمتِ حیات بتا کیا کریں اسے!
اکثر ہماری موت ہی رستے میں مر گئی

•

گزر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم سے
حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

•

جیسے روتے ہوئے بچے کو کوئی چمٹا لے
یوں غمِ دہر کو سینے سے لگا رکھا ہے

•

دل سے نکلی نہ خراش غم ایام کی دھوپ
تیرے ناخن سے کئی چاند بنائے ہم نے

•

بے گھری مجھ سے پتہ پوچھ رہی ہے میرا
دربدر پوچھتا پھرتا ہوں کہاں جاؤں میں

•

اندھوں کی بستی میں کب سے آئینے میں بیچ رہا ہوں
مجھ جیسے بھی عقل کے اندھے کم ہوتے ہیں اس دنیا میں

خلاف برسر پیکار رہا تھا ۔ پھر آخر ایسا کیوں ہوا کہ بوند بوند تالاب بھرتے بھرتے اس نے خود کو ایک ہی جست میں بھنور کے حوالے کر دیا ۔

یہ داستانِ پارینہ طویل بھی ہے تکلیف دہ بھی ۔ کمیونسٹ پارٹی کا کارکن ہونے پر فخر کرنے والا سلیمان اریب، کمیونسٹ ادبی سرغنوں کے ہاتھوں اس بے دردی سے مجروح کیا گیا کہ ساری ایسی قدریں جس کا وہ امین تھا تہس نہس ہو کر رہ گئیں ۔ سچ پوچھیئے تو سلیمان اریب کے امیج کو پامال کر کے کمیونسٹ پارٹی نے اپنے امیج کو سنبھالا دینے کے جتن کیے ۔

اریب نے جس بت کو پوجا تھا اُسی نے جب اس کے دل و دماغ کو لہو لہو کر دیا تو وہ ٹوٹ ٹوٹ گیا ۔ کئی دن اس پر سکتہ سا طاری رہا ۔ وہ بکھر بکھر کر خود کو بٹورتا رہا لیکن یہ پھانس سی اُس کے کلیجے میں آخری سانس تک رہی ۔

اعتماد کا فقدان بعض وقت دھیمے لہجے کو بلند آہنگی عطا کر کے خود کو مخفی رکھنے کی سعی کرتا ہے ۔ اریب ایک زمانے تک اسی جذبہ کا شکار رہا ۔ وہ پیپلز رائٹرس اسوسی ایشن کا جنرل سکریٹری بھی رہا ۔ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بھی رہا ۔ اس نے پارٹی کے ادبی فرنٹ پر پارٹی سے اپنی نظریاتی وفاداری وہاں تک جا کر نباہی جہاں شعر اس وفاشناسی سے گریز کا مطالبہ کرتا ہے ۔ اور جب اسوسی ایشن اور پارٹی نے اریب سے اس کے سہارے چھین لیے تو اس کا ذہنی ورثہ صحت مند تھا جس نے اپنی جڑیں اس کے شعر میں پیوست کیں ۔ اقلیم سخن کی تنہا راہ نوردی اور کسی سے کچھ نہ پا کر اپنے بل بوتے کا شعوری احساس اس کے شعر میں جاگزیں ہوا اور اسی دردمندی نے اریب کے شعر کو ایک جہت اور ایک مخصوص لہجہ عطا کیا اور

غضب تو یہ ہے کہ تجھ کو بھی کچھ خبر نہ ہوئی
ہوس کا سلسلہ کب تیرے پیار تک پہنچا

•

مِٹ گئے جس کے لئے نام تک اس کا نہ لیا
کاش اس بات کی اس کو بھی خبر ہو جاتی

•

پوچھیں اریب ہی سے کہ ویرانیٔ جہاں!!
نکلی جب اُس کے گھر سے تو پھر کس کے گھر گئی

•

سوچتا ہوں دنیا کو چھوڑ کر کہاں جاؤں
تیری بوئے پیراہن ہر نفس سے آتی ہے

اریب کی یہ معرکتہ الآرا غزل تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن مطلع کے لئے وہ ہنوز مضطرب تھا۔ شاہد صدیقی ملے۔ اریب نے غزل سنائی۔ بہت داد پائی۔ کہا۔ استاد مطلع نہیں ہو رہا ہے۔ شاہد صدیقی نے کہا کہ مطلع تو سامنے ہے اریب بھانپ گیا۔ مسکرا کر کہا۔ تو پھر ہو جائے استاد۔

شاہد صدیقی نے چھوٹتے ہی کہا

میرے پاس اک لڑکی دو برس سے آتی ہے
اُس کے پاس موٹر ہے پھر بھی بس سے آتی ہے

اریب "جدیدی جدیدیت" سے بھرپور آگہی کے بغیر اس کا شکار رہا۔ میں نے

شکار کا لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ اُس سے "جدیدی جدیدیت" پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن شاعری کے خارجی عوامل کا داخلی جذبات سے اتصال جو اجتماعیت کو انفرادیت کا رنگ عطا کرتا ہے، ضرور معرض بحث میں آتا ہے۔ کسی بھی تصورِ حیات کا فن بن جانا اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک کہ داخلی احساس و شعور کی آنچ میں تپ کر شخصیت کا جزُ نہ بنے۔ یہی بات تھی کہ اریب کی شاعری کا خاص طور پر ان کی غزلوں میں جو مزاج اور لہجہ بن رہا تھا اس کی صورت گری ابھی مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ اریب نے پینترہ بدل دیا۔ یہ دراصل پھر کسی سہارے کی تلاش تھی جو فن کے کس بل پر اعتماد کے فقدان سے پیدا ہوتی ہے۔ جھلاہٹ، اکتاہٹ نظریاتی محبوبہ کی پرستش میں زندگی گزارنے کے بعد سب کچھ لٹا کر اسی کے محل سرا کے دربانوں کے ہاتھوں بکھیری ہوئی عزتِ نفس کی دھجیاں سمیٹنا کسی بھی عاشقِ نامراد کو زندہ دفن کر دینے کے لئے بہت ہے۔

اُس کی "جدیدی" نظموں میں کم نظمیں ہیں جو اچھی ہیں۔ مجھے یاد ہے میں نے اریب سے اس نکتۂ نگاہ سے بات بھی کی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ اپنے سسرالی مکان موقوعہ معظم جاہی مارکٹ میں مقیم تھا۔

گفتگو کے دوران ترقی پسندوں سے لے کر جدیدیوں تک قریب قریب سارے کمزور شاعر زیرِ بحث آئے تھے جو یادوں کو مہمیز لگا کر اُس وقت سامنے آجاتے تھے اور جو اپنے فن کے کس بل پر نہیں بلکہ تحریک کے حواریوں کے ناطے اوپر اٹھائے جا رہے تھے۔ جدیدیے تو ترقی پسندوں سے چار ہاتھ آگے نکلے۔ وہ تو تحریک کے لفظ سے بھی بدکنے لگے اور اُس کو رویّے کا نام دیا۔ الفاظ کی اس

بازی گری میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ڈھکا چھپا دہی سب کچھ ہے جو سیاست سے لے کر ادبی سیاست تک کارفرما ہوتا ہے ورنہ سجاد ظہیر اور فاروقی نے ایک ہی رول ادا کیا ہے اس قبیلے کے میر کاروں حالی تھے جو ہر لحاظ سے بڑے فن کار تھے۔ تخلیق کا وہ کوب نہ سجاد ظہیر کے حصے میں آیا نہ فاروقی کے بس کا روگ ہوا اسی لئے یہ دونوں کوئی تخلیقی کام نہ کر سکے، تحریک کی قیادت اور بات ہے حالانکہ شاعری دونوں ہی نے کی۔ سجاد ظہیر نے میزان اور اسکیل توڑ کر اور فاروقی نے میزان اور اسکیل پکڑ کر۔ فرق صرف صورتوں کا ہے باقی رہے نام اللہ کا ...

ہاں تو جب اریب سے بات ہوئی تھی اس کے چار چھ دن بعد ہی اریب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اُس نے اُس دن کی بات کا اس حد تک اثر قبول کیا ہے کہ ایک نہیں تین تازہ غزلیں اسی گفتگو کے حوالے سے سنائی تھیں اس بات سے اریب کی افتادِ طبع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ادبی نظریات میں بھی سطح پر تیرتی ہوئی کشتیوں کے بادبانوں سے ہوا کے رُخ کا اندازہ کر کے یہ سمجھ بیٹھتا کہ بس دیکھتے ہی دیکھتے پار اتر جائے گا۔

ہمارے گروپ میں ایک تیز آدمی تھا۔ نام تھا سردار سلیم، خاندانی پٹھان نک سک کا درست لیکن مشتِ استخواں ذہین و فطین۔ ہم سب کا پیارا لیکن لڑنے بھڑنے میں ماسٹر۔ اریب نے جدید نظموں کے اعلان کے ساتھ جب کچھ نظمیں کہیں اور بہ اصرار سنا کر داد چاہی تو احباب یا تو خاموش ہو رہے یا داد دی۔ سردار سلیم کسی لوز بال LOOSE - BALL کو BOUNDRY تک پہنچائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اریب کی اِن جدید نظموں کا پڑا کر کے رکھ دیا۔ اریب

نہ مانا۔ سردار سلیم بھی خاموش رہنے والا کہاں تھا کرنول پہنچ کر جہاں اُن دنوں وہ رہتا تھا اُس نے اریب کو ایک خط لکھا کہ اس کی ایک بھانجی کو شاعری کا خبط ہو گیا ہے۔ یہ لڑکی مجھے بہت تنگ کرتی ہے۔ لیکن اس کی نظمیں دیکھتا ہوں تو بڑا اچھا رنگ نظر آتا ہے میں نے بہتیرا سمجھایا کہ کوئی اور ڈھنگ کا کام کرے لیکن اس پر تو شاعری کا بھوت سوار ہے تمہارے صبا نے اس کے توسنِ سخن کو اور بھی مہمیز کیا ہے ۔ اور اب تو وہ بے لگام ہو گئی ہے ادھر تمہاری کوئی نظم صبا میں دیکھی ادھر اپنی تازہ نظم لیئے دوڑی آئی۔ ناک میں دم کر رکھا ہے۔ نظمیں بھیج رہا ہوں تم ہی انصاف کرو۔ اریب نے نظمیں چھاپ دیں۔

" کڑوی خوشبو " تک پہونچنے میں اریب نے جو ذہنی سفر طے کیا تھا، کاش وہ سفر اور طویل ہو سکتا اور اریب ہم کو ایسی شاعری دے سکتا جو ایسے لہو سے لکھی جاتی ہے جس کا رنگ کا غذی رنگ میں مل کر بھی پہچانا جاتا ہے ۔

شراب جہاں بہت سوں سے اچھا سلوک نہیں کرتی وہ وہی لوگ ہیں جو شراب سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ ورنہ شراب بہت مہذب شئے ہے۔ آپ اس سے اس کی منزلت کو تسلیم کر کے ملیں۔ جھک کر ملیں، انکسار سے ملیں تو آپ کی خوشی اور غم دونوں میں اس سے بہتر کوئی دلداری و دلجوئی کرنے والا نہیں ہوتا۔ اکڑ کر شراب کی بارگاہ میں نہیں جانا چاہیئے۔ وہ بڑے بڑوں کا کس بل نکال دیتی ہے۔ ذرا راز داری میں اگر آپ کچھ اور کہنے کی اجازت دیں تو میں کہوں کہ شراب سے مباشرت کرتے وقت اس کے تقدس کا احساس دل کے کسی گوشے میں چھپا رہنا چاہیئے ورنہ شراب آپ کو زمانے بھر میں رسوا کر کے رکھ دے گی۔ عورت کے نشے اور شراب کے نشے میں اس فرق کو بہر حال ملحوظ رکھنا ہوگا ورنہ ہندوستانی عورت کی طرح شراب ہر ظلم نہیں

سہہ لیتی اریب کی یہی کمزوری تھی کہ وہ شراب کو باندی سمجھتے تھے اور شراب ایسے کسی
پندار کو خاطر میں نہیں لاتی ۔ چنانچہ ہوا یہی کہ شراب نے اریب کو کم بدنام کیا ۔شراب
کو بدنام کرنے والوں میں اریب نے نمایاں حصہ لیا ۔

شراب اس کی کمزوری تھی لیکن شراب کے اثر سے نکل کر وہ اپنی غلطی کو کھلے دل
سے تسلیم کر لیا کرتا تھا ۔ اس ایک واقعہ یا حادثے سے اس کی خود بینی اور خود احتسابی
کا بیک وقت اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ خلیل الرحمن اعظمی اور شہریار کسی مشاعرہ
کے سلسلہ میں علیگڈھ سے آئے ہوئے تھے بمبئی سے عزیز قیسی بھی آگئے تھے ۔ ان تینوں
کے ساتھ شاذ تمکنت ، عوض سعید اور میں ایک اچھی سی شام گزارنا چاہتے تھے ۔
ایک شام جالس میں محفل سجائی گئی ۔ شغل مئے جاری تھا اور واقعی محفل کا لطف آنے
لگا تھا ۔ اردو شاعری پر بات ہو رہی تھی ۔ اتنے میں سلیمان اریب آ گیا ۔ اریب
پہلے ہی سے " طلوع " ہو کر آیا تھا اس حد سے شاید آگے نکل آیا تھا جہاں وہ
اپنی خود احتسابی کو خود بینی کے حوالے کر دیتا تھا ۔ صنف غزل معرض بحث میں آئی تو
شہریار نے برسبیل تذکرہ کہا کہ " ان دنوں پاکستان میں اچھی غزل لکھی جا رہی ہے " ۔
یہ بات شہریار نے بالکل کھلے دل سے کہی تھی ان دنوں اریب نے بھی اچھی غزلیں
کہی تھیں ۔ وہ برہم ہو گیا شہریار نے پاکستان میں غزل کی جو بات کی تھی وہ بڑی حد
تک درست بھی اور پھر ذاتی طور پر کسی شاعر سے اس کا کوئی علاقہ نہ تھا ۔ سچ پوچھیے
تو اُن دنوں شاذ اور خود شہریار اور اعظمی نے بھی اچھی غزلیں کہی تھیں ۔ لیکن یہ بات
اریب کو کھل گئی وہ ایک دم شہریار پر برہم ہو گئے جو محفل علمی سطح پر بہت
ہی مہذب انداز میں برپا تھی ایسی تہس نہس ہوئی کہ جی جل کر رہ گیا ۔ اس وقت اریب

اس کیا اہل ہی نہ تھا کہ کوئی بات سنجیدگی سے اُس سے کی جاتی۔ عزیز قیسی، ادیب کے مزاج کے اس پہلو سے واقف تھے کہ انہیں سمجھانے منانے سے کام نہ چلے تو پیار سے ڈرا دھمکا کر بھی کام نکالا جا سکتا ہے۔ سو انہوں نے وہی کیا اور ادیب کو لے کر چلے گئے۔ میں شاذ اور عوض بے حد شرمندہ تھے۔ اعظمی اور شہریار ہمارے مہمان تھے ہم نے حیدرآباد بلا کر اُن کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ ہماری معذرت پر الٹے دونوں ہماری دلجوئی کر رہے تھے میں ان دونوں سے پہلی بار ملا تھا اور زیادہ ہی متاثر اور دکھی تھا۔ ادیب کے جانے کے بعد بھی انہوں نے ادیب کے تعلق سے کچھ نہ کہا۔ گفتگو کے موضوع بدل گئے بلکہ دانستہ بدل دیئے گئے لیکن دلوں کی شگفتگی کو ادیب کچھ اس طرح مجروح کر گیا تھا کہ سنبھلنا مشکل تھا۔ یہ سب کچھ ادیب سے از خود رفتگی میں سرزد ہوا تھا کسی قسم کے ذہنی تحفظ کے بغیر پہلے ہی سے کسی بغض و عناد کے زیر اثر کسی کی دل شکنی کرنے کی پلاننگ کرنا ادیب کو زندگی بھر نہیں آیا۔ اس واقعہ کے پیچھے بھی بات کچھ نہ تھی۔ ڈھکا چھپا کچھ تھا تو یہی تھا کہ شہریار نے اس وقت ادیب کی غزلوں کی تعریف نہیں کی۔ ادیب پاکستان کے سارے غزل گو شاعروں کو اپنا حریف و مقابل سمجھ بیٹھا اور برس پڑا۔

صبح ہوئی تو اس کے گھر جا کر میں نے ادیب سے اُس کے طرزِ عمل کی شکایت کی مجھ سے ساری روداد سُنی۔ بہت شرمندہ ہوا۔ کہا۔ بُرا ہوا یار۔ مجھے کچھ یاد ہی نہیں۔ میں آج ہی دونوں سے مل کر معذرت کروں گا۔ یہ دونوں ہی میرے چہیتے ہیں۔
ایسا نہیں ہے کہ ادیب اپنے سوا کسی کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ سچ پوچھیئے تو وہ کھل کر داد دیتا اور اچھی چیز کی تعریف و توصیف میں بخل کو کفر سمجھتا۔

اریب ، صبا اور صفیہ ۔ ایک مثلث تھا جس کے دو خطوط نہیں رہے ۔ ایک خط رہ گیا تھا۔ سو اب اریب سے اُس کی وابستگی بھی ایک قصۂ پارینہ ہوئی ۔ صبا کو اریب نے خونِ جگر دے کر پالا تو صبا نے بھی اپنا سب کچھ اریب پر لٹا دیا۔ اریب کے لئے ازوقہ کی فراہمی کا ذریعہ صبا ہی تو تھا۔ اس مردِ خدا نے دیکھئے صبا سے بھی کیسا برتاؤ کیا۔

ایک بار اریب منسٹر کے گھر گیا صبا کے لئے اشتہار کی فراہمی کا مسئلہ تھا کچھ دیر بیٹھا رہا۔ باریابی جلد نہ ہو سکی اٹھا اور چلا آیا ۔ یہ سلوک اریب نے خود سے کیا ہے اگر منسٹر سے مل لیتا تو اشتہار یقینی تھا اور بڑا تھا۔ جس کا علم بھی اریب کو تھا۔ الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا آج بھی اریب کا خیال آتا ہے تو یہی سوچتا ہوں ۔ اللہ میاں نے اگر اس کو خوش آمدید کہنے میں پانچ دس منٹ کی تاخیر کی ہو گی تو وہ لوٹ گیا ہو گا اور جانے کہاں کہاں آسمانوں میں سر چھپائے اماں پھر رہا ہو ۔ بدمستی کے عالم میں ہر ایک کے ہاتھ سے شراب طہورہ جھپٹتا ہوا اور اس میں فرشتے کے لئے زہر گھولتا ہوا اور یہ سب کچھ وہ اس وقت تک کرے گا جب تک مشیت ایزدی مسکرا کر اس پر مہربان نہ ہو جائے ۔

• • •

اقبال متین

سرگوشی

شاذ تمکنت کے آخری دنوں کے نام

آمد (۳۱ جنوری ۱۹۳۳ء ——— ۱۸ اگست ۱۹۸۵ء) رخصت

شاذ میرے پیارے دوستوں میں سے تھا۔ عمر کے تفاوت کے
باوجود کچھ یوں لگتا تھا کہ درون خانۂ دل ہنگامہ آرائی کا کوئی ایسا پہلو جاگزیں ہے
جو ہمیں مضطرب رکھتا ہے۔

شاذ کو بچھڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اس کی عمر مرنے کے لئے
نہیں تھی۔ کہیں اس کو بالاقساط مرنے کیلئے کسی ایسے جواز کی تلاش تو نہ تھی جس کو
وہ شعر کے پردوں میں چھپا کر رکھ سکے۔ اور وہ جواز جسے شعر کے پردوں
میں اس نے چھپا لیا تھا۔ اس تک کم کم نظریں ہی پہنچی ہوں گی۔

محبت کو جان کا جوکھم بنا لینا جوانی کی انا تو بن سکتا ہے۔ لیکن
گھر کی چاردیواری میں سانس لیتی وابستگیوں کو سینے میں ساتھ ساتھ اٹھائے
پھرنا، عشق کے پندار کو وہاں تک لیجا کر بے سروساماں کر دیتا ہے جہاں سے

لوٹ آنا بس میں نہیں رہتا۔ شاذ اب لوٹ آنے کے سو سو جتن کر رہا تھا۔ بار بار کر جیتتے جیتتے، جیت جیت کر ہارنے کی سکت اب اس میں نہیں رہی تھی۔ اس نے زندگی کا سود چکاتے چکاتے اب اس قرض کا اصل چکانے پر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ لیکن اقساط کے تعین کا کوئی معاہدہ کئے بغیر اجل نے اپنا ظالم ہاتھ بڑھا کر اس کا سارا اثاثہ جسم و جاں اٹھا لیا۔ شاذ نے مرتے وقت تک ایسا تو کبھی نہیں سوچا تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

وہ مہربان شوہر اور مشفق باپ تھا۔ میں نے شاذ کا ہر رنگ دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ پی ہے۔ رندی اور سرمستی کی بے راہ روی پر باتیں کی ہیں۔ زیادہ مئے نوشی پر ٹوکا ہے۔ کبھی کبھی جام ہاتھ سے لے کر اپنے سامنے رکھ لیا ہے اور ادھر ادھر کی باتوں میں اسے بہلایا ہے۔ اس کے شعر سنے ہیں اور اس طرح اسے خود کشی سے باز رکھا ہے۔

ایک رات لکڑی کے پل پر پہنچ کر جب اس نے جیب سے وہ پوا نکالا جو بار سے چلتے وقت جانے کب نظر بچا کر خریدا اور مجھ سے چھپا لیا تو

کیا تم نے اتنی ساری پی لی ہے جتنی جگر مرحوم نے کبھی پی تھی ـــــ لیکن جب انھوں نے چھوڑ دی تو ڈاکٹر کہتے رہے کہ اب اس طرح چھوڑ دینا آپ کیلئے مضر ہے"۔

"لوگ ان کا امیج بناتے ہوں گے!"

میں نے کہا ـــــ نہیں امیج تو انھوں نے خود اپنا بنایا تھا۔ جن دنوں بدمستی کے عالم میں مشاعرہ پڑھتے کبھی شراب اپنے کپڑوں پر چھڑک لیتے تھے"۔

"میں بھی چھوڑ دوں متین بھائی؟ ـــــ مگر کیسے چھوڑ دوں متین بھائی؟

"میں تمہیں چھوڑنے کے لئے کب کہتا ہوں ـــــ میں تو بس اتنا کہتا ہوں کہ اس وقت کو پیش نظر رکھو جب وہ خود تمہیں چھوڑ دے گی ـــــ منٹو اور مجاز تمہارے سامنے ہیں ـــــ لیکن جوش آج بھی سرخیلِ رنداں ہیں اور تم دیکھنا ابھی بہت دن رہیں گے"۔

میں نے خالی جاتا ہوا آٹو روک لیا۔

وہ آٹو والے سے کہنے لگا ـــــ جاؤ صاحبزادے جاؤ ـــ ابھی بہت رات پڑی ہے" آٹو والا نو عمر لڑکا تھا۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔ سوچا ہوگا کہ اتنی رات میں اور اس عالم میں کرایہ ملے نہ ملے۔ میرے روکتے روکتے

روکتے وہ چلا گیا۔

شاذ اب ضد پر اتر آیا تھا۔ اپنی اس کامیابی پر ہنسنے لگا۔

بعض لوگ اپنا امیج بنانے کے لئے شاید کسی موقع کو بھی گوارا کر لیتے ہیں ـــــ شاذ کے قریبی دوستوں میں کسی صاحب نے ایسی باتیں صرف کہی نہیں لکھی بھی تھیں کہ شاذ کے مرنے میں ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم نے بھی برابر کا حصہ ادا کیا ہے۔ الفاظ من وعن یہ نہیں ہیں لیکن مفہوم و مقصد یہی ہے ـــــ وہ اخلاقی جرأت اور ہمت سے کام لیتے تو یہی بات "واحد متکلم" میں کر سکتے تھے جس کا انھیں حق تھا ـــــ لیکن وہ خود کو صاف بچا لے گئے ـــــ حالانکہ بڑے شاعروں کی پذیرائی میں رات رات بھر شاذ نے انھیں کے گھر پر محفلیں سجائی تھیں اور انھوں نے میزبانی کی لاج رکھی تھی۔ ایک بار نہیں کئی بار ـــــ اب ایسے میں شاذ کی محبت اُن کے دل میں جاگزیں تھی یا آنے والے اس وی آئی پی کی جو شاذ کی وجہ سے ان کے گھر میں آیا تھا ـــــ یہ باتیں انھیں کا ضمیر جانے یا اللہ میاں ـــــ ہمیں ایسی باتیں کرنے سے گریز کرنا چاہیئے جن سے شاذ کے دوسرے چاہنے والوں کی دل شکنی ہوتی ہے۔

اور خود اپنا امیج بنتا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں میرے حیدرآباد چھوڑنے کے بعد اگر شاذ کا کوئی ایسا حلقۂ احباب استوار ہو گیا تھا تو مجھے نہیں معلوم ورنہ شاذ کے ساتھ پینے کا لطف دو ڈھائی گھنٹے کے بعد تیزی سے انحطاط کی طرف بڑھتا ـــــ شروعات کے بعد دو تین گھنٹے شاذ کے ساتھ اتنے پُر لطف رہتے کہ شراب اس کے وجود کے حسن سے دو آتشہ ہو جاتی۔ اس کے بعد

جیسے جیسے وقت بڑھتا شاذ کو شراب پینا شروع کردیتی اور وہ وہسکی کا ایسا
معلول محض ہو کر رہ جاتا کہ شراب سے اس کے ساتھ پینے والے کو ہیک شروع
ہو جاتی اور ہمارے بیچ سے شراب ہٹ جاتی، صرف شاذ کا تحفظ درمیان
میں رہ جاتا ــــ مخدوم اور شاذ کے ساتھ پینے کا یہ فرق مخدوم اور شاذ کی
زندگی میں زندگی بھر رہا۔

شراب شاذ کی ایسی کمزوری بن گئی تھی کہ وہ اپنی خود ساختہ بے سکون
زندگی کو اضطراب کے ایسے آئینوں کا عکس بنا لیتا جن میں اچھی خاصی سامنے کھڑی
زندگی کرچیاں کرچیاں بن کر بکھری ہوئی نظر آتی یہ حقیقت نہیں تھی۔ حقیقت
کو کیموفلاج کرنے کا ہنر تھا جو شاذ کو آ گیا تھا۔ یہ بات بالکل الگ ہے
کہ اسی کیموفلاج کے ہنر نے اس سے عشقیہ شاعری کی بڑی نازک منزلیں سلیقے
سے طے کروالیں جہاں اس کی شاعری کا ذہن گیرائی کو سمیٹ سمیٹ کر بڑی
شاعری کے امکانات دہراتا رہا۔ لیکن اس امر سے انکار ممکن نہیں
ہے کہ اسی خود پسندی، ایذا طلبی اور خود ترحمی کو شاذ اپنی نرگسیت کا جواز بنا لینے
کے جتن کرتا رہا اور فراریت میں پناہیں ڈھونڈھنے سے شراب اور زردہ
اُسے بچا نہیں سکے۔ وہ خود کو ہار دینے اور کھو دینے کا بلاشرکت غیرے
ذمہ دار ہے۔ کاش اس کی خود بینی خود احتسابی سے کبھی آنکھ ملا سکتی۔

آلو چلے جانے کے کچھ ہی دیر بعد میں نے آتے ہوئے رکشا کو
روک لیا ــــ کہنے لگا۔

"متین بھائی جانے دیجئے اِسے ــــ ابھی کچھ دیر یہیں بیٹھ کر باتیں

کریں گے ۔"

میں جانتا تھا کہ وہ کیا باتیں کرے گا۔ میں نے کہا۔

"نہیں نہیں، باتیں بہت ہو چکی ہیں اب تک۔ تمہیں میرا بھی کچھ خیال کرنا چاہیئے۔

"تو پھر آپ جایئے متین بھائی"

مجھے بُرا لگا ــــ میں نے کہا شاذ ــــ

"تم نے بہت آسانی سے کہہ دیا کہ میں جاؤں اور یہ جان کر کہا ہے کہ میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر دن نکل آئے تب بھی نہیں جا سکتا۔"

رکشے والا جہاں دیدہ تھا ــــ سیٹ پر بیٹھے اطمینان سے سگریٹ جلا کر ہمیں دیکھ رہا تھا ــــ شاذ آگے بڑھا۔ نپ اپنے جیب میں رکھ لی جس میں سے آدھی وہسکی وہ غٹاغٹ گیا تھا اور مجھ سے چمٹ گیا۔

"میرے متین بھائی کیوں نہیں جا سکتے آپ؟"

"آپ نہیں جا سکتے میں جانتا ہوں" ــــ اور سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگا ــــ شاذ کے آنسو تھے اور میرا گریباں ــــ اس کے لمبے لمبے گھنے بالوں میں اپنی تھرتھراتی انگلیاں میں نے پیوست کر دیں اور اسے چمکارتا پچکارتا رہا ــــ میں نے محسوس کیا کہ میں بھی ڈھنگ سے الفاظ ادا نہیں کر پا رہا ہوں۔ یہ بھی چاہتا ہوں کہ اسے میرے رندھے ہوئے گلے کا اندازہ نہ ہو۔

وہ ذرا سنبھل گیا تو ہم رکشا میں بیٹھ گئے۔

کچھ دُور چلنے کے بعد اُس نے کہا ـــــ "متین بھائی بس دو منٹ کے لئے رُک جاتے ہیں"

میں نے اس کی ٹھُڈی پکڑ کر دلار سے کہا ـــــ نہیں جان تو مجھ سے وعدہ کر چکا ہے کہ اب اس دروازے پر اسطرح کبھی نہیں جائے گا اور اب سیدھے گھر چلے گا۔

اس نے گلوری منہ میں دبائی، میرے شانے پر اپنا سر رکھا اور بے خبر سو گیا۔ رات ڈوب رہی تھی۔ میرے شانے پر اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے گال کے نیچے دے رکھا تھا۔ مہکی اور زردے کی ملی جلی تیز خوشبو سے مجھے ناگوار ہو رہی تھی۔ وہ سو رہا تھا۔ لیکن میں اس کی آواز صاف سن رہا تھا۔ اس کا حافظہ غضب کا تھا۔ ترا شیدہ کی طویل نظمیں بھی میں نے اسی شب بار میں سُنی تھیں۔ اس نظم کو جو مجھ سے اس وقت سرگوشیاں کر رہی تھی شاذ نے زمانے سے ترزجاں بنا رکھا تھا۔ ہم اس مقام کے بہت قریب سے گذر رہے تھے جہاں اس کی یہ نظم مجسّم تھی اور شاذ نے دو منٹ تک رک جانے کی ضِد کی تھی۔

میں نے ہر رنگ میں سنگیت کی پوجا کی ہے
آسرا کس کا تھا نغمات کے دامن کے سوا
سوچتا ہوں کہ اگر سُر نہ سہارا دیتا
دوشِ پر وہ غمِ دنیا کی گراں باری تھی
سانس اکھڑ جاتی مری، تھک کے کہیں سو جاتا
ریزۂ آئینہ شام و سحر ـــــ ہو جاتا

اُف یہ مر مر کے جئے جانے کی بے سود لگن
محبسِ دہر میں کیا قہر ہے سانسوں کا چلن
بے سبب دل کو گماں ہوتا ہے جیسے تو نے
میری اشکوں، میری آہوں کا سماں دیکھا ہے
تو نے دیکھی ہے مری رات کی گم گشتہ سحر
میری بجھتی ہوئی شمعوں کا دھواں دیکھا ہے

•

تجھ پہ آئینہ ہے جیسے میرا مجروح شباب
تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے مرے زخموں کا حساب
مریم نغمہ تری لے میں ہے تنویر شفا
تو مری خاک کو سودائے پرافشانی دے
رختِ ہستی کو تمنائے گریبانی دے

گھر پہنچے تو میں نے شاذ کو جگایا لیکن وہ نہیں جاگا۔ آہٹ پاکر محمدی سلمہا جاگ گئی تھیں اور دروازے پر منتظر تھیں ـــــ میں نے احتیاط سے دوہرا ہوکر شاذ کو بڑی مشکل سے اتارا اور بستر پر لے جاکر سلانے میں کامیاب ہوا۔ بیگم شاذ نے مدد کی۔

جنم جنم کی سیاہی، برس برس کی یہ رات
قدم قدم کا اندھیرا، نفس نفس کی یہ رات

تمہاری نکہت برباد کو ترستی ہے
اب آؤ آکے امانت سنبھال لو اپنی
تمام عمر کا یہ رت جگا تمام ہوا
میں تھک گیا ہوں مجھے نیند آئی جاتی ہے

شاذ نے جو امانتیں خواہ کسی نکہت برباد کو سونپنا چاہی ہوں لیکن تمام عمر کا رتجگا ہونے سے پہلے بیگم شاذ نے بڑے چاؤ سے اس کی ہر امانت سنبھال کر رکھنے کے جتن کئے۔

وہ پیارا تھا لیکن ضدی بھی تھا ـــــ دوستی میں جو شخص ترازو کے توازن پر نظر نہ رکھنے کو اپنی انا کی سبکی سمجھتا تھا اس شخص نے عشق میں ترازو ہی ہاتھ سے پھینک دی اور ہر پیمانے کو عشق کی اہانت جانا۔ اس کے ساتھ ہی وہ باوضع اور رکھ رکھاؤ کا آدمی بھی تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی عالم مستی میں بھی اس نے مجھے آپ سے تم کہا ہو حالانکہ اس کے ایگو کو ٹھیس لگنے پر بہت سوں کا بڑا کرتے میں نے اسے دیکھا ہے ـــــ خود مجھے بھی اس نے صرف ایک بار نہیں بخشا تھا۔ راشد آذر کے گھر میں مجھ سے اور عزیز قیسی سے زیادتی کی ـــ ہم دونوں ہی دکھی تھے۔ لیکن دوسرا دن چڑھنے سے پہلے وہ میرے گھر پر موجود تھا۔

دسمبر ۱۹۷۸ء میں پوچم پاڈ کی ملازمت کے سبب جب میں اس سے جدا ہوا تو اس سے ملاقاتوں کا سلسلہ کچھ اسطرح منقطع ہوا کہ بڑے طویل وقفے حائل رہے پھر یہ سلسلہ یک لخت ختم ہو گیا جب بیوی بچوں

سمیت بالکلیہ پرچم یاد اُٹھ آیا ـــــــ سچ پوچھیئے تو میں پھر اس شاذ سے مل ہی نہ سکا جسے میں حیدرآباد میں چھوڑ آیا تھا شگفتہ چہرہ، شگفتہ لہجہ، اظہار شگفتہ، شگفتہ یاری، شگفتہ بے نیازی۔ اُس کے ہر بانکپن میں زندگی کچھ اسطرح رچی بسی تھی کہ موت کا وہم و گمان بھی نہ ہوا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ کوندے کی وہ لپک جو پلک جھپکنے میں ہر اندھیرے کے دل میں اتر جانے کی ہمت رکھتی ہے وہ شاذ کا مزاج بن رہی تھی ـــــ وہ جس تیزی اور طمطراق سے اقلیم ادب میں داخل ہوا تھا، اسی شتابی سے ایوانِ شعر کے در و دیوار سجا سنوار کر نکل پڑا۔ وہ بے حد ذہین تھا ـــــ اُس کی حساس ذہانت نے اس کی تیز گامی کو اتنی سرعت رفتار عطا کی کہ وہ زندگی کا جتن ہی بھول بیٹھا اور شہاب ثاقب نے وسعت کونین کی پہنائیاں راتوں رات ناپ لیں۔

اس کے بارے میں دور رہ کر میں نے بہت کچھ سُنا۔ چاہنے والوں نے اُس کے دیئے جلا رکھے تھے ـــــ حاسدوں نے ٹمٹماتے چراغ کی دم توڑتی لوئیں سینوں میں بسا رکھی تھیں ـــــ شاذ نے حیدرآباد کو شاعری کی دنیا میں جہاں لے جا کر رکھ دیا ہے اس مقام کا اتا پتا پوچھتے پوچھتے کتنی ہی زبانیں سوکھ گئیں ـــــ لیکن تراشیدہ، بیاضِ شام اور نیم خواب کا خالص غنائی لب و لہجہ نواسنج تو نہ بن سکا دنیائے شعر کی نغمگی ضرور بن کر رہا۔

آخر آخر میں، جب میں اس سے ملا تو اُس کو دیکھ کر سہم گیا۔ لگتا تھا شاذ نے کفن زیب تن کر رکھا ہے اور کہیں بہت دور دراز محفلِ شعر

سجانے کی تیاریاں کر لیں ہیں ــــ مجھے حیراں دیکھ کر اُس نے کہا ۔

"میتن بھائی اب تو میں اچھا ہوں" آپ مہینہ بھر پہلے ملتے تو پہچاننا مشکل ہوتا ۔"

میں نے بہت ہمت کر کے خود کو سنبھالا، گویا پہچان اب آسان ہے

بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا ۔

کہنے لگا ــــ "میتن بھائی میرے پاس آ جائیے ۔"

میں نے تاکید کی کہ آرام سے لیٹے رہو اور تخت کے برابر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ رہا ۔

کہنے لگا ــــ ۱۵ ــــ ۱ ــــ ۰ ــــ ہاں ۔ ایسے میں بہت کھینچ کر اور خوشی دبا کر ہاں بولتا تھا وہ ــــ

"ہاں اب بات ہوئی نا"

میں نے اپنے آپ کو بہت قابو میں رکھا ــــ اللہ کیا واقعی میں اپنے شاذ سے مل رہا ہوں ــــ کوئی کھا جرا اندر ہی اندر چھلک چھلک پڑتا تھا ــــ

پلکوں تک آنے کی اس چھلکنے والے کو ہمت ہی نہ ہوتی تھی ۔

آنسو واقعی کتنی بڑی نعمت ہیں کہ وہ درد کی پہچان رکھتے ہیں ۔

اندر ہی اندر ڈھلک ڈھلک کر خشک ہو جانے کا گر بھی جانتے ہیں کہ اس وقت سوائے دل کے کوئی ان کا آشنا نہیں ہوتا ۔

دیر تک باتیں کرتا رہا ۔ کچھ حاسدوں کی باتیں کیں اور اپنی

جی داری کا ثبوت دیتے ہوئے اسی اپنے پندار کا بھرم رکھا۔

کہنے لگا ــــــ میں جیوں گا ــــــ ایسے کرم فرماؤں کو یہ بتلانے کے لئے جیوں گا کہ میں بہرحال شاذ تمکنت ہوں ــــــ مجھے نام بنام بتلا تا رہا کہا ــــــ متین بھائی یہ لوگ عیادت کیلئے کبھی نہیں آئے۔

میں نے کہا۔ تم کو خوش ہونا چاہیئے کہ ان اوچھے حضرات نے اپنی پہچان خود فراہم کردی۔

"مگر وہ مجھ سے ملتے کس طرح تھے ۔ میں کیا بتاؤں آپ سے"

"بچھ کر ملتے تھے نا!؟"

"ہاں، بچھ جاتے بس۔"

"اس وقت وہ شاذ تمکنت سے ملتے تھے۔ کسی بیمار سے نہیں"

"مگر کیا یہی سچ ہے متین بھائی"

کچھ سنبھل کر وہ پھر کہنے لگا ــــــ

اس بار اس کی آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی اجنبی سی لگی۔

اس آواز میں دور دور تک پندار کا وہ بھرم بھی تو نہ تھا۔

اس نے دو ایک نام ایسے لئے کہ میں نے موضوع بدل دینے میں ہی اس کی اور اپنی عافیت سمجھی۔

میں نے کہا "جان! تو نے اتنی آسانی سے مجھے بھلا دیا؟"

کہا ــــــ "نہیں ــــــ متین بھائی ــــــ میں میرے متین بھائی کو بھول ہی نہیں سکتا۔"

میں نے کہا ــــ "تم نے یہ محلہ چھوڑا اور خطوط بھی بند کر دیے
مجھے پتا چلا کہ یونیورسٹی کیمپس میں کہیں منتقل ہو گئے ہو ــــ میں نے یونیورسٹی
کے پتے پر دو خط لکھے ــــ کوئی جواب نہ ملا ۔ تمہیں خطوط نہیں ملے"؟

اُس نے دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ لے کر کہا ــــ
میرے متین بھائی ــــ گویا معذرت کر لی ۔
"پوچم پاڈ آنے کے وعدے کرتے رہے تم ــــ مجھے کتنا
آس میں رکھا"

شاذ نے کیوں اتنی احتیاط برتی ۔ اس کی شتابی کو کیا ہو گیا تھا ۔
جس طرح وہ لکھتا رہا تھا ــــ جلد ہی عوض راشد اور خیرات ندیم
کے ساتھ پوچم پاڈ آؤں گا ــــ اب اس نے ایسا کیوں نہیں کیا ــــ کیا
وہ جان گیا ہے ــــ اگر وہ کہہ دیتا کہ میں آؤں گا ــــ تو پھر میرا کیا
ہوتا ــــ اس کا کیا ہوتا جو میرے اندر ہی اندر چھلک چھلک کر اپنی ہی
پیچ میں اپنے آنسو جلا رہا ہے اور مجھ سے کہہ رہا ہے ــــ
نہیں شاذ اب نہیں آئے گا ۔

لیکن میں دیر تک اس کے پاس رہا تو اس کی اسی طمانیت سے
مجھے بڑا سکون ہوا کہ شاذ اب بھی زندگی کا بھروسہ کیے ہوئے ہے ۔
میرے خط کا جواب دیتے ہوئے ۲۳/جون ۸۵ء کو اس نے لکھا ۔

۲۳/جون ۸۵ء

پیارے متین بھائی ۔ محبت

چھپی ہیں۔ آپ نے شاید دیکھی ہوں۔ آپ کی ایک کہانی
شب خون والی پڑھی نہیں ہے۔ لیکن تعریف بہت سنی
ہے۔ شب خون فراہم کردوں گا۔

میں ابھی رخصت پر ہوں۔ طبیعت مضمحل رہتی ہے
تازہ کلام آئندہ خط کے ساتھ۔

ہمیشہ آپ کا شاذ

۲۳ر جون ۸۵ء کو اُس نے مجھے خط لکھا ہے اور ۱۸ر اگست ۸۵ء
کو اس نے دنیا چھوڑ دی۔۔۔ یہ تو ایک ماہ ۲۵ دن کا وقفہ ہے۔

۱۷ر اگست ۸۵ء کو میں اُس سے دواخانہ اسری میں ملا تھا۔ اُس
کی موت سے ۱۷ گھنٹے پہلے۔ اُس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں جلد ہی پھر آؤں
اور میں نے اس سے قطعی وعدہ بھی کیا تھا۔

اِن دنوں میں سرکاری کام سے حیدرآباد آیا ہوا تھا کہ شاذ کی دواخانہ
اسری میں شرکت کی خبر اخبار سے ملی تھی۔۔۔ اس سرکاری کام کے سلسلہ میں مجھے
پوچم پاڈ لوٹ کر پھر بلدہ آنا تھا۔۔۔ اسی لئے میں نے اُس سے حتمی وعدہ کیا
تھا۔۔۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ اس سے وعدہ وفا کرنے کے لئے کوئی کل
اس کے فردِ حساب میں نہیں رہ گیا ہے۔

جتنی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا اس کو بے حد بے چین پایا۔
اس کا مرض الموت تو کب کا شروع ہو چکا تھا۔ اب جو اضطراب تھا وہ تو
بس بھڑک بھڑک کر بجھنے کی پیش بندی تھی۔

آپ کا ۶ جون کا لکھا ہوا خط مجھے مل گیا تھا۔ جواب بروقت نہ لکھ سکا۔ اس لئے کہ طبیعت حاضر نہ تھی۔ اور پھر جس طرح ٹوٹ کر آپ نے لکھا ہے وہ پڑھ کر غم آستیں کو سکھانے کے لئے وقت درکار تھا۔

آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ شہر کے خرخشوں سے دور ایک دنیا بسا لی ہے۔ میں نے کبھی کہا تھا سے

کوئی خواہش نہ تمنا نہ شکایت نہ گلہ
سب کو دیکھ آئے اسی دیدۂ پر آب سے ہم

یونیورسٹی کھل گئی ہے لیکن ایک ماہ اور آرام لوں گا — دراصل تھکن زیادہ ہی محسوس کرتا ہوں۔ بس جی چاہتا ہے کہ گھر سے قدم نہ نکالوں۔ B.P کے Low ہو جانے سے 115/60 مزاج سست رہتا ہے۔

جس طرح آپ ادبی ماحول سے ادب سے گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ میں بھی بے سر دپا باتوں سے گھبرانے لگا ہوں۔

میں نے فیض کی موت پر نظم کہی تھی۔ اس کے علاوہ فسادات پر ایک اور نظم "یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے" دو ایک غزلیں کہی تھیں۔ "سیاست" میں

اپنے بچے فواد سے بیاض منگوائی ــــــ کسی غزل کے بارے میں کہا ــــــ پھر مجھ سے کہا ستین بھائی نیر کر دیجئے سیاست کو بھجوا دوں ۔ فواد کو غزل نہیں ملی ــــــ میں نے بھی دیکھا نہیں ملی ــــــ اس بیاض میں نا مکمل چیزیں اِدھر اُدھر تھیں ــــــ شاذ جس کی نظمیں اور غزلیں ہندو پاک کے ممتاز و معیاری جریدوں میں نمایاں طور پر آئے دن چھپتی رہتی تھیں، روزنامہ سیاست میں چھپنا اس کے لئے باعث توقیر نہیں تھا۔ لیکن آج صحت کی اس منزل پر سیاست میں غزل بھجوانے کے لئے وہ مُصر تھا ــــ

درونِ خانہ ہنگامے تھے کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر تھی

(اس شعر میں ضرورتاً میں نے ہلکا سا تصرف زماں کی حد تک کیا ہے)

بستر مرگ پر شاذ کے اس اصرار کے پیچھے خدا نہ کرے کہ وہ سب کچھ ہو جو میں سمجھ رہا تھا ــــ لیکن اس کی طویل بیماری، سیاست میں اُس کے کلام کا مسلسل چھپنا مجھے یہی سمجھا رہا تھا کہ وہی سب کچھ ہے جسے میں جھٹلا رہا ہوں ــــ عابد علی خان مدیر اعلیٰ روزنامہ سیاست کا شاعروں سے تعلق خاطر، یہاں حیدرآبادیوں کے لئے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ انھوں نے اس قبیلہ دار و گیر کے دُکھ درد کو اپنا دکھ درد جانا ــــــ میں اُن سے دور دور رہ کر بھی شاہد صدیقی، ابن احمد تاب، سلیمان اریب اور شاذ تمکنت کی وساطت سے ان کی دل فگاری کا راز داں بھی تھا۔ قدرداں بھی ــــ

بعض مصلحت پسند اور جی حضوری کرنے والوں نے اس بات کو او...
ہی رنگ دیئے تھے جب میں نے ایک جلسے میں یہ مضمون پروانہ ہال میں پڑھا تھا
اور انہوں نے اپنی غرض مندی کے پیچھے بات ختم ہونے سے پہلے ہی ایک ا... ...
مفہوم متعین کیا تھا۔ جو مخدوم اور شاذ کی شاعرانہ بڑائی کا ان کی دانست میں
ضامن تھا ــــ اور بزعم خود یہ بھول گئے تھے کہ اُن کے خود ساختہ طریقہ احتساب
سے اُن کی " اپنی عظمت سخن " روزنامہ سیاست سے اُن کی وابستگی کی بنیاد
پر ہندو پاک میں کس مقام پر رکھی جا سکتی ہے۔

قصہ مختصر اُس وقت شاذ کا اضطراب دیکھا نہ جاتا تھا ــــ لیٹے
لیٹے کبھی ہاتھ ہاتھ میں دے دیتا۔ کبھی کھینچ لیتا ــــ اُٹھ بیٹھتا ــــ کہتا
لٹا دو مجھے ــــ لیٹ جاتا۔ دو چار اُکھڑے سیدھے سانس لیتا ــــ پھر بے تحاشہ
اُٹھ بیٹھنے کے لئے اپنے بچے کا سہارا لیتا ــــ اس کے باوجود تحمل سے
کام لے رہا تھا ــــ اتنا تحمل میں نے شاذ میں کب دیکھا ہو گا ــــ کچھ دیر
خاموش لیٹا رہا ــــ

اُس وقت پتا نہ تھا یہ غنودگی تھی یا سنبھالا ــــ
خاندان کی چند خواتین آئیں ــــ میں نے اجازت لی۔ میری طرف
جھک گیا ــــ میں بھی جھکا ــــ سرگوشی کی ــــ جلد آنا میرے متین بھائی۔
میں نے بیگم شاذ کو دیکھا اور پھر دیکھنے کی ہمت نہ کی ــــ نہ میں نے
سلام کیا نہ انھوں نے۔
سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔

اور میں سیڑھیوں کی ملٹی ریکریٹ کر سکنے لگا ۔ میرے برادرِ نسبتی فخر الدین نے جو
میرے ساتھ تھے مجھے سنبھالا ۔ میں نے نیچے اترتے اترتے اپنے آنسو خشک
کیئے ۔ ڈاکٹر منان اپنے کمرے میں بے شمار مریضوں میں گھرے ہوئے تھے ۔
راستہ بناتا ہوا میں ان تک پہنچ گیا ۔ جھک کر میں نے ان سے بھی جیسے سرگوشی
کی ۔ شاذ ؟

انھوں نے میرے ہاتھ کو جو میں نے پہلے ہی ان کے ہاتھ رکھ دیا تھا
اپنے دوسرے ہاتھ سے تھپک کر نفی میں
سر ہلا دیا ۔

میں چپ کے سے نکل آیا ۔ واپسی میں خیرات ندیم سے
ملنا بھی مشکل سا لگا ۔ جو پہلے ہی سے وہاں نیچے موجود تھے ۔
میں شاذ کے کمرے سے نکلتے ہی جان گیا تھا کہ منان کیا
کہیں گے ۔ میری علاتی ماں جو میری سگی امی کے برابر تھیں' نوبہار بوا'
پڑدس کے مولوی صاحب' جگر کے اس جان لیوا مرض کے شکار ہوئے
تھے ۔

۱۷ اگست کی رات میں پوچھ پاڑ نہ جا سکا ۔ ۱۸ تاریخ کو بھی اسی کام
کے سلسلے میں الجھا رہا ۔ رات سوا دس بجے کار ریڈیشن کروا کر سرِ شام تھکا
ہارا گھر لوٹا ۔ صوفے پر دراز تھا ۔ ذہانت علی بیگ سب ایڈیٹر سیاست
اور نیوز ریڈر اے آئی آر حیدرآباد ملنے آ گئے ۔ میرے پاس بیٹھے ہی تھے کہ
میں نے شاذ کی دن بھر کی کیفیت جاننی چاہی اور اپنی ملاقات کا ذکر کیا ۔

انھوں نے میری رُندھی ہوئی باتوں سے اندازہ کر لیا ہوگا اور شاذ کی موت ہی مجھ سے چھپا دی۔ نوید اقبال اور ذہانت علی بیگ نے شاید بعد میں طے کر لیا کہ مجھے نہ بتلانا ہی بہتر ہے ۔ چنانچہ نوید لمحہ بس ڈپو تک مجھے خدا حافظ کہنے کیلئے چلا تو میں نے اُسے تاکید کی ـــــ کل کسی طرح وقت نکال کر دواخانہ اسری ہو آئے اور شاذ کی خیریت معلوم کرے ـــــ نوید کو خاموش دیکھ کر جب میں نے مکرر اصرار کیا تو وہ جی ہاں جی ہاں ضرور ضرور کرتا رہا انھوں نے جو بات چھپائی تھی ۔ اخبار نے سب کچھ دوسرے دن بتلا دی ـــــ اردو اخبار پوچم پاڈ کو آدھا دن گذر جانے کے بعد آتے ہیں جب کہ تلگو اور انگریزی اخبار پو پھٹتے پر گھر گھر پہنچ جاتے ہیں ۔

میں چونکہ بہت بجھا بجھا سا تھا دفتر سے اُٹھ کر دوپہر کو اخبار فروش کی دوکان چلا گیا ـــــ شاذ کا چہرہ نہ ذہن سے محو ہوتا تھا نہ آنکھوں سے ہٹتا تھا ـــــ اخبار لیا تو اس میں بھی شاذ کی تصویر دیکھی ـــــ سرخی پڑھی اور اخبار ہاتھ میں تھام کر لوگوں کے درمیان سے کھسک گیا ۔

اب میں نگاہوں سے بچ بچ کر کونے کونے چھپتا سڑکیں ناپ رہا تھا ۔ کچھ دکھائی دیتا تھا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا ـــــ شاذ کبھی آگے آ کر راستہ روک لیتا ـــــ کبھی پیچھے سے پکارتا ـــــ متین بھائی ـــــ میرے متین بھائی ۔ میں نے اخبار میں مخدوم کی تصویر بھی ایک بار اسی طرح دیکھی تھی ۔ میں ایک دوست کبیر صاحب کے گھر مدعو تھا ـــــ خدا مغفرت کرے اب تو وہ بھی اللہ کو پیارے ہوئے ۔ ہاں تو مجھے ان کے گھر پہنچنے میں تاخیر ہوئی ـــــ میں راستے ہی میں تھا کہ اسے آئی ۔ آر نے مخدوم

کے انتقال کی خبر نشر کر دی تھی۔ میرے بہنوئی میر ظفر علی خاں نے جن کی کبیر صاحب سے بہت یاری تھی اُن سے کہہ سنکر انھیں ہموار کر لیا کہ اس انتقال کی خبر مجھے نہ دیں —— قربتوں کی یک جائی تھی —— مجھ پر اس سانحہ کا انکشاف ہو جاتا —— تو "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" کے مصداق ساری محفل پر اس کا اثر پڑنا ضروری تھا۔

آج سوچتا ہوں کیسے کیسے اتفاقات اپنی انہونی سے ربط باہمی پیدا کر لیتے ہیں —— ایک بالکل نجی واقعہ یا سانحہ حسن و حزن کا کس طرح نازک سا امتزاج ہو جاتا ہے۔ حیدرآباد نے مخدوم اور شاذ ہی کے نام سے ہند و پاک میں اپنی پہچان بنائی —— مخدوم میرے بھی مخدوم بھائی تھے۔ میں شاذ کا متین بھائی تھا۔

دونوں کی اموات سے حیدرآباد میں رہنے کے باوجود مجھے بے خبر رہنا پڑا۔ شاذ نے مخدوم پر ڈاکٹریٹ کے لئے درخواست دی اور مجھے بتایا تو میں بہت خوش ہوا تھا —— راج کا خط ملا کہ مخدوم سوسائٹی شاذ کا جنم دن منا رہی ہے تو مجھے بڑا سکون ہوا۔

—— راج نے بہ اصرار لکھا تھا کہ میں اس موقع پر شاذ پر مضمون پڑھوں —— میں نے راج کے خط کا جواب تک نہیں دیا۔ اس پر بھی اس نے محبتوں کی لاج رکھی —— سالگرہ کا دعوت نامہ بھجوایا۔ شاذ کی بہت پیاری سی تصویر سالگرہ نامے پر دیکھی —— کس طرح پہنچ جاؤں۔ کیا کروں۔ جی میں ہے پر لگا کر اڑ دوں —— لیکن جگہ جگہ سے کٹے ہوئے پر کس طرح اڑنے دیں گے مجھے —— ۳۱ جنوری ۸۷ کو شاذ کی برسی ہے۔ ۳۱ اکتوبر کو

تنخواہ کا دن ہے ۔ ۳۱/ کو مجھے وظیفے پر ہٹنے کے لئے ۲۸ دن رہ جائیں گے ۔
ایک دن بھی رخصت کا حق نہیں ہے ـــــ رخصت لیتا ہوں تو یومیہ تقریباً
نوّے روپے کا نقصان ہوتا ہے ـــــ اس نوکری نے زندگی کا سارا حسن چھین لیا۔
سفید کاغذ سے میرے قلم کی رفاقت چھین لی ـــــ مجھے کیا دیا ـــــ نہ در و
دیوار نہ گھر بار ـــــ مخدوم کو بھی یہی دیا ۔ شاذ کو بھی یہی ۔ پھر مجھے اور کیا چاہیئے
اگر یہی محرومیاں مقدر بنتی ہیں تو ان کو سہہ جانے میں لذت بھی تو ہے ۔ اب وظیفے
پر ہٹ جاؤں گا تو اپنے پیاروں سے ملوں گا ـــــ ان میں جو بھی ہیں ـــــ جو نہیں
ہیں ان کی نشانیاں تو ہیں ۔ ان کی کتابیں گھر میں ہیں تو باہر ان کی آرام گاہیں ـــــ
بیگم شاذ نے اپنے شاذ کی سنا ہے بہت اچھی سی قبر بنوائی ہے ـــــ کمیونسٹ
پارٹی نے اپنے محبوب شاعر مخدوم کی بہت اچھی سی قبر بنوائی تھی ـــــ میں تو اپنے
نشو اور ییتن کی قبریں تک نہ بنوا سکا ـــــ بس مٹی کے تودے آج تک اصفیا باغ
میں پڑے ہیں اور اب میرے سینے میں اٹھ آئے ہیں ـــــ سب بنوالوں گا ـــــ
بگڑی بنانے والا حیرت ہوتی ہے جب بیٹوں کی قبریں بنوانے کا کام ان کے باپ
کو سونپ دیتا ہے ـــــ میرے قیصر[۱۳] نے بھی تو اپنے آنسوؤں سے کہیں مٹی گوندھی
ہے ـــــ اب تو عمران[۱۴] بھی فیروز[۱۵] اور نشو[۱۶] اور ییتن[۱۷] کے ساتھ جانے کہاں کہاں
بھٹکتا ہے ۔ یہ اضافہ بہت بعد کا ہے ـــــ شاذ نہیں تھا تو اس کا چہیتا
عمران اپنے آرٹسٹ باپ کا آتا پتا کبھی اسے دیتا تھا۔ آج وہ بھی نہیں ہے ۔
میری غزل چھپی تو میں نے یہ غزل قیصر سے چھپالی تھی صرف اس لئے کہ اس غزل کا
ایک شعر یوں بھی تھا ۔ ـــــ

غریدہ و نشو و پیتن کے ساتھ ہے عمران
پتا تو دے گئے ہوتے جہاں کہیں ہیں اب
اس پٹر پوہنی زندگی کے دیکھتا ہوں کیسے کیسے مٹے مٹے سے روپ رہیں - میں تو سوائے نیرق کے اپنے نشو اور پیتن کی قبریں تک نہ بنوا سکا۔ تب بھی میرے اللہ میاں کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا - میں خود بھی تو نہیں چاہتا کہ فرق آئے - دیکھئے پھر اوٹ پٹانگ لکھنے لگا ہوں - واہی ہو گیا ہوں - جذبہ جب بے مہار ہوتا ہے تو شاید گستاخ ہو جاتا ہے۔ ہم ادچھے لوگ اپنے ضبط کی تہذیب نہیں کرتے - وہ ہنرمند اور ہوتے ہیں جو غم کی ستم کوشی کو نشاط کی صورت حرزِ جاں بنا لیتے ہیں - ایسے ہی ہنرمندوں میں شاذ بھی نمایاں تھا -

ہم شاذ سے سیکھیں گے زخموں کی چمن بندی
کچھ دل کو لہو کرنا، کچھ پھول کھلا دینا

•

بنتی نہیں دل سے شاذ اپنی، یہ دوست ہے یا دشمن کوئی
ہم ہیں کہ مسلسل ہنستے ہیں، وہ ہے کہ مسلسل روتا ہے

•

اس نے باغ سے جاتے جاتے موسم گل بھی باندھ لیا
شاذ کو دیکھو دیوانے ہیں، بیٹھے ہار پروتے ہیں

•

طرب کی بزم میں کم کم فسردگی اے شاذ
کہیں مزاج کی افتاد ہی نہ بن جائے

•

اس رہزن کی طرح میرے تعاقب میں ہے شاذ
کیا خبر اس کو یہ ، بے بال و پری کیسی ہے

•

روح کے دشت میں اک ہو کا سماں ہے اے شاذ
دے گیا کون بھرے شہر میں بن باس مجھے

•

دشتِ غربت اگر سہارا دے
بخدا شاذ سر کے بل جاؤں

•

شاذ اب کونسی تحریر کو تقدیر کہوں
کوئی لکھتا ہے مجھے کوئی مٹاتا ہے مجھے

•

تمام غم ہوں مجھے شاذ سہل مت جانو
گئی اک عمر مری ضبط کے قرینے میں۔

•

سانس سے زخم کا ٹانکا نہ کھلے
شاذ ہم نے یہ ہنر جانا ہے

٭

جگر[1] -	جگر مراد آبادی
منٹو[2] -	سعادت حسن منٹو
مجاز[3] -	اسرار الحق مجاز
جوش[4]	جوش ملیح آبادی
فواد تمکنت[5]	شاذ کا چھوٹا بیٹا
شاہد صدیقی[6]	اب حیدرآباد ہی کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ غزل میں ان کا لب و لہجہ منفرد تھا۔ اس پر اپنی بزلہ سنجی اور حاضر دماغی کے وصف سے حیدرآباد میں بہت مقبول رہے۔ مشاعروں کے روح رواں تھے۔
ابن احمد تاب[7]	حیدرآباد کے مقبول شاعر، ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں بھی انھیں مدعو کیا جاتا تھا۔ اچھا مشاعرہ پڑھتے۔
سلیمان ادیب[8]	حیدرآباد کا ایک منفرد شاعر جس نے نظم اور غزل دونوں ہی اصناف سے انصاف کیا۔ ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔

معروف رسالہ صبا کے مدیر۔ اپنے وقت
پر ادبی انجمن اور بزم یاراں کے روح رواں۔

نوید اقبال ۱۱
میرا دوسرا بیٹا ان دنوں مارکٹنگ منیجر
میڈیا ان ہوا۔

MEDINOVA (Diagnostic
services) HYD.

میر ظفر علی خاں ۱۲
آئی اے ایس۔ وظیفہ یاب کمشنر۔ بنگلور

قیصر ۱۳
مشہور آرٹسٹ قیصر سرمست۔ میرے
چچا حضرت تمکین سرمست کا چھوٹا بیٹا
کئی معلوماتی کتابوں کا مصنف مولف۔

عمران ۱۴
قیصر سرمست کا بڑا بیٹا بھری جوانی میں
اللہ کو پیارا ہوا۔

فیروز ۱۵
فرید اقبال میرا سب سے بڑا بیٹا ۱۲ سال
کی عمر میں ہنستا کھیلتا مجھ سے جدا ہوا۔

نشو ۱۶
نشید اقبال میرا تیسرا خوبصورت بیٹا جس کی محبتوں
کے لٹ جانے کے بعد بھی میں آج زندہ ہوں ۔ سترہ سال
کی عمر موت کی آغوش کے لئے منتخب کرلی۔ میں یہ درد
صرف دیکھتا رہا۔

پپلن ۱۷
معید اقبال میرا چوتھا گڈا جیسا بیٹا۔ گیارہواں
سال کھیل کود کے لئے نہیں تھا شاید آخری سانس
لے رہا۔ سب ہنستے کھیلتے جدا ہوئے۔

اقبال متین

ڈاکٹر سیّد عبدالمنّان

(چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ)

آمد : یکم مئی ۱۹۱۶ء

یہ باتیں ۱۹۳۰ء کی ہیں۔ میں نے منان بھائی کو پہلی بار اپنی چھوپی اماں کے ساتھ دیکھا تھا۔ غالباً میٹرک کا بگڑا ہوا طالب علم تھا۔ میں اور لطیف ساجد اسکول سے بھاگ کر آصفیہ لائبریری میں جو ان دنوں اسٹیٹ لائبریری ہے دن گزارتے تھے۔ جانے کیا افتاد پڑی تھی۔ کچھ ہو گیا ہوگا۔ اسکول میں میری حاضری کم پڑ گئی ہوگی۔ پھوپھی اماں نے یہ کہہ کر میرے تردد کو دور کیا کہ ایم منان بی بی کے دہا سے تمہارے لئے طبی صداقت نامہ لے لیتے ہیں۔ اس طرح پہلی ملاقات میں ڈاکٹر منان سے میں نے اپنی کسی بیماری کا علاج نہیں کروایا۔ اس لئے کہ مجھے کوئی بیماری اگر تھی تو ان دنوں اس کا نام جوانی تھا جو سنتا ہوں دیوانی ہوتی تھی مجھے اس دیوانی نے ایک ایسی لڑکی کے سپرد کیا تھا جس نے شعور کی گتھیاں جہاں کا نام میرے سپرد کر دیا اور خود بڑے اطمینان سے پھوپھی اماں کے گھر بیٹھی رہی۔ اب اس بیماری کا علاج نہ منان بھائی کے پاس تھا اور نہ ہی پھوپھی اماں اس مرض کے [illegible] کے لئے مجھے منان بھائی سے رجوع کر سکتی تھیں۔ چنانچہ صاف ہمارے

بھائی کے سامنے میرے اسکول کے اوصاف حمیدہ رکھتے پڑے۔ میں خجل ہوتا رہا اور منان بھائی نے کچھ کہے بغیر جیب کے سے ایک پیاری مجھے عنایت کردی جس کو میں نے جیب میں محفوظ کرلیا اور اسکول میں میرا کام بن گیا۔

اس پہلی ملاقات میں میری آنکھوں نے دیکھا تھا کہ منان بھائی کے دیوان خانہ میں ایک معمولی سی لکڑی کی کرسی دھری تھی جس کا کشن CUSHION بھی اگر اس کو کشن کہا جاسکے تو لکڑی کا ہی تھا۔ اس سے لگی ایسی ہی میز اور اس کی دوسری جانب ایسی ہی ایک اور کرسی۔

عزا خانہ زہرا سے ذرا آگے سڑک کی دائیں جانب، گلی میں ایک چھوٹا مکان تھا اور اس چھوٹے سے مکان میں ایک دراز قد چھریرے بدن کا دل موہ لینے والا ڈاکٹر اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ میرے منان بھائی تھے جو صرف میری ممتاز آپا کے ساتھ رہتے تھے۔ ویسے ڈاکٹر منان آج بھی میرے ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اب ایک عالم ان کے ساتھ ہے اور اب یہ میرے نہیں ہمارے ہوگئے ہیں۔ جس کو دیکھو وہی دعوے دار ہے کہ منان اُن کے ہیں۔ آج بھی یہ ممتاز آپا کے ساتھ ہی رہتے ہیں لیکن خلقت خدا ان کے ساتھ رہتی ہے۔

ان دنوں میں عمر کی اس منزل میں تھا جہاں ٹوٹتی ہوئی معصومیت، شعور کے اوبڑ کھابڑ راستے بہرحال قدموں تلے بچھاتی ہے۔ کچھ سوجھے نہ سوجھے میں بھیگتی ہیں تو ذہن نچلا نہیں بیٹھتا ... لگتا ہے زندگی کا بہت کچھ بھیگ رہا۔ میرے دل میں منان بھائی کا گھر دیکھ کر طبی سرٹیفکیٹ پا لینے کے بعد بھی الجھن

تھی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر ہوجانا معمولی بات نہیں تھی اور ڈاکٹر ہوکر ایسی ازدواجی زندگی گزارنا اور غیر معمولی بات تھی کہ شادی کی بارات تو گزر گئی لیکن اپنے اجالے گھر کے کسی گوشے میں نہیں چھوڑے۔ میں اتنا تو جانتا تھا کہ ممتاز آپا جس گھرانے سے منان بھائی کے گھر آئی تھیں اس کے متعلق کی میرے بزرگ قسم کھا سکتے تھے پھر اس معمولی سی لکڑی کی کرسی اور خالتو سی میز پر شاعری کرنے والا جس کو میری پھوپھی اماں نے دلہا کہا تھا یا تو ڈاکٹر نہیں ہوسکتا یا دلہا نہیں لیکن میرے منان بھائی خیر سے ان دونوں خواص سے متصف تھے۔ ممتاز آپا میری تایا زاد بہن ہیں۔ حیدرآباد کے جاگیردارانہ سماج میں معاشرہ جس اڑن کھٹولے پر اڑتا تھا وہاں چھوٹے موٹے دلہا دلہن بھی اس کسر جہیز کی سوغات کو اپنے گھر کی زینت نہیں بنا سکتے تھے اور منان بھائی کی شادی خانہ آبادی ہوئے سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں ہوا تھا ایسے میں وہ سارا فرنیچر کیا ہو گیا جو منان بھائی کا گھر سجانے ممتاز آپا اپنے ساتھ لے آئی تھیں؟ لیکن میں اپنی اس ذہنی الجھن کو کس سے رجوع کر سکتا تھا۔ پھوپھی اماں سے ایسی بات نہیں پوچھی جا سکتی تھی۔ اپنے مستقبل کا پاس و لحاظ تھا مجھے کہ کہیں وہ کچھ اور مطلب نہ نکال لیں، کیوں کہ میں نے اور میری پھوپھی زاد بہن منیرہ نے غیر شعوری طور پر مستقبل کے عہد و پیماں لفظ و تکلم کی اعانت کے بغیر کچھ اس طرح کر رکھے تھے جن کی آنکھوں کے سوا کوئی زبان نہیں تھی۔

میں ٹوہ میں تھا۔ میرے خاندان کے کسی بزرگ نے آخرش مجھے بتلایا کہ اس سرپھرے انا پسند دلہا کے پندار نے جہیز کے نام سے فرنیچر قبول ہی نہیں کیا۔ مجھے پہلے ہی کمیونسٹ لٹریچر نے معاشرے کی معاشی نابرابری کے احساس نے کبیدہ خاطر بنا رکھا تھا،

ایسے میں منان بھائی کی منزلت، دل ہی دل میں میرے نزدیک اور بڑھ گئی۔ میں نے بھی اپنی پھوپھی اماں کو اپنی شادی میں کچھ نہ دے کر منان بھائی کے عطا کیے ہوئے پہلے طبی صداقت نامے کا معاوضہ کچھ اس طرح انہیں پیش کیا کہ نہ کبھی کچھ خبر ہوئی نہ پھوپھی اماں کو تو دیکھیے کیسے چھوٹے چھوٹے واقعات ذہن کی تربیت میں کیسے افق اجاگر کر جاتے ہیں۔

اس طرح منان بھائی نے میری عادتیں خراب کیں۔ ۱۹۷۸ء کے اواخر میں حیدر آباد چھوڑنے تک میرے محکمے کی آدھی نوکری میں نے کی اور آدھی ملازمت ڈاکٹر منان نے سرانجام دی۔ میں نے ہر قسم کی رخصت حاصل کی۔ بھلا کوئی ملازم سرکار ایک دن کی رخصتِ خاص بھی اس آسانی سے "لگا دیتا" ہے؟ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ عہدہ دار تنگ تھے۔ کارنامہ ملازمت، نامۂ اعمال سے کم سیاہ نہ تھا اور اس سیاہی کے پوتنے میں منان بھائی ہاتھ بٹائے جاتے تھے۔ مجھے بیمار پڑنے کی ضرورت ہوئی کہ میں اپنی صحت کے ساتھ ان کی طرف لپکتا۔ منان بھائی مڈیکل سرٹیفکٹ چاہیے۔ منان قلم اٹھانے کے بہانے ہاتھ بڑھا کر قلم کے ساتھ کسی بیماری کو بھی دبوچ لیتے جو سامنے ہی میز پر دست بستہ پڑی ملتی اور اس بیماری سے مجھے نواز دیتے۔ عطا کردہ صداقت نامہ میری جیب میں ہوتا۔ عہدہ داروں پر ڈاکٹر کے نام اور ڈگریوں کی دھونس جم جاتی اور میرا کام بہرحال بن جاتا۔

آپ نے کہیں ایسا مسیحا دیکھا ہے جو جب چاہتا ہے بیماری چھین لیتا ہے اور جب چاہو بیماری سے نواز دیتا ہے۔ منان واقعی قلم کے دھنی ہیں، اور دل

کے غنی بھی۔ جو بیماری چاہو دے جاؤ اور جو بیماری چاہے ہو جاؤ۔ اس طرح انہوں نے اپنی میز پر میرے محکمے کی آدھی ملازمت میرے بجائے کی اور وقتاً فوقتاً نئی نئی بیماریوں سے مجھے نوازا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ نے ان کی صرف مسیحائی دیکھی ہوگی۔ یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ دوسروں کا دکھ درد بٹورنے کے لئے اپنے اجلاس پر دوسروں کا دفتری کام بھی انجام دیا کرتے ہیں۔

منان بھائی کی شخصیت بھی بڑی چھ مکھا شخصیت ہے بلکہ وہ ایک مثمن ہیرا ہیں۔ ان کی شخصیت کا احاطہ کرنے کے لئے ان پر آٹھوں گھونٹ وار کرنے پڑیں گے۔ یہ مثمن ہیرا ہر نظر کو خیرہ کئے ہوئے ہے کیا اپنا کیا پرایا، سب کے سب گھائل بھی ہیں، قائل بھی، میں ایک راز کی بات بتاؤں — اور منان بھائی سے اجازت لئے بغیر بتاؤں۔؟ میں ایک بار ان کی کلینک کے ایک گوشے میں کھڑا تھا۔ ایک بے پردہ خاتون، برقع پوش خاتون سے کہہ رہی تھیں۔

"یہ عجیب ڈاکٹر ہیں ان سے علاج کرواتے ہوئے بیمار رہنے کو جی چاہتا۔ برقع پوش خاتون نے کہا ... اسی لئے تو کہتی ہوں، پردے کی بڑی فضیلت ہے۔ مجھے دیکھو برقع نے لاج رکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو پتہ ہی نہیں کہ میں کب سے ان کی بیمار ہوں۔"

دروغ بر گردنِ راقم، ویسے راوی اور راقم میں انیس بیس کا فرق ہے۔ رے الف، زبر دونوں میں مشترک ہے جیسے دونوں خواتین کے درمیان آنکھوں کا پردہ اور برقع کا پردہ دونوں مشترک ہیں۔

آپ کو ایک راز دار بتانا ہی ٹھہرا تو پھر ایک اور راز کی بات سنا دوں۔

مسز منان یعنی اپنی ممتاز آپا سے اجازت لئے بغیر ایک بار میں منان بھائی کے گھر میں بیٹھا آپا سے باتیں کر رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ آپا نے اٹھ کر ریسور اٹھایا۔ بغور سنتی رہیں۔ پھر بڑی سادگی اور دھیرج سے کہنے لگیں :

" ابھی تو ڈاکٹر صاحب نہا دھو کر سیج دھج کر باہر گئے ہیں۔ ان کا موٹر بس گیٹ تک پہنچا ہوگا۔ قریب ہوتا تو روک کر آپ سے بات کرواتی۔ مجھے آپ کا نام تو نہیں بتایا۔ ہاں کہیں اور ناشتے ہی پر گئے ہیں، اتنا ضرور جانتی ہوں۔ کچھ بتا بھی رہے تھے ـــــ کوئی خانم یا بیگم کہا تھا۔ شائد لنچ تک آپ کے پاس بھی پہنچ جائیں۔ ریسور رکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

" جانتا ہے کس سے بات کر رہی تھی "

میں نے کہا، جی نہیں، نہیں جانتا، کوئی خاتون ضرور تھیں "

کہنے لگیں " بہت بے چین لگتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ناشتے پر بلایا تھا۔ جانے کیا کیا تیاری کی ہوگی بے چاری نے۔" میں جانتا تھا منان بھائی نے ہمارے ساتھ ہی ناشتہ کیا تھا اور میں نے کیک کی بہت تعریف کی تھی۔ آپا کہنے لگیں :

" کیوں کیسا مذاق کیا ہے بے چاری منتظر ہوں گی اور خفا بھی کہ ناشتہ مجھ کو چھوڑ کر کس کے ساتھ کر لیا۔" آپا بڑے اعتماد سے ہنستی رہیں اور میں ان کے اعتماد پر ہنستا رہا۔

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے

منان بڑے آدمی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر بڑا آدمی اتنا ہی پیارا بھی ہو جتنے منان ہیں۔ ان کی شخصیت کی طرح داری، ان کے لہجے کی گھلاوٹ، ان کی بات چیت

کی نرم نرم سپردگی۔ تکلم کی بے ساختگی میں مزاح کی چاشنی۔ جو بھی ان سے ملتا ہے انہیں کا ہو رہتا ہے۔ بھری محفل سے آدمی کو چرا لیں گے اور اس سرقے میں سب سے زیادہ دخل ان کی انسان دوستی کو رہے گا جو ان کی فطرت ہے، ان کا مزاج ہے۔

آدمی کو اس کے جی جان سمیت چرا لینے کا فن منان بھائی کا بہت پرانا فن ہے۔ اس لوٹ لینے کے ہنر میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ امیر و غریب مرد و زن، شاہ و گدا سب یکساں ہیں۔ آپ ان کے اس وصف کا اندازہ اس واقعے سے لگا سکتے ہیں۔ اس بات میں زیب داستاں کے لئے مبالغہ اگر کہیں ہو سکتا ہے تو صرف اس حد تک ہے کہ مبالغے کی کہیں گنجائش ہی نہیں۔ کاش وہ بھیگی ہوئی آنکھیں آج بھی اس تحریر کو پڑھنے کے لئے کھلی رہتیں۔

۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر منان اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر نظام سرکار کی جانب سے ڈیپوٹیشن پر جب انگلستان جا رہے تھے تو انہیں دنوں پرنس اعظم جاہ نے بھی تفریحاً انگلستان کا قصد کیا۔

شاہزادۂ وقت جو شاہ دکن کے بعد تخت و تاج کا وارث ہونے والا تھا جس کی تیوری کے بل سے باشندگان شہر و سلطنت کے مقدر وابستہ ہونے والے تھے۔ منان کی دل پذیر و سحر انگیز شخصیت کے آگے کتنا مجبور محض تھا، سوچتے جائیے تو سوچ کے راستے متعین ہو سکتے ہیں۔ زندگی ایک ایسے حرف کے جس کا اور چھور نہیں ملتا تازہ دیاریتہ اوراق نظروں کے آگے بکھیر بکھیر کے کبھی ہنساتی ہے، کبھی آنسو رلواتی ہے۔ ذہن بیدار تو کچھ ہاتھ لگ گیا، نہ ملا تو صرف ہاتھ کی لکیریں رہ گئیں جو ہر ایک سے پڑھی نہیں جاتیں۔

تفریح ختم ہوئی، سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ پرنس اعظم جاہ اپنی حکومت، اپنی سلطنت، اپنے پایۂ تخت، اپنے شہر نگاراں کے سارے دل افروز دلکش تصورات کو سمیٹے اپنے وطن کو لوٹنے کے لئے اپنے احباب، متعلقین، لواحقین و مصاحبین کے ساتھ ایروڈرم پر آئے۔ جمگھٹ میں گھرا، ہنستا بولتا یہ شاہ زادہ پرواز کا وقت قریب ہو رہا تھا تو کہیں کھو جاتا۔ ہنستے ہنستے اسے سانپ سونگھ جاتا۔ شگفتگی چہرے پر بار نہ پاتی لیکن مصاحبین اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی دھڑی جمانے کا قرض ادا کرنے کے لئے ہی تو تھے۔ سو وہ کبھی کامیاب ہو جاتے۔ شاہ زادے کے چہرے کا تاثر بدل جاتا لیکن پھر وہی گمبھیرتا۔ ایروڈرم پر خدا حافظ کہنے والوں میں منان بھی تھے۔ ہوائی جہاز کی پرواز کا وقت بہت قریب ہو گیا تو اعظم جاہ منان کی طرف بڑھے منان کے پیچھے بیرسٹر عطا الرحمن بھی تھے جنھوں نے یہ منظر نہ صرف دیکھا تھا اس کی یادیں میں شامل ہو گئے تھے۔ پرنس نے منان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ کہا "تم میرے ساتھ واپس چلو۔ میں تمہارے لئے وہاں کوئی کمی نہیں رکھوں گا۔ تمہیں تعلیم کے لئے پھر وسی اہتمام سے بھجوا بھی دوں گا۔ لیکن اس وقت تو چلے چلو تم۔" منان نے بہت دل جوئی کی۔ پچکار کر سمجھایا کہ میں جلد ہی تعلیم ختم کر کے آجاؤں گا۔ پرنس نے سب سن کر منان کی طرف نظریں اٹھائیں تو ان کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ پرنس نے صرف اتنا کہا کہ:

"منان کیا میں تمہیں چھوڑ کر رہ سکوں گا" اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ منان کا گلا رندھ گیا۔ "جی میں بہت جلد تعلیم مکمل کر لوں گا بہت جلد آجاؤں گا۔"

پرنس نے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا" تو کیا تم مجھے چھوڑ کر رہ سکو گے؟" پرواز کا اعلان ہوا۔ اور منان بادیدۂ نم شاہ زادے کو رومال سے آنکھیں پونچھتا ہوا دیکھتے رہے۔

پھر نہ وہ شاہی رہی نہ پاس داریاں، وہ شان وشکوہ نہ دل داریاں۔ وہ آپا دھاپی وہ افراتفری مچی کہ ہر دستارِ فضیلت فرازِ سر کے لئے ترس ترس گئی۔ منان کی دوررس نگاہیں پہلے ہی سب دیکھ چکی تھیں۔ وہ والاشان اعظم جاہ کے ساتھ جذباتی رفاقتیں نبھانے میں اس وقت محتاط نہ ہو جاتے تو آج ان کا اپنا مستقبل بھی ان کی زندگی کا احتساب شاید وہاں تک کرتا جہاں تک آج منان کی شخصیت کی رسائی ہوئی ہے۔

منان کی اس ہر دل عزیزی سے تو آپ سب ہی واقف ہیں۔ ان کی اس معصومیت سے کتنے لوگ واقف ہوں گے مجھے نہیں معلوم جب مجھے قلب کا عارضہ ہوا اور یہ احساس ہوا کہ میں بھی صاحبِ دل ہوں تو میں نے ضرورتاً اپنے قلب کی حفاظت کے لئے منان بھائی سے کچھ جھجک کر کچھ تامل کر کے آخر پوچھ ہی لیا۔

" کیا میں مہینے میں آٹھ دس بار ڈیڑھ دو پیگ وہسکی پی سکتا ہوں؟" کچھ سوچ کر پوچھا۔ " متین بھائی پیگ کتنے اونس کا ہوتا ہے؟" میں دم بخود رہ گیا۔ ان کے سامنے سر بھی نہیں پیٹ سکتا تھا۔ دل پیٹ لینا بس میں نہیں تھا۔ سوچتا رہا کہ اس شخص نے مغربی ممالک میں تعلیم پائی وہیں برسوں گزارے کیا اپنی "گرل فرینڈس" کو پیگ (PEG) کی بجائے اونس (OUNCE) پیش کرتا رہا ہوگا اور پھر منان بھائی تو نظام سرکار کی فوج میں ڈاکٹر تھے۔ کیا نظام

کی ساری فوج (PEG) کی بجائے اونس میں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی ہوگی ایسی پاکیزہ معصومیت پر پیار بھی آتا ہے ترس بھی آتا ہے۔

منان فارسی فرفر بولتے ہیں بقول کسے (نام نہیں بتاؤں گا) منہ زبانی فارسی بولتے ہیں لیکن نہ خمینی کی جمہوریت کی عشوہ طرازی معلوم نہ ظرف قدح خوار کا اندازہ نہ پیر مغاں سے نسبت نہ مغبچے سے آشنائی۔ فارسی بولنا جانتے ہیں فارسی برتنا نہیں آتا۔ جرعہ" بنت عنب، کڑوی دوا کی خوراک ہوئی احمد فراز کا یہ شعر اک ذرا تصرف کے ساتھ منان بھائی کی نذر کروں۔

یہ میں بھی کیا ہوں، اُسے جان کر اسی کا رہا
کہ جس کے ساتھ نہ تھا، ہم سفر اسی کا رہا

لیکن اسی فارسی دانی نے، انہیں بہ انداز گر نہال کرنا چاہا تھا سو وہ بھی منان قبول نہ کر سکے۔ "زبان یارِ من ترکی" والی بات نہیں تھی۔ مریض یارِ من فارسی والی بات تھی۔ منان ساری نعمتوں سے منہ موڑ کر چلے آئے۔ یہ واقعہ ۱۹۵۱ء کا ہے پیرس کے مشہور دواخانے ہوٹل ڈیو (HOTEL DUE) میں منان دوسرے ساتھی ڈاکٹروں کے ساتھ گھوم پھر رہے تھے کہ ایک نرس دوڑی دوڑی آئی اور ایک کینیڈین ڈاکٹر سے کہنے لگی۔ میں بہت پریشان ہوں مدد کیجئے۔ اس نرس نے تفصیل یوں بتائی کہ دواخانے میں چند روز قبل ایک عجیب سی نئی زبان بولنے والا نوجوان داخل ہوا ہے۔ نہ میری زبان وہ جانتا ہے نہ اس کی ایک مجھے سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے علاج میں مجھے بہت دقت ہو رہی ہے۔ ذہنی الجھن کا الگ شکار ہو رہی ہوں۔

کینیڈین ڈاکٹر انگریزی جانتا تھا۔ منان کو سب کچھ بتایا تو منان اللہ کے اور نرس کے ساتھ بیمار سے ملنے گئے۔ مجھے صحیح طور پہ نہیں معلوم کہ منان بھائی کو ہمدردی مریض سے تھی یا معالج سے، بیمار سے ملے تو معلوم ہوا کہ یہ گورا چٹا جوان ایرانی ہے۔ منان بھائی نے دلچسپی سے حال احوال پوچھا۔ فارسی زبان یوں بھی منہ میں قند و نبات گھلاتی ہے نوجوان کے دکھ درد کو منان بھائی نے زبان و لہجے کے مرہم سے کچھ اس طرح بھگویا کہ وہ محسوس کرنے لگا جیسے وہ تیزی سے شفایاب ہو رہا ہے۔ اب اس نوجوان کو اس بات کی فکر لاحق ہوئی ڈاکٹر منان کی مسیحا صفت شخصیت کو کچھ اس طرح اپنا لیا جائے کہ اس کے مکمل علاج تک منان کی توجہ کا مرکز بنا رہے۔ اس نے بتلایا کہ وہ بہت متمول گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ پیٹ کے درد سے تنگ آگیا ہے۔ اس دواخانے کی بہت تعریف سنی تو عاجز آکر کسی سے کچھ کہے سنے بغیر یہاں آگیا۔

منان اس کی کیفیت فارسی میں پوچھتے جاتے، انگریزی میں کینیڈین ڈاکٹر کو سمجھاتے اور وہ فرانسیسی میں نرس کو کیفیت لکھواتا۔ تقریباً ایک گھنٹہ ایرانی نوجوان پر ڈاکٹر نے توجہ دی تو اس کو ڈاکٹر منان سے نہ صرف امید بندھ گئی بلکہ اس غریب الوطنی میں اس احساس نے دل کو تقویت دی کہ یہاں بھی اس کا کوئی ہے۔ لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ منان جلد ہی اپنے وطن لوٹنے والے ہیں تو وہ اداس ہو گیا۔ منان ایک بار اس سے ملنے گئے تو ڈاکٹر قاضی عبدالباری بھی ساتھ تھے۔ منان نے باری کو ملاتے ہوئے کہا کہ یہ بھی ڈاکٹری کی یہاں تعلیم مکمل کر چکے ہیں۔ میرے دوست بھی ہیں، ہم وطن بھی اور وہ روزانہ اپنے

وطن لوٹ جائیں گے تو نوجوان نے لجاجت سے روہنا ہو کر کہا میری خاطر ہفتہ عشرہ ٹھہر جایئے۔ میرے علاج میں مدد کیجیئے۔ میں خود کو بہت بہتر پا رہا ہوں میں پیرس کے اعلیٰ سے اعلیٰ ہوٹل میں آپ کے اور آپ کے دوست کے قیام و طعام کا انتظام کروا کے دلی خوشی محسوس کروں گا۔ اتنی خوشی کہ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ منان مجبور تھے۔ واپسی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ خود ان کو اور ڈاکٹر باری کو اس پیش کش کے قبول نہ کرنے کا قلق تھا۔ ڈاکٹر منان اس نوجوان کو دلاسا دے کر چلے آئے۔

دلاسا دینے میں منان کو شاید مہارت اس لئے حاصل ہے کہ وہ دلوں کے معالج ہیں۔ میرے معالج بھی تو وہی ہیں۔ بیماری کے آغاز سے آج تک کتنی صفائی سے پگ (PEG) کو اونس میں گھول کر رکھ دیا ورنہ ساقی گری کی شرم کرنی پڑتی۔ اس پر مستزاد یہ برخوردارانہ انداز تو دیکھیئے۔ "متین بھائی پگ کتنے اونس کا ہوتا ہے؟ جی جل کر رہ جاتا۔ ہوتا ہوگا پانچ اونس کا یا آدھے پاؤ اونس کا مگر یہ "متین بھائی" کیا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ منان عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ رشتے میں بھی بڑے ہیں۔ انسان تو وہ مجھ سے بڑے ہیں ہی۔ پھر یہ متین بھائی کیوں پھبتی میں بھی کیوں اخلاص کا مارا بنا رہوں۔ کب تک یہ ظلم برداشت کروں۔ اپنی عمر چھپانے کے لئے اپنے چھوٹوں سے ایسی برخوردارنہ جی ہاں۔ سن رکھیئے۔ منان مجھ سے عمر میں آٹھ سال سے زیادہ بڑے ہیں۔ لیکن میرے لئے صبر کے سوا کیا چارہ ہے۔ کون تسلیم کرے گا کہ میں منان سے عمر میں چھوٹا ہوں۔ لوگ ہنسیں گے۔ مرد تو صرف مسکرا کر رہ جائیں گے۔ بہت سی عورتیں

تو غصے میں مسکرا بھی نہ سکیں گی۔ انتقام لینے کا بھی وسیلہ نہیں بہت جی کرتا کرتا ہوں لیکن ہمت نہیں ہوتی کچھ رعب ہی ایسا گانٹھ رکھا ہے۔ منان بھائی نے ہر طرف جھنڈے گاڑ دیئے۔

یہ دوائیں، یہ ساری میڈیکل سائنس تو ان کے گھر کی داسیاں ہیں۔ ہم نے ادب کو اپنے لئے چن لیا تھا۔ عمر بھر قلم گھس کر ادب کے کھنڈروں کی ایک جھونپڑی اپنے لئے بنائی تھی۔ انہوں نے یہاں بھی محل کھڑا کر دیئے۔ ہر ادبی انجمن ان کی زنبیل میں ہر اصلاحی اور فلاحی ادارے کے وہ کرتا دھرتا ہر امدادی یا خیراتی درس گاہ کے وہ ان داتا۔ ساری نیکیاں بس اسی ایک نام کے ساتھ منسوب سارا علم و ہنر ان کا۔ ساری دانشوری اور باشعوری ان کی جب کوئی بت بن کر سامنے اس طرح کھڑا ہو جائے کہ ہر دیکھنے والے کی نظریں جھک جھک جائیں تو ہمارے لئے بھی پوجنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ دراصل کچھ اتھل پتھل مجھ ہی میں ہے۔ اتنے اچھے انسان مجھ سے سہے نہیں جاتے۔ ہر دل میں گھر کئے بیٹھے ہیں اچھی خاصی اجارہ داری ہے۔ ہمارا بھی تو کچھ ہو۔ آپ تو ہمارے سائے تک اٹھا لے جانے کے درپے ہیں۔ ہم ادھر بضد ہیں کہ اپنا پرتو بھی کچھ تو آپ پر پڑے اپنی پرچھائیاں بھی کہیں تو آپ کا راستہ روکیں۔ مجبوری سی مجبوری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عمر کی بات چھڑی ہے تو ہم جل گئے ہیں ورنہ منان اپنی عمر چھپانا چاہتے ہی نہیں بھلا انہیں ضرورت ہی کیا پڑی جب کہ ان کی عمر بڑھتی ہی بہت چھپ چھپ کر ہے۔ دراصل یہ بھی منان کی کسر نفسی ہے کہ انہوں نے مجھے ہمیشہ متین بھائی کہا اور صرف اس لئے کہا کہ ان کے آگے اپنی کسی بڑائی کا احساس

مجھے بھی ہو - ورنہ منان بھائی کی عمر کے پیمانے میں " 365 " دن کا ایک مہینہ ہوتا ہے - مجھے بڑی تمنا تھی کہ منان بھائی کے خلاف بھی کبھی، کہیں کچھ سنوں - ایک دن یہ تمنا پوری ہوتی نظر آئی - دل بیمار بلیوں اچھلنے لگا - ایک صاحب اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہے تھے - منان بھائی کے مجوزہ نسخے ہاتھ میں تھے خوبصورت سی بیوی - سجل سے میاں - اچھا سا بچہ میاں کی گود میں کیوں کہ بچہ میاں کی گود میں ہی اچھا لگتا ہے - بہت دل برداشتہ لگ رہے تھے - یہ بات تو واضح تھی کہ کوچہ منان کی خاک شفا سے ان کی پہلی پہلی شناسائی ہے اپنی مسز سے کہہ رہے تھے -

" بس نام ہی نام ہے - اونچی دوکان پھیکا پکوان والی بات لگ رہی ہے - کچھ دیکھا ہی نہیں - سنا ہی نہیں ببلو کی تو پھر آنکھیں دیکھیں، تمہاری تو آنکھیں بھی نہیں دیکھیں اور دونوں کے لئے دوائیں لکھ ماریں؟" جی چاہا اس نوجوان سے کہوں - " فکر نہ کرو منان جانتے ہیں کہ کون سی آنکھیں کہاں دیکھنی چاہئیں"۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا - اپنے صاحب سے ببلو کی ممی کہہ رہی تھیں " کچھ دن علاج کرکے دیکھ ہی لیتے ہیں - آخر فیس تو دے ہی دی ہے نا "

دراصل ڈاکٹر منان کو اپنی مسیحائی کا عرفان ہو چکا ہے اور اسی عرفانِ مسیحائی نے ان کی دوکان چلا رکھی ہے ورنہ ان صاحب کو تو ڈاکٹروں کے معمولی حربے بھی نہیں معلوم - لیکن دو ہی دن گزرے ہوں گے، وہی خوب صورت جوڑا اپنے بچے کے ساتھ منان بھائی کے کلینک میں خوش خوش بیٹھا اپنا نمبر لگنے کا انتظار کر رہا تھا - شاید اس اونچی دوکان کے پھیکے پکوان کا مزہ لگ گیا تھا اسے -

برنارڈ شا نے کہا تھا کہ ڈاکٹر قاتل ہوتے ہیں اور اسٹیتھسکوپ ان کے قتل

رنے کا ہتھیار - برنارڈ شا نے بہ ایں ریش و بروت شاید معقول ڈاکٹر دیکھے ہی نہیں
منان بھائی جیسا قلندر صفت ڈاکٹر مجھے نہیں ملا - ان کی یہ قلندری جوالی
مالی سے ان کے ساتھ ہے جب کہ پیشہ ورڈاکٹر داؤ لگ جائے تو پھر کوئی حربہ نہیں
چھوڑتا - ڈاکٹر منان پر ڈاکٹر بنکٹ چندر کی شفقتیں ان دنوں زباں زد تھیں -
ن دونوں کا دلوں کا تعلق سمجھ میں کبھی آتا تھا - لیکن منان، ڈاکٹر بہادر خاں
ے کبھی چہیتے تھے جبکہ سرجری سے منان کا تعلق مریض کے ہاتھوں اپنی جیب کٹوانے
ے زیادہ نہیں - اپنی جیب کٹوا لینے کے اوصاف میرے منان بھائی میں شروع سے
کئے جاتے ہیں -

اب دیکھئے نا - ۱۹۵۲ء کے اس واقعے کے آغاز و عواقب پر غور کیجئے ---
ڈاکٹر بہادر خاں نے جن کا نام سرجری کی کتابوں میں محفوظ ہو چکا ہے - منان کو اپنی
خوشی چھپائے بغیر کہلا بھیجا کہ فوری چلے آؤ کہ کنگ کوٹھی میں اعلیٰ حضرت حضور نظام
کے خاص فزیشین کی حیثیت سے تمہارے نام کا انتخاب ہو چکا ہے -

منان، جب ڈاکٹر بہادر خاں سے ملے تو انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص اپنے چہرے
کی بشاشت کہیں چھوڑ آیا ہے - ہونٹوں پر مسکراہٹ، نہ جگنوؤں کی چمک جیسی
حاضر جوابی - پوچھا، بات کیا ہے؟ منان نے کہا --- "جی --- میں کنگ کوٹھی کے
قابل نہیں ہوں -

بہادر خاں چوکنے والے نہیں تھے، کہا:
" صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کہ کنگ کوٹھی تمہارے قابل نہیں ہے -
ڈاکٹر منان سٹ پٹائے، خود کو سنبھالا --- کہا "تماوہ --- دستار ---

بگلوس ..... یہ سب کچھ مجھ سے ... کیا میرا نام کٹوایا نہیں جا سکتا۔
ڈاکٹر بہادر خاں نے مسکراہٹ دبا کر کہا اچھا جاؤ تم کام تو شروع کر دو۔ تم جو چاہو گے دیکھا جائے گا۔ ڈاکٹر منان ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۵ء تک شاہ کے خاص فزیشن رہے۔ روزانہ ایک گھنٹہ کنگ کوٹھی میں ڈیوٹی رہتی۔ دستار اور بگلوس دونوں کا لزوم رومی ٹوپی نے چھین لیا تھا ... حکیم مقصود جنگ اور حکیم برٹکمر یونانی طب کے یہ بڑے نام بھی اپنی اپنی دستارِ فضیلت سنبھالے منان کی رومی ٹوپی کے ساتھ تھے۔

منان بھائی کے عروج میں بھی یہی قلندری کی پہچان بنی رہی۔ شہر کے ان چوٹی کے ڈاکٹروں میں شامل ہیں جو انگلیوں پر گنے جاتے ہیں۔ لیکن آج تک نہ معائنہ کرنا آیا نہ مریض کو اس کی بیماری بتلانا۔ مریض ادھر ان کے ہاتھ لگا ادھر اس کا مرض گیا۔ یوں دوکان نہیں چلتی۔ پہلے معائنہ کرنا چاہیئے۔ مریض کو لٹانا چاہیئے۔ پھر بٹھانا چاہیئے۔ بٹھانے کے بعد انگلیوں سے اس کی پیٹھ ٹھونکنی چاہیئے .....
پیٹھ ٹھونکنے کے بعد ذرا اس طرح غور و خوض کرنا چاہیئے کہ ڈاکٹر کے اس عالمِ مراقبہ کو مریض بھی بغور دیکھے۔ پھر اس کو چت لٹا کر پیٹ پر سے قمیض کھسکا کر اپنے بائیں ہاتھ کی تین انگلیاں اس کے پیٹ کے کسی ناپسندیدہ حصے پر رکھ کر دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے اس کو بجانا چاہیئے اور آواز کو بغور سننا چاہیئے۔ خواہ کوئی آواز آئے کہ نہ آئے بغور سننے کی شرط لازم ہے۔ یہ عمل تین بار کرنا ضروری ہے اس کے بعد استھتسکوپ فوری سینے پر نہیں رکھنا چاہیئے کہ مریض کے بھی سینہ سپر ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جو ڈاکٹر اس عملِ معائنہ سے گریز کرتے ہیں ان کی

ہائی مسلم ہو بھی جائے تو ان کی مالی توانائی مشکوک رہتی ہے چوں کہ آپ ان کے
رہ ہلز کے مثالی خوش نما بنگلے میں جو کبھی فلم کی شوٹنگ تک کے لئے استعمال کیا جاتا
آج اردو شعر و ادب کی پرچھائیوں کو ناچتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں ۔ اب یہاں
ب کو قمقموں کی روشنی میں موم بتیوں کا گداز مل سکتا ہے یہاں کشنس CUSHIONS
صوفوں کی نرمی کو بستر شب ہجراں کی سلوٹوں کی صورت تصور میں دیکھ سکتے ہیں چنانچہ
ہے محترم منان بھائی سے بصد ادب التماس ہے کہ فن معاینہ کی طرف توجہ دیں ۔
بھی بہت وقت پڑا ہے ۔
منان کی ڈاکٹری کو تشخیص کے سارے بندھے ٹکے اصولوں سے بیر سا ہے ۔
کی مسیحائی چہرہ دیکھ کر کام کر جاتی ہے ۔ اگلے وقتوں میں ایک طبیب حاذق ہوا
تے تھے ۔ نام تھا حکیم " نابینا صاحب " صاحب گویا نام کا جز تھا ۔ نبض دیکھ کر
ی تو کیا سلسلہ حسب نسب بھی جان لیتے تھے ۔ ان دنوں بھی ایک ڈاکٹر ہے جو صرف
ے پر نظر ڈال کر بیماری تو کیا ذہن و دل کا سارا کرب پہچان لیتا ہے ۔ یقین ہے کہ
م نابینا صاحب کی طرح سنہ ۲۰۹۴ ء میں یعنی سو سال بعد لوگ منان بھائی کو
رم " بینا صاحب " کے نام سے یاد کریں گے ۔
آج عمر کی اس منزل میں بھی ڈاکٹر منان کی فعال شخصیت محنت سے جی چرانے
ں کے لئے ایک تازیانہ ہے ۔ ان کی اس فعالیت کا خمیر (اٹھان) محنت اور محبت کے
ال باہمی سے ہے ۔ یہی سبب ہے کہ آج بھی دوسروں کے دلوں میں ان کی چاہت
ام و احترام یک لخت رنگ ہو گئے ہیں ۔ ڈاکٹر سلطانہ نسرین نگ ہوم موتو عرمانصاحب
سے چلے آنے کی ایک بار زحمت کیجئے ۔ آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ڈاکٹر منان نے کس

کس طرح ڈاکٹر سلطان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ وہ کچھ اس طرح اپنے مرشدِ فن کے آگے بچھ جاتے ہیں کہ ڈاکٹر منان کی عظمت کا عکس ڈاکٹر سلطان کی نجابت میں صاف نظر آتا ہے۔

مجھے جب منان بھائی نے ڈاکٹر سلطان سے پہلی بار ملایا تھا تو میری حیثیت اہلِ غرض کی تھی۔ میں نے جب ان کا شکریہ ادا کیا تو انہوں نے جس انکسار سے منان بھائی کی توصیف میں اپنی بے بضاعتی کا اظہار کیا اور جو جملے ان کی زبان سے ادا ہوئے میرے دل پر نقش ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر سلطان اس نرسنگ ہوم کے مالک و مختار ہیں۔ مانتا ہوں کہ منان بھائی کی شخصیت کے عکس جمیل نے ڈاکٹر سلطان کے جمالِ طبع کو آراستہ کیا ہے۔ لیکن اعتراف کا یہ انداز کہ معترف خود کو پاؤں کی دھول بنالے ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے، بڑا ظرف چاہیئے۔ گویا ڈاکٹر سلطان نے میرے شکریہ کے جواب میں مجھے فیض احمد فیض کا یہ شعر یاد دلا کر تڑپا دیا۔

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک ذرا تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

منان بھائی کے اوصاف بیان کرنے سے زیادہ انہیں چھیڑنے میں مجھے لطف آتا ہے۔ ویسے وہ سامنے ہوں تو زبان میں لکنت آجاتی ہے اور یہی لکنت جب صریرِ خامہ بنتی ہے تو پھر خود مجھے لطف آنے لگتا ہے۔

ایک ایسی راز کی بات بتا تا چلوں جو کم از کم مجھے نہیں بتلانی چاہئیے۔ یہ ڈاکٹر میرے قبیلے کا بڑا دیوانہ ہے۔ اور یہ قبیلہ اپنی انا، اپنے پندار، اپنی اکڑفوں اور کھرد رے پن کے سبب پہچانا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ دیوانوں اور شاعروں کا قبیلہ ہے۔

اس قبیلے میں کوئی شخصیت چھوٹی پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ہر شخص دوسرے سے بڑا ہوتا ہے
ہر فرد دوسرے سے عظیم۔ اس عظمت کا کوئی اور چھور بھی نہیں ہے۔ کوئی پیمانہ یا آلہ
پیمائش بھی نہیں ہے۔ اس بڑائی کے لئے کسی سند کی بھی ضرورت نہیں ہے ... بخاری
اور خیاطی سے لے کر جراحی اور مسیحائی تک ہر چھوٹے بڑے علم و ہنر کا امتحان ہوتا
ہے۔ میرے قبیلے کا علم و ہنر یوں ہے کہ وہ تلمیذ رحمانی سے شدید سہی راست نسبت
خاص رکھتا ہے۔ اس لئے کوئی بندہ خدا اس کا امتحان لینے کا اہل نہیں ہے اور اسی لئے
وہ خود بھی اپنا امتحان نہیں لے سکتا۔ کائنات چوں کہ میرے قبیلے کی جیب و دامن میں
ہے اس لئے میرے قبیلے کا قد کائنات میں سما ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر منان اس کا علاج معالجہ
دوا دارو، اس قدر محبت اور منزلت سے بلکہ خشوع اور خضوع سے کرتے ہیں کہ میرے
قبیلے کی توقیر مسلم ہو جاتی ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ دیکھا آپ نے بس
یہی فرق نابینا حکیم اور بینا ڈاکٹر میں ہے۔ حکیم نابینا سب کچھ پہچان کر بھی قبیلہ نہیں
پہچان سکتے تھے اور آج ڈاکٹر بینا نہ صرف قبیلہ پہچان لیتے ہیں بلکہ ہر دکھ درد
کا رشتہ اس قبیلے سے جوڑ کر اس کا مداوا کرتے ہیں۔

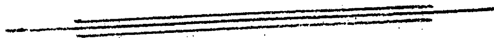
میں نے اب تک آنکھوں دیکھی اور من بیتی ہی سنائی ہے۔ آپ نے بھی تو کچھ دیکھا
ہی ہوگا۔ یہ تو ضرور دیکھا ہوگا کہ منان فیس اس طرح لیتے ہیں جیسے کسی معشوق کا خط
لے رہے ہوں۔ گھبرائے، گھبرائے، خجل خجل۔ بند مٹھی کا بھرم بند مٹھی سے رکھیں گے
ڈرائر میں اس طرح فیس ڈالی دیں گے کہ خود ان کی نظر بھی نہ پڑے۔ اردو شاعری
معشوق کی بے اعتنائی سے بھری پڑی ہے۔ لیکن ڈاکٹر منان کے اکثر مریض ان سے
اردو شاعری کا سا سلوک نہیں کرتے۔ بھلا ایسے پیارے آدمی کو کون شرمندہ کرے

بس اسی حساب سے ڈاکٹر منان کے ڈرائر میں فیس پہنچتی ہے۔ سینکڑوں مریض شہر میں میری طرح سفاک ہیں اور اسی شہر میں اگر کوئی عجیب انطرفین کے ساتھ ساتھ اجتماع ضدین بھی یکا را جاسکے تو وہ میرے منان بھائی ہی ہیں۔ فیس دے کر داس سے لگیں گے اور فیس نہ پا کر ایسے شاداں و فرحاں کہ چہرے کی کرنیں چھپائے نہیں چھپیں گی۔ اسی لئے تو جن دنوں ان کی مسیحائی کا طوطی بول رہا تھا۔ کرائے کے مکان میں جو سلیمہ خاتون کی مسجد کے سامنے حمایت نگر میں تھا، کیسے مطمئن اور مگن تھے وہ بس دو ہی قسم کے چھوٹے چھوٹے سفید بالوں بھرے کتے ہی ان کی امارت کی نشانی تھے۔ عمارت کی نشانی کچھ نہ تھی۔

میں جانتا ہوں کہ میری اور منان بھائی کی رفاقتوں کے سہارے خود میرے اپنے کتنے ہی ایسوں نے منان بھائی سے بھرپور استفادہ کیا جبکہ ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ان کے اپنے تصرف کے طور طریق بھی بڑے تصوف نما تھے۔ ممتاز! یا تو تم نے دیکھا ہو کہ نہ دیکھا ہو لیکن منان سے رشتہ استوار رکھا۔ سوچتا ہوں کوئی اور ہوتا تو کلینک کے نام سے اس کا اچھا خاصہ ہاسپٹل ہوتا۔ بینک بیالنس کے نام سے بینک ہوتا۔ لیکن میں جانتا ہوں ان کے پاس کیا ہے۔ کیا نہیں ہے وہ شخص جو دینا زیادہ جانتا ہو اور لینا کم اس کا حشر یہی ہوتا ہے۔ ویسے ان کی دولت مندی سے نہ مجھے انکار ہے نہ آپ کو ہوسکتا ہے۔ ان کی جائدادیں شہر بھر میں بکھری ہوئی ہیں۔ ہر اس دکھی دل میں جو منان سے وابستہ ہوا ہے منان موجود ہیں۔ کتنے ہی انسانوں کے دھڑکتے ہوئے دل منان کے چلتے پھرتے مکان ہیں اور ان مکانوں میں پناہ لینے دینے منان نے اپنا سکھ چین کھویا ہے۔ راتوں کی نیندیں تج دی ہیں۔ نم آنکھوں کے سمندر کھنگالے ہیں

تب کہیں جاکر انہیں یہ جائیدادیں ملی ہیں۔ یہ دولت جو انہوں نے کمائی ہے نہ کسی قارون کے پاس تھی نہ کسی برلا، ٹاٹا کے پاس ہے۔ ہمارے شہر کا یہ بے سرمایہ، سرمایہ دار، دولت مند کروڑ پتیوں میں بھی اپنا ایک امتیاز رکھتا ہے۔

کوئے جاناں میں بھی آتا تھا طرحدار فراز
لیکن اس شخص کی سج دھج ہے سردار جدا



اقبال متین

سنگِ مرمر کا گداز

حسن چشتی

آمد : ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۰ء

آج محبتیں مصلحت آشنا ہو گئی ہیں - چاہتوں کا کام بھی دل نے
نا کو سونپ رکھا ہے - آنکھیں اشکوں کا کاروبار بھول گئی ہیں - تنفس زلف دوتا
خوشبو سے اس درجہ نا آشنا ہو گیا ہے کہ ملیں (MILLS) دور ہوں تو
بسا' لاریوں، موٹر کاروں کا کالا گاڑھا دھواں نتھنوں کے راستے سینے میں اتار دیتا
اخلاص نما ریاکاری آدمی کے روپ میں پرچھائیوں کی طرح ملنے بچھڑنے والے ہر
نس کا مزاج بن گئی ہے - شخص مل بھی جاتا ہے تو شخصیت نہیں ملتی - آدمی کو
یت سے سروکار نہیں ہے - میرا عہد بے شجر تپتی زمین پر ہانپتا رہتا ہے اس
یں معلوم کہ بادل برسنے کیلئے نہیں - امڈ امڈ کر چھلنے اور چھٹ جانے کیلئے
بس ہیں - ہم پیاسی آنکھوں سے خالی کٹوروں کو دیکھتے رہنے کے اس حد تک
ہو گئے ہیں کہ سوکھے ہونٹوں کی پیڑیاں اپنے ہی تھوک کی نمی کو ترستی ہیں۔

لیکن وہ آج بھی، اس زمانے میں بھی، ان پرچھائیوں میں بھی، ایسے ایسے سناٹوں میں بھی، اسی طرح ملتا ہے جس طرح کبھی ملا تھا۔ اس کا نام ہے حسن چشتی ــــ قریب آ کر نچھاور ہونے والا۔ دور جا کر یادوں کی چادریں تان لینے والا۔ اور پھر غریب الوطنی کی اچٹتی اچٹتی نیند کو اپنے وطن کے خوابوں میں ڈھونڈ، ڈھونڈ کر جاگنے والا اور جاگ جاگ کر پلکیں بچھانے والا۔ دیکھئے کس طرح میرا دوست ہو گیا۔

یہ شخص عجیب شخص ہے۔ پیاسوں کو تلاش کرتا ہے اور پھر کنویں لیکر ان کی طرف دوڑتا ہے۔ مجھ سے پہلی بار ملا تو ایسے ملا جیسے غرضمند ہو۔ اور وہ آیا تھا میری غرض پوری کرنے۔

منیرہ میری مرحوم بیوی قلب کے عارضہ میں مبتلا ہو کر عثمانیہ ہاسپٹل کے یونیورسٹی وارڈ میں شریک ہوئی تھیں۔ یہ وارڈ مختص تھا جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ متعلقین اور ان کے اہالیان کیلئے۔ میں بھی تو پروفیسر عالم خوندمیری کا یار غار تھا جس کو اب مرحوم لکھتے ہوئے قلم رکتا بھی نہیں ہے کہ انھیں جدا ہوئے زمانے بیت گئے لیکن ایک پھانس سی کلیجے میں چبھتی ضرور ہے۔

مختصر یہ کہ میں عالم کے توسط سے، منیرہ کو یونیورسٹی وارڈ میں شریک کرا سکا تھا۔ اخباروں میں منیرہ کی علالت کی اطلاع چھپی تو ایک جامہ زیب سرخ و سفید بولتی ہوئی آنکھوں والا کوئی شخص دوسرے ہی دن مزاج پرسی کرنے چلا آیا۔

اس انگریز نما آدمی نے یہ نہیں کہا کہ میں آپ کا FAN ہوں کہنے لگا میں آپ کے افسانوں کے مداحوں میں ہوں جہاں بھی آپ کی کوئی چیز نظر آتی ہے ضرور پڑھتا ہوں۔ آپ کی بیگم کی علالت کی خبر پڑھی تو یونیورسٹی وارڈ کا

حوالہ تھا۔ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے انتظامیہ سے متعلق ہوں۔ سوچا آپ سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور میں جتنی میری مقدرت ہے اس وارڈ میں آپ کو سہولت بہم پہنچا سکوں گا۔

مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کے اخلاص کو جب اس کے ہونٹوں پر بکھیر رہی تھیں تو پتا بھی نہ چلا کہ اس چمک دمک کے پیچھے کسی اشک چشیدہ دل حزیں کی گھلاوٹ بھی شامل ہے۔ وہ سنگ مرمر کی مورت کی طرح سامنے کھڑا رہا جیسے میرے کسی بھی حکم کا منتظر ہو۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ پروفیسر عالم کے توسط سے یہاں منیرہ کو داخلہ مل گیا ہے اور وہ آرام سے ہے۔ فی الوقت اس سے ملاقات کا سلسلہ ڈاکٹروں نے بند کروا دیا ہے۔

اس کو دیکھ کر دواخانے کے متعلقین اس کے اطراف جمع ہو گئے۔ خدا جانے یہ اس کے عہدہ کا اثر تھا یا اس کی ہر دلعزیزی کا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں وارڈ میں داخل ہوا تو وہ پیچھے تھا اور دواخانے کے دو تین لوگ اس کے پیچھے پیچھے۔

اس نے وارڈ سے باہر نکلنے سے پہلے دواخانے کے ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ وارڈ میں آئے تھے کچھ کہا اور ہاتھ کے اشارے سے اطراف لگے اسکرین اور چوبی پردہ داریوں کی وسعت دینے کی بات کی۔ واپس ہوتے ہوئے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ نیک تمناؤں کا اظہار کچھ اس طرح کیا جیسے مجھ سے عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود بزرگوں

جیسی دعائیں دے رہا ہو۔

جا چکا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ متعلقہ ڈاکٹروں سے بھی مل گیا ہے۔ اس کے جانے کے بعد اس کے اثرات مجھے یونیورسٹی وارڈ کے اس حصے میں صاف دکھائی دیتے رہے تھے جو ہمارے لئے مختص تھا۔ چھوٹے سے وارڈ کو اسکرینوں اور چوبی پردہ داریوں کا فصل بڑھا کر کشادہ کر دیا گیا تھا۔ دو تپائیاں اور دو کرسیاں بھی رکھ دی گئی تھیں بات آئی گئی ہوئی۔ دھیان نے دوسری راہ پکڑ لی۔ زندگی نے اتنی فرصت نہ دی کہ اس اجنبی شخص کو ذہن کے کسی گوشے میں جگہ دوں۔ وارڈ کی وسعتوں سے بھی وہ اب کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اب تو سب کچھ روزمرہ بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ منیر کی بیماری بھی کچھ انھیں راستوں پر چل نکلی تھی۔

منیر کے بغیر گھر، منیر کے بغیر بچے، منیر کے بغیر بچوں کے اسکولس۔ منیر کے بغیر دستر خوان اور اس پر دھرا کھانا، ہر شئے میں کسی شئے کی کمی تھی اور اس کمی کو پورا کرنے کی لگن میں خود میں آدھا ہو رہا تھا۔ اس نصف وجود کا کسی کو پتا بھی نہیں تھا۔ اپنا دکھ اپنے ساتھ چھپا کر بھی کوئی چین سے نہیں جی سکتا۔ لوگ خوشیوں میں شریک ہو کر خوشیاں بٹورتے ہیں۔ لیکن کسی غم کو سرے سے غم تسلیم ہی نہیں کرتے۔ کیا بتاؤں کسر نفسی کن داموں بک گئی ہے کہ ہر زیادتی کا جواز نکل آتا ہے۔

زندگی سمجھوتہ کر لینے میں بڑی بیسوا ہے جیسے اس کا اپنا کچھ ہے ہی نہیں نہ عزت نہ پسند اور سو اس نے مجھے کہیں نہ کہیں ٹھکانے لگا دیا اور میں دفتر بھی جانے لگا۔

ایسے میں کون حسن چشتی؟ کریکایک اس کا فون آیا۔ ساتھیوں نے بتایا کہ ان صاحب نے کم از کم اتنے دنوں میں چار چھ بار تو فون کیا ہی ہوگا۔ تمہارے دفتر میں رجوع ہونے کی تاریخ شاید انھوں نے رٹ رکھی تھی۔ ادھر تم آئے ادھر فون موجود۔ پہلے دستخط کرلو۔ رجسٹر چلا جائے گا۔ میری پوسٹ اتنی تھی کہ میں رجسٹر منگوا نہیں سکتا تھا۔ رجسٹر کے پیچھے دوڑ سکتا تھا۔ نام بڑے تھے درشن بہت چھوٹے۔

اس نے فون پر معذرت کی، خیر خیریت تفصیل سے پوچھی۔ وارڈ کے انتظام کے بارے میں پوچھا۔ لیکن وہ مجھ سے بات کر چکا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اس کو بھی اپنی بے آرامی میں شریک کر لیا ہے اور وہ مجھے دعائیں دے رہا ہے جیسے میرا انجام جانتا ہو۔

پھر ہم ملتے رہے وہ آتا رہا۔ منیرہ کے بعد وہ زیادہ ہی آنے لگا۔ دفتر سے اٹھا کر مجھے کسی ریستوران لے جاتا۔ میرے گھر سے اٹھا کر اپنے گھر لے جاتا۔ غرض کہ طرح طرح میری کچھ اس ڈھنگ سے دلجوئی کرتا کہ دلجوئی کرتا ہوا پکڑا نہ جائے۔ چوروں کی طرح غم چرا لینے میں بڑا ملکہ تھا اس کو۔ بچپن میں پڑھا تھا کہ ایسا ہی من چلا کوئی محمود گاوان بھی تھا۔ جو راتوں رات چھپ کر ضرورت مندوں کے گھر رقم کی تھیلیاں پھینکا کرتا۔ آج زندہ ہوتا تو وہ تھیلیاں پھینکتا جاتا اور اس کے آگے بڑھتے ہی چور اچکے تھیلیاں سمیٹتے جاتے۔ دوسرے دن ساری تھیلیاں کسی پولیس تھانے سے برآمد ہوتیں اور وہ شخص جس نے تھیلیاں چھین لی تھیں رات کی تاریکیوں سے بچ کر پولیس تھانے میں زیادہ محفوظ طور پر

چھپا رہتا۔ غم چرا لینے میں فائدہ یہی ہے کہ چور پولیس کی زد میں نہیں آتا اور چور کا اثاثہ بھی دوسروں کا ہو جاتا ہے۔

بہار کے ایک اوسط گھرانے میں اکتوبر 1930ء کی پندرہ تاریخ کو حیدرآباد میں پیدا ہونے والا یہ بچہ غول عماں سے نکل کر باہر آیا تو سنگ مرمر کے ایک ایسے پتلے کی طرح تھا جس پر اس کے قابل افتخار باپ کی اصول پسندی نے گاندھی اور نہرو کا پرتو ڈال رکھا تھا۔ اور یہ پرتو بھی غیر مرئی نہ تھا بلکہ کھادی کی کرتی اور موٹے کھدر کی موٹی سی "چڈی" کی صورت میں دیکھنے والوں کو صاف نظر آتا۔

آٹھویں جماعت تک حسن چشتی کے خوبصورت بچپن کے ساتھ کھدر پوشی نے کچھ ایسا بُرا سلوک نہیں کیا۔ ہمدردی۔ انسان دوستی، محبت، تحمل، مسکراہٹوں کی سپر کے پیچھے چہرہ چھپا کر صعوبتوں کو ہزیمت شناسی سکھلانے والے تیور۔ اس کے ابا حضور نے یہ سارا اثاثہ اس کے ساتھ کر دیا۔ حسن چشتی نے جو شاید موقع کی تاک میں تھا کھادی اتار پھینکی اور باقی سب کچھ اپنا لیا۔

چلتے چلتے آپ سے ایک بات پوچھوں۔ آج کھادی پوش شخصیتیں آپ کے ذہن میں کیسا امیج بناتی ہیں؟ جواب دیجئے۔ شرمائیے نہیں۔ بس یہی بات ہے۔ حسن چشتی کھادی نہ اتار پھینکتا تو اس طرح دلوں میں گھس گھس کر بیٹھ جانا اس کے بس میں نہ ہوتا۔

ایک کھدر پوشی وہ بھی تھی جس پر حسن چشتی فخر کرتا تھا۔ اس نے اپنے بچپن میں کھادی اوڑھے ہوئے ہیولے کبھی نہیں دیکھے۔ آنکھ کھولی

تو اسے کھادی اوڑھی ہوئی ایسی صلابتوں سے واسطہ پڑا جن کا جسم گوشت پوست کا تھا لیکن روح فولاد کی۔

اس حیدرآبادی بیٹے کے ابا حضور بہاری تھے۔ ضلع گیا' ان کا وطن تھا۔ اپنے وقت کے کٹر NATIONALIST مسلم تھے۔ اردو کی پہلی جامعہ جو مادر عثمانیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے پہلے منتظم۔ نام سمیع احمد اور خدا کے سوا کسی کو سمیع نہیں مانا۔ قلندر صفت آدمی۔ ملنگ بابا۔ ملک پیٹ میں رہتے۔ صبح صبح گھر کے باہر چبوترے پر کمبل بچھا کر بیٹھ رہتے۔ ایک شخص ملے پلی سے پاؤں پاؤں چلکر صبح چھ بجے سمیع صاحب کے ذوق سماعت کا سامان مہیا کرنے چلا آتا۔ آنے والے کا نعرہ مستانہ تھا TRAVEL AS YOU LIKE۔ نہ گھوڑا نہ گاڑی۔ ان ہی پاؤں پاؤں چلنے والی ٹانگوں کا کس بل تھا کہ طالب علمی کے زمانے سے علی گڑھ میں اس شخص نے انگریز سرکار کو اس کے پیچھے دوڑ لگانے کے لئے مجبور کر رکھا تھا اور جب تک انگریز سرکار نے اس کا تعاقب نہیں چھوڑا وہ باز نہ آیا۔ پھر سرکار خود بھاگ کھڑی ہوئی۔ سمیع صاحب سے بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ سمیع صاحب بھی اس کے معترف اور وہ تو سمیع صاحب کا دل دادہ۔ بتائیے کون ہوگا۔ بڑا نام ہے بھئی۔ حسرت موہانی۔

ملے پلی کے جس مکان میں وہ رہتے تھے اس کا کرایہ تھا پانچ روپے ماہانہ اور اثاثہ حیات تھا ایک چٹائی۔ ایک شیروانی۔ حسرت موہانی کے علاوہ سمیع صاحب کا یارانہ ان کے ہم جلسوں سے تھا وہ سارے کے سارے کبوتر نہیں تھے' باز تھے احمد علی خاں جو بعد میں آندھرا پردیش کی کانگریس سرکار میں ہوم منسٹر رہے شعیب اللہ خاں' جن کے قلم کی سچائی اور جرارت مندی کو باطل کی قوتیں دبا نہ سکیں تو خود

انھیں شہید کر دیا۔ مانی جائسی جن کی سخن وری کے چرچے تھے۔

سمیع صاحب اپنے وقت کے والی بال کے اچھے کھلاڑی تھے۔ ان سے ٹکر لینے والا ایک اور کھلاڑی بھی تھا۔ جو کھیل کے میدان سے نکلا تو ساری زندگی ہی سے کھلواڑ کرتا رہا۔ یہ تھے دیہقانی زبان کے ایسے شاعر جنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ میڈیا کچھ ہو خیال کی رفعتوں پر کمند سخن پھینکنا ہنرمندی کا پہلا وصف ہے۔ غلام علی نام تھا۔ علی صائب میاں کے نام سے شہرت پائی۔

والی بال شروع ہونے سے پہلے نٹ باندھنا اور کھیل ختم ہونے پر نٹ کھول کر لے جانا۔ حمایت اللہ کے فرائض میں تھا۔ قد دیکھ کر کام دیا گیا تھا۔ نٹ کھولنے اور باندھنے کا ملکہ اس لڑکے کو زندگی کی گتھیاں سلجھانے کیلئے ہاتھ بڑھانے کو اکسانے لگا اس کام کیلئے ہتھیار چاہیئے تھا سو اس نے بھی قلم کو چن لیا۔ آج وہ زندہ دلان حیدرآباد کے روح رواں ہے۔ حیدرآباد کی مقامی کھڑی بولی کا ایسا شاعر ہے جس کو سنکر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بڑی شاعری کے امکانات محدود نہیں ہیں۔ اگر نظر میں وسعت ہو اور انسانی دردمندی زادِ سفر ہو۔

اس ماحول میں آنکھیں کھولنے والا شعوری اور غیر شعوری طور پر حساس اور حوصلہ مند تو ہوگا ہی جسن چشتی کو اس تحمل و ضبط اور انسانی دردمندی نے عنفوانِ شباب کی ہی پہلی سوغات کچھ اسطرح سونپ دی کہ اس کا مزاج ہی چپ کے چپ کے، دلوں میں اترنے کے جتن کرنے لگا۔ چنانچہ وہ نہ صرف اپنے خاندان میں احباب میں کلاس کے ساتھیوں میں سب ہی میں چاہا جانے لگا بلکہ اسی اثنا میں اس نے اپنے خاندان کی ایک حسینہ کے دل میں بس جانے کیلئے اپنا آپ اسے سونپ دیا۔ اس لڑکی نے بھی بڑی احتیاط سے جسن چشتی کو دل میں بسالیا اور اس درجہ سنجیدہ ہو گئی

جیسے وہ جنم جنم سے حسن کو اپنے ذہن و دل میں پرورش کرتی رہی تھی۔ لیکن غم جو دبے پاؤں زندگی میں داخل ہونے کا عادی ہے۔ حسن چشتی سے آہستہ آہستہ اس کی مسکراہٹوں کا سودا کرنے لگا۔ حسن چشتی کے دن وہ نہ تھے جو کسی بھی حسن کو جلا بخشتے ہیں ویسے اس کے عشق کی راحتیں اس کے خاندان میں محصور تھیں ماموں فوج میں بڑی خدمت پر تھے۔ سارا کروفر بنگلے پر تھا۔ سارا پندار تمغہ لگی وردی میں۔ حسن چشتی قلم کی شاہی کا قائل۔ اس کا پندار اس کی کتر بیونت کرتا رہا تھا کہ قلم کی شاہی میں سب کچھ ہوتا ہے سوائے دولت و ثروت کے۔ اردو زبان کے شاعر و ادیب کو شعر و ادب کا پہلا سبق یہی پڑھایا جاتا ہے۔ وہ جو کوئی کلی سی دل کے کسی گوشے میں چٹکی تھی تیزی سے مرجھانے لگی اور بہت جلد اس کی سوکھی پنکھڑیاں یکجا ہو کر اتنی سخت ہو گئیں کہ اب یہ سوکھی کلی خار بن کر حسن چشتی کے دل کے اسی گوشے کو زخمی کرنے لگی جہاں اس نے چمن کھلا لینے کے خواب دیکھے تھے۔ حسن نے بہت چاہا کہ اس غنچے کو نکہت کی لو سے بچا کر تازہ دم رکھے۔ ماہنامہ "پاسبان" کی ادارت سنبھالی۔ کچھ نہ ہو سکا تو ذرا سا صورت بدل کر ماہنامہ "آسمان کہکشاں" کو چھو لیا۔ آکاش نے بھی نہ کہکشاں کے قریب آنے دیا نہ ایک ستارا ہی توڑ کر جھولی میں ڈالا۔ حسن چشتی، جمیل مظہری کا یہ شعر گنگناتے، گاتے خود شاعر بن بیٹھا۔ ؎

یہ میری شومئ قسمت کہ تم کو پا نہ سکا
غرورِ عشق امارت کے بت کو ڈھا نہ سکا

اس کی شاعری نے اس کو تسلی دی اور یہ دم دلاسا ہی کچھ دن زندگی کا حوصلہ

بن کر حسن کے ساتھ رہا۔ اس نے نظمیں کہیں غزلیں کہیں گنگنا کر دیا، دہرا کر گنگنایا، پھر خود ہی اپنے اس ہنر سے اس طرح اغماض برتا جس طرح کبھی خود ہی اغماز کرتا اور اتراتا تھا وہ سوچتا ہی رہا جیسے اس نے اپنے ماضی کو یکسر بھلا دیا ہو۔ بھول گیا ہو کہ وہ کبھی کالج کے میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ بھول گیا ہو کہ اس نے کالج میں الکشن جیتے تھے اور ساتھیوں کی نظروں میں چھپے رہنے کی عادت اسے پڑ گئی تھی۔ بھول گیا ہو کہ اس نے اپنی کہانیاں حیدرآباد لاسلکی سے نشر کی تھیں بھول گیا ہو کہ اس کی نظموں اور غزلوں پر مضامین لکھے جانے لگے تھے۔ اس زاد سفر نے دنیائے شعر و ادب میں ابھی اس کا صحیح امیج بھی نہیں بنایا تھا کہ اس نے اپنی فعالیت کو ایک ایسی ڈگر پر ڈال جو اس کو معاشرے کی رگ جاں تک لے جاسکے۔

اس نے انسانی فلاح و بہبود کیلئے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا اور وہ سب کچھ دیا جو اس کے ورثے میں ذہن کی تربیت بنکر ہاتھ لگا تھا۔ اپنا غم بھول کر دوسروں کا غم اپنا لینا کچھ اتنا آسان بھی تو نہیں ہے۔ یہ کام حسن چشتی بڑی مشاقی سے کر رہا ہے۔

شاید اللہ میاں کو اس کی یہی ادا پسند آگئی ہو کہ اس نے حسن چشتی کو اپنے کرم بے حساب سے کچھ اسطرح نوازا کہ تنگ آکر ۲۵ روپے ماہانہ کی نوکری کر لینے والا ایک صاحب نظر اور اصول پرست خاندان کا یہ چشم و چراغ جب عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ ہوا تو جلد ہی منتظمی تک جا پہنچا۔

۱۹۶۳ء سے تقریباً چار سال جامعہ کی این جی اوز (N.G.OS.) یونین کا سکریٹری رہا۔ اس دور نے چشتی کو بڑی آزمائشوں سے گزارا۔ ملازمین

جامعہ کی اقلیتوں میں اپنے مفادات کے عدم تحفظ کا شدید احساس انھیں دلبرداشتہ اور مایوس کر رہا تھا۔ مسلمان ملازمین جامعہ کی ترقی معکوس روزمرہ کا وطیرہ بن گئی تھی۔ ان کی دارفل بختی حسن کو بے آرام رکھتی تھی۔ پولیس ایکشن ہوئے زمانے بیت گئے تھے لیکن ایک مذموم ذہنیت کہ ہندستان اب مسلمان کا وطن نہیں ہے۔ ان اقتدار پرستوں کا شعار بن رہا تھا جو سیکولرازم کا نام لیکر فرقہ پرستی کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ ایسے میں سنگ مرمر کے اس جیالے نے اپنے بچپن کی کھادی کی کرتی اور چڈی کی لاج رکھ لی اور کچھ اسطرح رکھ لی کہ اس کے پتلون کی کریز پر ایک بل نہ پڑ سکی۔ اپنی راست بازی اور ہر دلعزیزی کا ہتھیار کھائے، اس نے اقلیتوں کی کسمپرسی کو انتظامیے کی بازپرسی تک پہنچایا۔

دیانتداری کو اپنے ابا حضور کا عطیہ سمجھ کر اپنے سینے پر تمغے کی طرح لٹکا رکھنے والا حسن چشتی چھپا کر دینے کا ہمیشہ رسیا رہا۔ چھپا کر لینا اسے آیا ہی نہیں۔ ملازمت میں اس کی طرف بڑھنے والی ہر بند مٹھی سے نفرت کرنے والے کو دوسرے کی طرف بڑھنے والی اپنی بند مٹھی کا بھرم بھی رکھنا تھا اور اپنی جامہ زیبی کی لاج بھی رکھنی تھی۔ چنانچہ ملازمت کے دوران ہی اس نے کتابوں کا کاروبار شروع کیا۔ ان دنوں سکندرآباد میں جے سمہا گراؤنڈ کے قریب کرائے کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ ان دنوں اس کا کاروبار جم گیا تھا اور تقریباً پانچ ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی تھی۔ اکثر کسی نہ کسی بہانے مجھے لے جاتا یا وعدہ لیکر انتظار کرتا۔

اس کی بیگم زینت اس کا دوسرا عشق ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اچھے برے میں حسن کا ساتھ دیا۔ حسن کو ٹوٹ کر چاہا اور حسن کے چاہنے والوں کو بھی

اپنا سمجھا۔ میری تواضع میں کسر نہ اٹھا رکھتیں۔ بھائی یہ لیجئے۔ بھائی وہ نہیں لیا آپ نے اور حسن اس تواضع پر صرف خوش نہیں ہوتا بلکہ اتراتا۔ زینت نے حسن کو اس طرح اپنا پاکر اس سے شعر کہنے کی کسک چھین لی جو چیز حسن نے کھودی تھی، زینت نے تلاش کرکے اپنے روپ میں اسے دیدی۔ جب حسن چشتی اپنی پہلی محبت کی قسم بن کر نہ رہ سکا تو زینت کی محبت کے ساتھ اس کی وفاداری نے یہاں بھی اس کا ہاتھ تھامے رکھا۔ شعر و سخن کی پردہ داری اسی "سنجیدگی" کے ساتھ گئی اور اب دوسری محبت دل کے ساتھ ساتھ گھر کی "زینت" بھی بن گئی تو سخن کے پردے سے جھانک کر حسن چشتی نے دور دور تک دیکھا۔ اب زندگی بہ انداز دگر اس کو بلانے لگی تھی۔

ہمت، حوصلہ، لگن، ذہانت اور محبت یہ سب کچھ رکھ کر بھلا تم کیا نہیں کر سکتے حسن۔ کوئی جیسے بار بار آواز دیتا تھا۔ وظیفے پر سبکدوش ہوکر وہ یکایک دوست احباب کی رفاقتوں کے افق ہی سے غائب ہوگیا۔ چونکہ میں بھی ان ہی دنوں حیدرآباد سے تبادلہ ہوکر بغرض ملازمت نظام آباد آچکا تھا۔ تو دوریوں نے جواز پاکر گویا سمجھوتہ کرلیا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں غالباً ۱۹۸۲ء کے آغاز کی بات ہوگی۔ حیدرآباد پہنچا تو اس کی تلاش میں نے سمجھا گر اونڈ پر آتے آتے محسوس ہوا کہ اداسیاں خوش آمدید کہنے کے لئے بڑھ رہی ہیں۔ سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے ہی مکان کہہ رہا تھا کہ تم کہاں آگئے ہم خود مکینوں کو ترس رہے ہیں۔

نہ جمیل کا گھر معلوم نہ عزیز کا۔ جمیل بہنوئی ہیں حسن چشتی کے اور عزیز ان کی یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے کے صرف ساتھی نہیں رفیق بھی۔ آخر ش

معلوم ہوا کہ اس یارِ طرحدار نے ترکِ وطن کر دیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ چاہنے اور چاہے جانے کا سلیقہ اس شخص میں اتنا ہے کہ وہ جہاں جائے گا اپنی بزم سجا لے گا۔ لیکن اس بات کا دکھ تھا کہ وہ اتنی آسانی سے بغیر ملے۔ بغیر اپنے آنسو میرے دامن میں جذب کئے بغیر میری آنکھوں کی سوغات لئے اسطرح چلا گیا۔ زینت بھی ساتھ ہے۔ یعنی اس کے فوری لوٹ آنے کے امکانات نہیں ہیں۔

دن بیتے، مہینے بیتے، اب برسوں نے احتساب شروع کر دیا۔ معلوم ہوا حسن چشتی جدہ میں ہے اور بزم جدہ کا صدر ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا۔ حسن چشتی دورہ کیلئے آئے تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوا انھوں نے مجھے کس سے پوچھا۔ کہاں ڈھونڈا۔ میں ان دنوں شاید ضلع نظام آباد کے ایک مقام دودور پر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حسن چشتی مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ میں برسرِ خدمت ہوں تو وہ وظیفے پر سبکدوش ہو ہی نہیں سکتے۔ شاید طویل رخصت لے رکھی ہو۔ اس طرح آس بندھی کہ وہ آ جائے گا۔

یکایک حسن چشتی کا خط آیا۔

پیارے بھائی میرے۔

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے (بشیر بدر)

(حسن چشتی)

اس کے سوا کچھ بھی نہیں، تاریخ بھی نہیں۔ مجھے پیار کے ساتھ غصہ بھی آیا۔

کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تخلیقی ذہن شعور کے سوتے سوکھنے نہیں دیتا۔ اگر اس کی بنیادی ضروریات کا سامان فراہم کرنے کی زندگی ضمانت دے دے لیکن ایک خدشہ اور لگا رہتا ہے۔ جب نعمتیں اس حد تک تعاقب کرتی ہیں کہ آرزو اور تمنّا کا لفظ ہی زندگی کیلئے بے معنی ہو کر اسطرح رہ جائے کہ ہر چیز حاصل ہر چیز دسترس میں ہو تو تمنّا کا دوسرا قدم بھی دشت امکاں میں نقش پا تلاش کرنے سے جی چراتا ہوگا۔ 25 روپے ماہانہ کی ملازمت قبول کرکے زندگی سے پنجہ کشی کرنے کے لئے آمادہ ہو جانے والا حسن چشتی آج جدہ میں برسر روزگار ہندو پاک کے مہاجرین میں سب سے بڑی تنخواہ پانے والا عہدیدار تھا۔
اس عہدہ داری نے اسے تن آسان کرنے کے بجائے اس درجہ فعال کر دیا تھا کہ بے کلی اور اضطراب اس کی سرشت ہو کر رہ گئی تھی۔
دیکھئے بعض تضادات کس طرح گٹھ کر بار پاتے ہیں۔ حسن چشتی اپنے کپڑوں کی کریز سے بے نیازانہ جی نہیں سکتا۔ حسن چشتی کی مانگ اسطرح جمی رہتی ہے کہ بال بیکا کبھی نہ ہوا۔ اب اس کو کیا چاہیئے تھا لیکن وہ مشت خاک جو تیز ہواؤں کے مقابل خود کو رکھ رکھ کر دیکھنے کی عادی ہو گئی ہے نچلی کہاں بیٹھے گی۔ بکھر بکھر کر سمٹے گی پھر سمٹ سمٹ کر بکھرے گی اور متواتر ارتکاب ایذا پسندی جان کا آزار بن کر رہے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ حسن چشتی کے جی میں آئی کہ سارے سعودی عرب میں جتنے حیدرآبادی غریب الوطن ہیں ان کے بالوں میں کنگھی کی جائے، ان کے کپڑوں کی شکنیں، سلوٹیں، سلیں درست کی جائیں۔ ان کے چہروں سے وحشتیں اور لباس سے دریدگی چھین لی جائے۔ اس متوالے نے جھوم کر جماہی لی اور چل پڑا۔ دل میں سنگ پاڑی کی کنگھی چھپالی اور سینے میں گرم استری کی

مرارتیں بھرلیں۔ 1985ء کے آتے آتے جدہ میں حیدرآباد اسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی تو نورکنی اڈھاک کمیٹی نے گرماگرم بحث وتمحیص اور ردوقدح کے بعد حسن چشتی کو اپنا صدر منتخب کرلیا اور حسن چشتی نے ان دنوں سعودی عرب میں برسر روزگار حیدرآبادیوں کی مستند فہرست مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور کام شروع کردیاگیا تو ان کے اعداد وشمار ساٹھ ہزار سے متجاوز تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی رقمی بچتوں کو سودآور اور مفید اسکیمات میں مشغول کرنے کی غرض سے ان کی رہبری اور رہنمائی کیلئے انوسٹمنٹ گائیڈنس بیورو INVESTMENT GUIDANCE BUREAU) کا تعاون حاصل کیا۔

حیدرآباد اسوسی ایشن جدہ نے ناقابل فراموش رفاہی وفلاحی کام انجام دیئے ہیں۔ حسن چشتی جو اس انجمن کے روح رواں تھے اپنے دست راست شریف اسلم کے ساتھ دعاؤں میں شامل رہنے کے عمل کو کچھ اسطرح یقینی بنالیا کہ بے شمار ہاتھ بارگاہ ایزدی میں اس کیلئے اٹھنے لگے۔ سعودی عرب کے تمول سے اپنے دور افتادہ غریب ہم وطنوں کو متمتع ومستفیض کرنے کا ایک انوکھا طریقہ حسن چشتی کے ذہن رسا نے سوچ نکالا۔

اس نے دیکھا کہ سعودی عرب کے بے شمار لوگ کپڑوں کے استعمال میں ضرورت مندی اور تن پوشی کا تصور دور دور تک شامل ہی نہیں رکھتے۔ ان کی دولت وثروت ان کی خواہشات کو نت نئے لباس پہناتی ہے۔ ان کے پاس ایسی پوشاک کی کمی نہیں ہے جو اچھی حالت میں ہوتے ہوئے بھی ان کی دانست

یں ان کے بدن کو زیب نہیں دیتی اور ضائع کردی جاتی ہے۔ یں حسن چشتی، حسن گنگو بہمنی کی طرح گنگوتیلی سے وفاداری نباہنے میں جٹ گیا۔ حیدرآبادی کی جھونپڑ پٹی اور سلمس کے لوگ جو گنگوتیلی سے کہیں زیادہ تصورات کا حصہ بن سکتے تھے، جوق درجوق اس کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے اور اس نے اپنے تصورات کی دنیا انھیں لنگ برنگے کپڑے پہنا کر سجالی۔ چنانچہ اس نے اسوسی ایشن کی طرف سے پہنے اوڑھے لوگوں کو ننگوں بچوں کی جانب نظر کرم اٹھانے کی دردمندی کچھ اس ادا سے سونپ دی کہ ایک ہفتے میں ڈیڑھ ہزار کلو گرام سے زائد کپڑا جمع ہوگیا۔ بعض اہل خیر حضرات نے مفت میں اس کپڑے کی پیکنگ PACKING کا انتظام کردیا تو حسن چشتی ایرانڈیا کے صاحب اقتدار عہدیداروں کی طرف دوڑا۔ ان کا تعاون بھی حاصل ہوگیا اور جدہ سے بمبئی تک ہوائی کمپنی نے کرایہ نہ لیا۔ کسٹم کلیرنس (CUSTOM CLEARANCE) فری ہوگئی۔

پھر جب دوسری کھیپ بھی چار ہزار کلو گرام بمبئی پہنچ گئی تو وہ چھ ہزار کلو گرام کی تیسری کھیپ کے منصوبے بنانے لگا کہ کپڑوں کی یہ فصل بھی تیار کھڑی تھی۔

۱۹؍جولائی ۱۹۸۵ء کے ہفتہ وار راڈی جو بریڈ فورڈ لندن سے نکلتا ہے اس نے "یوں بھی ہوتا ہے" کی سرخی لگا کر حسن چشتی کو روزنامہ سیاست حیدرآباد کے حوالے سے خراج تحسین و عقیدت پیش کی ہے وہ لکھتا ہے۔

...... "جو پارچہ جات استعمال میں نہیں تھے وہ اللہ کی مخلوق کے دوبارہ کام آنے لگے۔ بوصول کنندگان

کے دلوں سے پارچہ جات کے اصل مالکوں اور حسن چشتی صاحب کیلئے کیا کیا دعائیں نہ نکلی ہوں گی۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد کے ایک اور تراشے کا حوالہ دیتے ہوئے راوی لکھتا ہے۔

"حیدرآباد اسوسی ایشن حج کے دوران قربانی کے گوشت کو ہندوستان روانہ کرنے کے لئے اسلامک ڈیولپمنٹ بنک کے کارپردازوں سے بات چیت کررہی ہے۔ ہمیں حج کی سعادت تو ابھی نصیب نہیں ہوئی مگر سنا ہے اور اکثر دردمند لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ قربانی کا جانور حلال کرنے کے بعد ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے ماضی میں کئی بار یہ کوشش کی گئی کہ اس گوشت کو مٹی میں دبانے اور ضائع ہونے سے بچایا جائے اور جدید ٹکنک کے مطابق محفوظ کر کے ضرورت مند علاقوں اور لوگوں تک پہنچایا جائے۔ خدا کرے حسن چشتی صاحب کی کاوشیں بارآور ہوں۔ یہ بہت بڑا کام ہوگا کہ حج کے دوران ہونے والی قربانیوں کا گوشت ضرورتمندوں تک پہنچے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا سہرا بھی حسن چشتی کے سر رہے۔"

سنا ہے کہ یہ سہرا حسن چشتی کے سر آخرش باندھا گیا۔

۱۹۸۵ء حسن چشتی کے سنہری کارناموں کا شاید وہ پہلا سال ہے

حیدرآباد اسوسی ایشن جدہ کے قیام سے پہلے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس کی ساری کدوکاوش، جدوجہد، اس کی ساری ہنرمندی اس کی شخصیت کی ساری پر اعتماد ہوتی اگر یہ کام نہ کر سکے تو گویا اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ لگاتار اسی کوشش میں رہا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ سعودی عرب سے حیدرآباد راست فضائی سرویس کا انتظام ہو۔ حسن چشتی نے وزیراعظم اور مرکزی وزیر ہوا بازی سے پرزور نمائندگی کی۔ وزیراعلیٰ آندھراپردیش سے تعاون کا وعدہ لیا۔ ایرانڈیا سے اس بات کی طمانیت حاصل کی کہ انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے اگر مرکزی اور ریاستی حکومتیں آپس میں اس پرواز کو طے کرلیں۔ چنانچہ حیدرآباد کی بیگم پیٹ طیرانگاہ کو "انٹرنیشنل ایرپورٹ" میں تبدیل کرتے ہی حسن چشتی نے اپنی اسوسی ایشن کی ساری توانائیاں اپنے اس مطالبے کی عملی صورت گری کے لئے صرف کیں اور ۱۹ ڈسمبر 1985ء سے جدہ تا حیدرآباد راست پرواز کا آغاز ہوگیا۔

ایرانڈیا کے وی آئی پی مہمانوں میں حسن چشتی اس پہلی پرواز سے حیدرآباد آئے پانچ ستارے والی ہوٹل "بنجارہ" میں انھیں مہمان رکھا گیا۔ چنانچہ انگریزی اردو اور عربی کئی اخباروں نے حسن چشتی کو خراج پیش کرتے ہوئے یہ خبر جلی سرخیاں لگا کر چھاپی۔

HYDERABAD:- A LONG STANDING DEMAND OF THE HYDERABADIES HAS NOW BEEN FULFILLED AND WE THANK THE GOVT. OF INDIA AND

THE STATE GOVT SAYS MR.
HASAN CHISHTY PRESIDENT
HYDERABAD ASSOCIATION
JEDDAH.

MR. CHISHTI WAS AMONG
THE DIGNITARIES INVITED BY
AIR INDIA ON ITS INAUGURAL
DIRECT FLIGHT FROM JEDDAH
TO HYDERABAD ON DECEMBER 20.

رام داس کا ستھ ایر انڈیا منیجر اور جگدیش ٹائیٹلر مرکزی تقریب سفر میں شریک تھے۔

مجھے اس نے خط سے یہ خوش خبری سنادی تھی — مجھ سے دیر ہوئی تو ٹیلی گرام ملا — میں ہوٹل بنجارہ پہنچا تو دوڑ کر لپٹ گیا — تابڑ توڑ کئی پیار لئے عربوں کی طرح مصافحہ کرنا، بوسہ ثبت کرنا۔ معانقہ کرنا اس کو آج تک نہیں آیا — وہ لوگوں میں سے ہے۔ جسے حیدرآبادی تہذیب کے سفیر کی حیثیت سے دنیائے عرب اور پاکستان میں بھیجا جاتا ہے۔

کہنے لگا — "بیٹھ جائیے۔ بس ابھی دو منٹ" —

میں اسے ہمیشہ تم کہتا ہوں اور وہ مجھے ہمیشہ آپ کہتا ہے کسی عالم سرخوشی میں بھی اس نے یاد نہیں کہ مجھے تم کہا ہو — ایک بات

ضرور یاد رکھنے کی ہے کہ اس عالم سرخوشی میں "دخت رز" کا کہیں شائبہ نہیں ہے۔ بس یہی اس میں ایک خرابی ہے کہ نہ پیتا ہے نہ پلاتا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں کہ بھائی مت پیو۔ دور رہو اس شیطان کی بیٹی سے لیکن یہ ظلم تو گوارا نہ کرو کہ مجھے بھی اس نعمت سے محروم رکھو۔ تم اچھے ہو۔ تمہارے اوصاف حمیدہ سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ ہم بُرے ہیں۔ ہماری برائی سے تم ناواقف نہیں ہو۔ مانتا ہوں کہ میرے من پسند آب صُراحی کا ایک قطرہ جہاں گرے وہاں فرشتے نہیں آتے۔ تم بھی یہ جانتے ہو کہ مجھے فرشتوں سے کیا لینا دینا۔ میں نے بھی طے کر رکھا ہے کہ میرے مرنے سے پہلے ایک بار اُسے ساقی بنا کر رہوں گا۔ اس کو یہ احساس تو رہنا چاہیے کہ فرشتوں سے بھاگنے والا شخص یہی کیا کم ہے اس سے مل لیتا ہے۔

ہاں تو اُس نے کہا تھا کہ۔ بیٹھ جائیے۔ ابھی دو منٹ۔

میں گم سم بیٹھا رہا۔ ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ آتے تھے۔ وہ ہر ایک سے اسطرح ملتا جیسے ان کی ضرورتیں پوری نہیں کر رہا ہو۔ بلکہ خود دست بستہ ان کے آگے عرض پرداز ہو۔ کام نکال دینے کے وعدے۔ کام کر دینے کی اطلاع۔ بات ختم نہیں ہوئی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ چونکا تھا کہ کسی نے سلام کیا۔ کسی نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا کہ پھر گھنٹی بجی۔ میں بیٹھا اس کے دو منٹ کو بس ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ پر وہ دو منٹ مجھے کہیں نظر ہی نہ آئے۔ محسوس ہوا کہ وقت خود ان دو منٹوں کی تلاش میں کہیں نکل گیا ہے۔

اتنی مصروفیت، اتنے سلام، اتنی رفاقتیں، اتنی منزلت — میں نے دل ہی دل میں کہہ لیا۔ واللہ اگر یہ زندگی ہے تو میں حسن چشتی کی زندگی دو روز بھی نہیں جی سکتا۔

کبھی شاید ۱۹۷۷ء میں جنوب کی سات زبانوں کے ادیبوں شاعروں کو فیلڈ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ نے معلوماتی تفریح کے طور پر مدعو کیا تھا — اردو کی نمائندگی میں نے اور شاذ تمکنت کی تھی۔ پبلسٹی ڈپارٹمنٹ آندھرا پردیش کی نمائندہ اے آئی آر کی عائشہ رشاد تھیں۔ یہ معلوماتی تفریح اپنی افادیت کو ملحوظ رکھتے بہت اہم تھی لیکن ساتھ ہی گورنر سے ملنا، چیف منسٹر سے ملنا۔ اس اہم منسٹر سے ملنا، اس کمشنر سے ملنا۔ وہاں ڈنر یہاں لنچ بندھا ٹکا سا پروگرام — مدراس دیکھا نہ تھا۔ وی آئی پی کی حیثیت سے دیکھنے کے قابل ساری چیزیں دیکھ ڈالی تھیں۔ لہذا میں نے مدراس میں اپنا سفر منقطع کیا اور تیسرے روز مدورائی میں ملنے کی بات ارباب انتظامیہ سے اپنی خرابیٔ صحت کو جواز بنا کر طے کر لی۔ ان لوگوں نے اسی آرام و آسائش سے اسی اہتمام و زیبائش سے اسی تین ستارا ہوٹل سوناٹ میں رہنے کا انتظام کر دیا اور دوسری وقت مدورائی کے لئے سیٹ بک کروادی۔ ایک افسر دیکھ بھال کیلئے متعین کر دیا جس سے اسی شب مل سکا جس وقت مجھے مدراس چھوڑنا تھا۔ سب جا چکے تو میں نے پیٹ سے اپنے پاؤں نکالے۔ اب ان پیروں پر دوسروں کا اجارہ نہ تھا۔ مدراس کے گلی کوچے بازار دوکانیں، چھوٹی بڑی ہوٹلیں، بسیں رکشا سب میری مرضی سے میرے قبضہ قدرت میں تھے۔ بعض وقت جی کرتا تو جو بس سامنے رکے اس میں سوار

ہو جاتا۔ جہاں جی چاہا اتر جاتا۔ مدراس میں لوگ اتفاقاً تامل بولتے ہیں۔ انھیں متھار کر کام چلاؤ انگریزی میں لے آتا۔ مدراس میں بمبئی کی طرح دشمنِ ہوش و خرد صورتیں نہیں ملیں۔ بس ایسا چلتا پھرتا سناٹا ہے کہ طبیعت ادب جاتی ہے۔ تین روز کی اس آزادی نے مزید پندرہ بیس دن وی آئی پی بنے رہنے کی سکت مجھ میں پیدا کر دی ــــ آٹھ سال پیچھے جا کر خیالوں ہی خیالوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ پروفیسر یوسف سرمست آ گئے۔ معلوم ہوا کہ حسین چشتی ناشتے پر ان کے پاس مدعو ہیں۔

چشتی نے بہت شرمسار ہو کر کہا بس یوسف صاحب ہی کا انتظار تھا ــ اب میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا ــ ناشتہ یوسف صاحب کے پاس کرنا ہے۔ مجھے بھی آپ کو بھی۔ یوسف نے ہاں میں ہاں ملائی کہنے لگے جی ہاں مستیں بھائی تو میزبان ہیں۔

موٹر میں سوار ہوئے تو گتھ کے بیٹھ گئے اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ــــ اب سنائیے۔ اب میں دن بھر نہیں چھوڑوں گا۔ جب آپ میرے لئے آئے ہیں تو میرے ساتھ رہیں گے۔ یہاں بنجارہ میں بھی آپ اطمینان سے رہ سکتے ہیں۔

بیگم شہناز یوسف نے حیدرآبادی لوازمات کا کچھ اس سلیقے سے اہتمام کیا تھا کہ گرم ڈشس (DISHES) کے ٹھنڈے ہونے پر ان کا ترد د میں پڑ جانا یقینی تھا۔

باتیں کسی دلدار کی ہوں تو دیکھئے کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں

جدہ سے راست اکبر حسن چشتی اپنے وطن آئے تھے اور میرے پیر وطن کی زمین سے جیسے اکھڑ گئے اور اب میں اڑ رہا ہوں جبکہ وہ زمین پر ہیں۔

یوسف سرمست کے گنگنان سے لوٹنے لگے تو ہمیں پرانے شہر کا رخ کرنا تھا۔ شوفر سے کہہ دیا کہ چار مینار چلیں اور ہم باتوں میں لگ گئے۔ حسن چشتی اس بات سے مطمئن تھے کہ عرب قوم میں علم وعمل کا رجحان اب دن بدن بڑھ رہا ہے اب وہ اس قابل ہو رہے ہیں کہ ہر شعبۂ حیات میں اپنی قوم اور اپنے وطن کی خدمت انجام دینے کی غرض سے تراطیت ان کے حصے میں آئے اور دوسرے ممالک سے درآمد کی ہوئی محنت پر اکتفا کرنا انھیں نہ پڑے۔

ہندوستان کے کارگذار لوگوں کے تعلق سے ایک فکر انھیں دامن گیر تھی کہ ملیالی اور بنگلہ دیش سے سستے داموں انسانی دست دیا اپنی محنت کا خمیازہ پانے کے لیے سعودی عرب کو حاصل ہو رہے ہیں۔ اب ہندوستانی مسلمانوں کو اس مسابقت میں دشواریوں کا سامنا کرنا ہے۔ سب سے زیادہ دکھ جو انھیں تھا، وہ یہ تھا کہ عرب ممالک میں جو ہندوستانی مسلمان آباد ہیں وہ آہستہ آہستہ لوٹنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایسے میں اپنے ہی وطن عزیز میں ان کی از سر نو زندگی کا آغاز خود ان کے لئے اتنا سہل نہ ہو گا۔ انھیں اس بات کا بھی دکھ تھا کہ عرب میں رہ کر محنت مشقت سے کمائی کرنے والے مسلمانوں کی اکثریت یہاں کی چکا چوند کو اپنے گھر کا اجالا بنا لینے کی مذموم خواہشوں کا اس حد تک شکار ہو گئی ہے کہ بات اب صرف ٹیپ ریکارڈر اور جاپانی دستی گھڑی تک محدود نہیں رہی — وہ تو پھر غنیمت تھا۔ ایسے گھر جن کا سارا

معاشرتی ڈھانچہ واشنگ مشین کلر ٹی وی اور وی سی آر کا متحمل نہیں ہو پاتا وہ ان دکھاووں کا اس درجہ شکار ہو گئے ہیں کہ انھیں اپنے مستقبل کی اہم ترین ضروریات کا ہوش نہیں رہا۔

حسن جب مجھ سے بات کرتا ہے تو اس کی مسکراہٹوں کے نیچے ڈھکے چھپے انسانی دکھ درد کی تمازت اور حدت سے اس کے جھلسے ہوئے ہونٹ مجھے صاف دکھائی دیتے ہیں ــــ جب وہ یہ کہتا ہے کہ خلیجی ممالک سے حیدرآباد واپس ہونے والوں سے ملتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اپنا سارا کس بل، اپنی توانائیاں، اپنی جوانی کے زرین دن، وطن کی مٹی سے ماں باپ کے سایہ عاطفت سے، بیوی بچوں کی محبتوں سے رفاقتوں سے دور رہ کر گزار دینے والے لوگ وطن لوٹتے وقت خوش نہیں دکھائی دیتے، پریشان رہتے ہیں ــــ انھیں یہ فکر کھاتی رہتی ہے کہ اس چھوٹے سے سرمایے سے وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کے لئے ضروریات کی کفالت کو کس طرح ممکن بنا سکتے ہیں۔ کونسا دھندہ کیا جا سکتا ہے۔ کس کام کا آغاز ایسا ہو سکتا ہے جس کا انجام بھی خوش آئند ہو ــــ چنانچہ حیدرآباد اسوسی ایشن ASSOCIATION جدہ نے مستقل طور پر حیدرآباد لوٹنے والوں کی معاشی استقامت کے لئے ان کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا ہے ــــ ایسے افراد کی پس انداز کی ہوئی رقومات حیدرآباد کے کسی پراجکٹ میں مشغول کرنے اور مختلف اسکیموں میں بروئے کار لانے انوسٹمنٹ گائیڈنس بیورو (INVESTMENT GUIDANCE BUREAU) اقلیتی مالیاتی کارپوریشن

سے مستقل ربط قائم رکھا جارہا ہے۔ اور حیدرآباد اسوسی ایشن جدہ ان کی منفعت بخش مشوروں سے خدمت کر رہی ہے۔

جب وہ یہ کہہ رہا تھا کہ خلیجی ممالک میں کام کرنے والوں کے حیدرآبادی متعلقین اور افرادِ خاندان کو جب موقع ملے یہ ضرور بتائیے کہ ان کا بیٹا بھائی یا شوہر وہاں بہت محنت کر کے پیسہ کماتا ہے ــــ یہاں رہ کر نازیبا فرمائشوں کا بار اس پر ڈالنے سے اجتناب کرنے میں انھیں کے مستقبل کی ضمانت ہے۔

جب وہ' یہ کہہ رہا تھا تو اس درجہ متاثر تھا کہ میں اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو اس کی آنکھوں کی نمی میں تلاش کرنے پر مجبور تھا۔

شاذ کے انتقال کے بعد مجھے یاد ہے' وہ کتنا دلگیر تھا ــــ جب وہ بیگم شاذ سے مل کر جدہ کی بزم اردو کی جانب سے کیسہ زر کی پیشکشی کے لئے آگے بڑھا تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ انور معظم تسلی دے رہے تھے ــــ اس ایوارڈ کا اعلان جدہ میں ڈاکٹر انور معظم کی پذیرائی میں رکھی گئی ایک تقریب میں ہوا تھا۔

سوچتا ہوں حسن چشتی کے اس کوچہ دلبر کی بات آخر آخر میں بچھڑوں جس کوچہ شعر و سخن سے اس نے خود اپنے نقش پا اٹھا لئے لیکن ۱۹۸۸ء میں دہلی کی عالمی کانفرنس میں علی سردار جعفری نے اس کی گلپوشی کی اور علی صدیقی نے اسرار الحق مجاز عالمی ایوارڈ اس کو پیش کیا تو اس نے بھی کس دل سے اپنی زندگی کی ان پھلواریوں میں سارے سن و سال کے

اثاثے کے ساتھ گشت کی ہوگی جب شعروادب اس کا اوڑھنا بچھونا تھے اس نے یادوں کے خاروگل ایک ساتھ سمیٹ لئے اور کانفرنس میں شعر سنائے۔

ویسے اب بھی وہ بزم اردو جدہ کا سابق صدر تھا تو اپنے انمٹ کئی نقوش سعودی عرب کی فلاحی ثقافتی، معاشرتی اور ادبی تنظیموں کی صورت میں چھوڑ کر اپنے بچوں کے اصرار پر شکاگو جا پہونچا ۔۔۔۔ عمر کی اس منزل میں جب تھکا دینے والی محنت آسودگی کا ڈھکا چھپا مطالبہ کرتی ہے اس نے سوچا تو یہی تھا کہ کچھ اپنی طرف بھی نظر کرے ۔۔۔ لیکن وہ اضطراب طبع جو ہوتے ہوتے اصل مزاج بن گیا، اسے نچلا بیٹھنے بھی تو دے۔ شکاگو پہنچا تو

INDINNON RESIDENT ASSOCIATION

کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے پھر اپنے ہم وطنوں کے مسائل کی گتھیاں سلجھانے کی سعی کرنے لگا۔ اور ۲۸ تا ۳۰ ڈسمبر دہلی میں منعقدہ سیرت النبی بین الاقوامی کانفرنس میں اس نے امریکہ کے واحد مندوب کی حیثیت سے شرکت کی اس کانفرنس کے انعقاد کی سعادت حاصل کرنے کا جذبہ صادق بھی عالمی اردو کانفرنس کے حصے میں آیا۔

حسن چشتی کے بڑے چھوٹے سارے ہی رفاہی کاموں کا احاطہ کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے اور اب اس دفتر کی بستہ کشائی ممکن نہیں۔ جب تک حیدرآباد میں رہا یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے دکھ بیماری میں اعانتی مشاعرے منعقد کروانے کے جتن کرتا رہا ۔۔۔۔

کینسر کے موذی مرض میں طالب رزاقی کی اعانت ایک ایسے مشاعرے کے انعقاد سے کی جس میں صرف شاعرات نے کلام سنایا اور آواز کا جادو جگایا۔

سچ تو یہ ہے کہ وطن سے دور ہونے کے بعد جب زینت بھی اس بے وطنی میں اس کے ساتھ ہو گئیں تو اس کے پاس شعر و سخن کے سرمائے سے زیادہ وسیع، وہ کار بخیہ گری ہی سرمایۂ جاں ٹھہرا جو اپنا آپ مٹا کر دوسروں کی ریزہ ریزہ شخصیت جوڑتا ہے اور انھیں توانائی بخشنے میں سکون پاتا ہے۔

وہ دل لگا کر شاعری کرتا اور ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتا تو میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آج جن بلندیوں تک پہنچ کر وہ چھلانگ لگاتا اور دلوں میں اتر آتا ہے وہاں تک اس کی رسائی شعر کے راستے سے ہوتی کہ نہیں لیکن کچھ زادِ سفر ایسا تو ساتھ ہوتا جو شعر و سخن میں بھی اس کی شناخت اور پہچان بن سکتا ــــــ اس کی اٹھان ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے اس ہنر سے اس درجہ چشم پوشی کرے ــــ اس نے نظم و نثر دونوں ہی سے اپنے صحت مند تخلیقی رشتے کا جواز فراہم کیا تھا اور شاعری کے علاوہ وہ مضامین بھی لکھتے تھے جو شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

"سہیل عظیم آبادی چند یادیں" ــــــ پروفیسر ضیاء الدین انصاری" وغیرہ ساحر لدھیانوی حسن چشتی کے خلوص سے متاثر تھے۔ وہ بھی ساحر کی شخصیت اور شاعری کا گرویدہ تھا۔ ۱۹۵۸ء میں ساحر ہی کے مشورہ پر اس نے ماہنامہ آکاش کا اجرا کیا تھا۔ اس کی اختتامی تقریب کی صدارت ساحر نے ہی کی تھی اور وہ حسن ہی کے پاس مقیم تھے۔

شاعری حسن چشتی کے لئے ذریعۂ عزت نہ بن سکی۔ اس لئے کہ درونِ دل جو ہنگامہ ہائے غم والم شاعری کا مسالہ اکٹھا کرکے تخلیق کے لئے اکساتے ہیں وہ اس کی شریکِ حیات زینت کے ہاتھوں بے بس ہوکر فرط و انبساط بن گئے تھے — حسن چشتی ذہن و دل کے معاملہ میں چونکہ کھرا کھرا ہے، اس نے تفریح و تفنن کیلئے فنِ شعر کو رسوا کرنا گوارا نہیں کیا — اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ دردمندی وہ انسان دوستی، وہ آنسوؤں کی کھار سے لذت کوشی کا سلیقہ اس کی افتادِ طبع کو جھوٹ موٹ شعر کہنے پر مائل نہ کرسکا۔ دل پر کوئی چوٹ پڑی تو اس نے زخم چھپا لئے۔ اور بلک اٹھا — شاذ تمکنت اس کا اسکول کا ساتھی تھا۔ شاذ کی رحلت پر حسن چشتی نے کہا —

پہنچا دکن تو کوچہ و بازار تھے اداس
حیراں تھے چارہ گر در و دیوار تھے اداس
شہرِ وفا کے سارے ہی غمخوار تھے اداس

منظر بڑا عجیب تھا جب اس کے گھر گیا
معلوم یہ ہوا کہ مرا شاذ مر گیا

وہ میرا ہم سبق، مرا ہمدم، وہ میرا شاذ
جو رہ گھٹا تھا مجھ سے بہت کم وہ میرا شاذ

زلفِ سخن سنوار کے خاموش ہو گیا
دن تھے ابھی بہار کے خاموش ہو گیا
دیوانہ تھا پکار کے خاموش ہو گیا

اب اوڑھ کر سفید کفن شاذ تمکنت
چپ ہوگیا ہے جان چمن شاذ تمکنت

وہ بھی دن تھے جب شعر و سخن کے کوچے میں راہ نوردی کے شوق فزوں نے اس سے اپنی مایوسیوں کا اعتراف ہلکے پھلکے صاف ستھرے لہجے میں یوں کیا تھا ؎

جب سے بدلی نگاہ یار حسن
زندگانی کا اعتبار نہیں

اُف یہ محرومی کہ منزل نے دیئے لاکھوں فریب
گرد راہِ کارواں کو کارواں سمجھا تھا میں

پھر وہ خود کو دلاسہ دیتا ہے اور اپنی شکستگی کا مداوا امید و بیم کے دوراہے پر اس تسلی میں تلاش کرتا ہے۔

تری نگاہ کرم ہے تو پھر کمی کیا ہے
ترے نثار مجھے فکر زندگی کیا ہے

فکرِ زندگی کے جواز اور عدم جواز کو شاعرانہ تصلیوں سے ہٹ کر حسن حشی نے ایسی راہوں کے حوالے کر دیا جو منزل کے شوق فضول سے گریزاں ہو کر بھی قدم قدم پر جادہ منزل کو پانے اور کھونے کے کاروبار سود و زیاں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

پھر کوئی آبلہ پا گرم سفر ہے شاید
دشت کے نام بہاروں کا سلام آیا ہے

جانے کیوں جانب منزل نہیں اٹھتے ہیں قدم
شاید اے دل کوئی دشوار مقام آیا ہے

مجھے حسن چشتی کے شعری وجدان پر اس لئے زیادہ بات کرنی نہیں ہے کہ
اس نے اس کوچے کی گرد آشنائی کو اپنی عمر عزیز کا افضل ترین حصہ بھینٹ
کیا اور زندگی کی جدلیات کو زیادہ باعمل میدانوں میں تلاش کرنے کے لئے
نکل پڑا۔ اس نے اپنے غم سے بڑی دیانت داری کے ساتھ نباہ کیا۔ اور اُس
شاعر کو جو اُس کے اندر پرورش پا رہا تھا جوانی کے عنفوان ہی میں اظہر خموشی کی
تہذیب سکھلا دی ـــ اس کے دل محزوں نے اس آتش کو عزیز جاں بنا کر
قلب کی وسعتوں میں چھپا لیا۔ اب یہی چنگاری اس کو جھلساتی رہی کہ اپنا
درد دوسروں کے دلوں میں تلاش کرے۔

حسن خود اپنے ہی سوانحی خاکے میں معترف ہے۔

"بہار کے ایک اوسط گھرانے میں اکتوبر ۱۹۳۳ء کی پندرھویں تاریخ
کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوا۔ ہائی اسکول کی طالب علمی کے
بعد فطری میلان ادب کا طالب علم بننے پر مجبور کر رہا تھا لیکن معاشی
حالات کو مستحکم کرنے کے خیال نے ملازمت پر مجبور کر دیا ـــ ملازمت کے
ساتھ ساتھ اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کے لئے اخبارات اور رسالوں میں کام
کرتا رہا ـــ چند دنوں تک ادبی ماہنامہ پاسبان اور پھر آکاش
کی ادارت کے فرائض انجام دیئے ـــ اسی دوران ماحول کچھ سنجیدہ اور
ناسازگار تو تھا ہی ـــ قدرت نے رنگینی کے بھی کچھ سامان فراہم کر دیئے

اور میں اپنی شاعری کو زادِ سفر بنا کر ایک حسین سے دھارے میں بہنے لگا ـــــ لیکن بہت جلد یہ دھارا ایک سنگین چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ـــــ میں چونک سا گیا ـــــ شاید میری شاعری کو بہاؤ سے زیادہ سوز کی ضرورت تھی۔ اس طرح زندگی کے ان ناہموار راستوں سے گذرنے کی وجہ سے میری شاعری کی رفتار بہت سست رہی۔

۱۴ اکتوبر ۷۵ء کو میری زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ میری کھوئی ہوئی محبت تو نہیں ایک نئی محبت مجھے مل گئی جو اب میرے گھر کی زینت ہے۔"

میں کہوں کہ حسن چشتی کی سنجیدہ انفعالیت کو اس کے گھر کی زینت نے ہی ایک فعال شخصیت کا روپ دے کر اس کے ہم وطنوں کے حوالے کر دیا کہ وہ نہ جانے کتنے ہی دلوں کی زینت بنتا ہے۔

••

اقبال متین

سن برج ہاؤز کے شمس

آمد ۲۷/مئی ۱۹۰۱ء — ۲۷/فروری ۱۹۹۴ء رخصت

میرے اس مضمون کا "اختصار" روزنامہ "رہنمائے دکن" مورخہ ۱۱/اپریل ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ "رہنمائے دکن" نے "سن برج ہاؤز کے شمس" سرخی لگائی تھی۔ یہ عنوان مجھے پسند آیا۔ جس کو میں اخبار موصوف کے شکریے کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔

مولانا ابراہیم ہارون سیٹھ

اللہ میاں مٹی سے پتلا بنا کر اس میں روح پھونک دیتے ہیں۔ ننگ دھڑنگ آدمی بلکتا، بسورتا، دنیا میں آکر جب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دنیا کو دیکھتا ہے —— ڈرتا ہے، روتا ہے پھر خوش ہوتا ہے، کلکاریاں لگاتا ہے تو اس کی بصارت اس کیلئے سوچ کے راستے فراہم کر کے اس کو نت نئے تجربوں سے گذارتی ہے اور اسطرح عمر کے ساتھ ساتھ اس کے شعور کی گرہیں کھلتی اور الجھتی ہیں اس الجھنے اور سلجھنے کا عمل آہستہ آہستہ اس کو شعور اور بصیرت عطا کرتا ہے اور اس کی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ شخصیت کا تشکیل پانا اتنا آسان نہیں ہے —— بے شمار لوگ پیدا ہوتے ہیں اور عمر کی کئی منزلوں سے اسطرح گذر جاتے ہیں کہ انھیں نہ راستے کا پتا چلتا ہے نہ زندگی کے کسی موڑ کا، نہ سنگ میل کا نہ نردبان کا جو منزل کی نشان دہی کر رہا ہو۔

سارے سپاٹ راستے، سارے یکساں مناظر زندگی بھران کے پاس نہ کبھی اوبڑ کھابڑ ہوتے ہیں نہ اپنی یکسانیت کھوتے ہیں۔ وہ مطمئن مطمئن بھی رہتے ہیں اور اپنی فتح و کامرانی کو چھوٹی بڑی نعمتوں کے حصول کا جواز بنا کر اتراتے ہیں۔ لیکن اس مٹی کے پتلے کی رگوں میں جب اللہ میاں پارہ بھی چھپا دیتے ہیں تو اس پتلے کی شناخت اس کے "پالنے" یا جھولے ہی سے فراہم ہونے لگتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہارون بھائی نے اپنی شناخت لڑکپن ہی سے بڑی تیزی سے فراہم کی۔

میں ہارون بھائی سے اس وقت قریب ہوا جب ان کو سب کچھ حاصل تھا ـــــ لیکن اپنی سب سے زیادہ قیمتی شئے وہ کھو رہے تھے ـــــ بینائی اور توانائی ـــــ ہارون بھائی نے بھی بڑی تیزی سے مجھے اس طرح اپنایا کہ میں فاصلے نہ ناپ سکا اور اتنا کا ہو رہا۔ صرف اخلاص ہی نہیں دیا، محبت دی۔ ہر لحاظ سے مجھ ہیچ مداں سے بڑے رہ کر بھی مجھے محترم سمجھا۔ کبھی ملنے جاتا اور بینائی شناسائی کے لئے مانع ہوتی تو پھر پہچانتے اور جب پہچان لیتے تو باچھیں کھل جاتیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ لیکر سینے سے لگا لیتے۔ جب تک رہتا اپنے قریب رکھنے کے جتن کرتے۔ ہارون بھائی سچ کہتا ہوں آپ یاد آتے ہیں اور جب یاد آتے ہیں تو میں آج سوچتا ہوں کہ آپ کی عظمتوں کو میں نے دل ہی دل میں اس وقت تسلیم کر لیا تھا جب کہ آپ کا ماضی میرے سامنے بالکل نہیں تھا۔ آج آپ کے ماضی کے ساتھ آپ کی ڈھکی چھپی عظمتیں سامنے آئی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے جاتے جاتے میری نگاہ کو کیا کیا اعتماد عطا کیا۔

میری بھانجی سیدہ سیما ایم اے کرنے کے بعد لکچرار ہوئی تو ہارون بھائی کے چھوٹے فرزند انور ہارون سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی۔ انور میاں میں ہارون بھائی کے اوصاف کی جھلکیاں صاف دیکھی جا سکتی ہیں۔ پیشہ تجارت کے صبر آزما بلند و پست کا ادراک انور کے مزاج کا حصہ صرف اسی لئے بن سکا کہ انھوں نے بھی اپنے والد محترم کو جنگ عظیم کے بعد جن صبر آزما مرحلوں سے گزرتے دیکھا، ان لمحوں میں اپنے معصوم وجود کو شامل کر لیا۔ ان دنوں وہ بہت نو عمر تھے۔ جنگ عظیم سے میری مراد دوسری جنگ سے ہی ہے جو ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی تھی اور ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔ انور دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے ایک سال بعد تولد ہوئے اور آنکھیں کھولیں تو ہارون بھائی کا صبر دیکھا، تحمل دیکھا، طہارت و عبادت دیکھی۔ ان کے بڑے بھائی علی میاں نے بھی اپنے والد کا عملی طور پر ممکنہ ہاتھ بٹایا۔

وہ سن برج ہاؤز جس کا کبھی طوطی بولتا تھا کچھ اسطرح سناٹوں کی د میں آیا کہ چودہ پندرہ سال ہارون سیٹھ نے بھائیں بھائیں کرتی منگی بہر صورت وزانہ کھولی جیسے ویرانیاں بھی کوئی "یکادشے" ہیں اور ہمت نہیں ردی۔

سن برج دراصل جان گرینشں کمپنی کا تیار کیا ہوا ایسا نایاب ربے مثال کپڑا تھا جس کی اس زمانے میں بے حد مانگ تھی۔ ۱۹۳۳ء کے تے آتے ہارون سیٹھ اس کپڑے کے ہول سیل ڈیلر بن گئے۔ اپنی تجارتی یانتداری کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ اور استحصال سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ اللہ

نے آرام و آسائش کے دن دکھائے تب بھی ہارون سیٹھ نے وقت کی نزاکتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اعتدال پسندی، تحمل، محنت اور محبت جیسا کہ میں نے دیکھا ہے ان کے مزاج کا ایسا وصف تھا کہ جو بھی ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ پیشہ تجارت میں یہی ہنر ان کی کامیابی و کامرانی کا باعث ہوا۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد جب باہر سے کپڑا درآمد کرنے کے امکانات بہت تیزی سے ختم ہوئے تو دیکھتے دیکھتے سن برج ہاؤز کے سارے شوکیس SHOW CASE اسی تیزی سے خالی ہو گئے۔ ہارون سیٹھ نے جو چیز جس قیمت پر خریدی تھی اس پر کبھی نامناسب منافع کی طمع نہیں کی نہ پونجی بٹوری نہ تجوری بھری۔

یہاں اس مضمون کے موضوعات کو میں اتنی وسعت نہیں دے سکتا کہ ان کے سیاسی و ثقافتی نظریات پر بات کروں جن میں ہندوستان کی مسلم اقلیت سے انکی دیانتدارانہ انسیت معرض بحث میں آسکے کہ طوالت مانع ہے۔

مسلم انفارمیشن بیورو کے اس مرد مجاہد اور عالم باعمل کی سیاسی بصیرت پر انھیں کے بے شمار مضامین کو ملحوظ رکھ کر میں ایک طویل مضمون کے تانے بانے بن رہا ہوں جس سے آپ پر روشن ہو جائے گا کہ مولانا ام'امی' ہارون نے اپنی سیاسی بصیرت کو ملت اسلامیہ کی زبوں حالی کے خلاف ہتھیار بنا کر کیسے نازک مواقع پر استعمال کیا ہے۔ لیکن ان کی انفرادی آواز ایوان سیاست میں اسلئے ہل چل پیدا نہ کر سکی کہ وہ میدان سیاست کے باعمل راہی نہیں تھے۔ نہ کوئی پارٹی ان کے پیچھے تھی نہ کوئی کاروان سیاست ان کے آگے۔ اگر وہ عملی طور پر سیاست میں شامل ہو جاتے تو شاید ہندوستان میں مسلم اقلیت کی باشعور اور بھرپور نمائندگی کرنے والے رہنمایان قوم میں

شامل رہتے جو سچ پوچھئے تو آج عنقا ہیں۔

میں نے مولانا ہارون کا ایک بہت ہی تیکھا مضمون جس کا عنوان تھا "قائد اعظم۔ ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر" پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد کو ان کے ماہنامہ سب رس کراچی کے لئے بھجوایا تو میں جانتا تھا کہ پروفیسر خواجہ شاہد صاحب اپنی وسیع النظری کے باعث موضوع کے تیکھے پن کو بھی نفس مضمون کی سچی اندرونی آواز کے پیش نظر قبول کرلیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے طویل خط میں مجھے لکھا۔

ہارون صاحب کا مضمون چھاپ رہا ہوں۔ اس کا عنوان بڑا "نوکیلا" ہے۔

یہ مضمون دراصل ارون شوری ایڈیٹر انڈین ایکسپریس کے محمد علی جناح پر ایک مضمون کے جواب میں تھا جو ٹائمز آف انڈیا کے ۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۵ء کے دہلی ایڈیشن میں چھپا تھا۔ اس مضمون میں جناح کو ہندوستان کے ٹکڑے کرنے والی شخصیت قرار دیا تھا۔ اس مضمون کا مولانا ای ہارون نے اس قدر مدلل جواب دیا تھا کہ ان کی حوصلہ آمیز بصیرت کے آگے جناح پر لگائے ہوئے اتہام کا کوئی جواز ہی نہیں رہ جاتا۔

چنانچہ پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد نے یہ مضمون مجھ ناچیز مدان کے تعارفی و اعترافی کلمات کے ساتھ شائع کیا، جن کا تعلق صرف ہارون صاحب کی ذات سے تھا۔

میں یہاں مولانا ای ہارون کے صرف دو جملے بطور اقتباس اپنے اجمالی اعترافات کے ساتھ پیش کررہا ہوں:

میں نے کبھی لکھا تھا ـــــ مولانا ہارون کا دکھی دل اپنی قوم کے لئے ایسے خشک آنسو بہاتا ہے جو قطرہ قطرہ اپنے ہی سینے میں لہو بنکر ٹپکتے ہیں اور پھر زخم

بن جاتے ہیں۔ ان زخموں کی بخیہ گری کا ہنر وہ جانتے ہیں کہ ان کے قلبی اضطراب کو تسکین کی کوئی صورت نہیں ملتی اور اس لئے نہیں ملتی کہ ان سوالات نے جوان کے ذہن سے اپنی قوم کے بے محل طریقۂ حیات کے باعث ان کی آسودگی چھین لی ہے۔ ان کا جواب انھیں اپنی قوم کی اکثریت کے کردار سے نہیں ملتا۔ کس دردمندی سے وہ اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"قرآن کے ساتھ مسلمانوں کا جو سلوک ہے اس سے اندیشہ ہے کہ انعاماتِ الٰہیہ کا وعدہ کسی اور کے لئے مقدر نہ بن جائے"

دیکھئے اس ایک ہی جملے کی ہمہ گیر تہہ داری ان کے دل کے زخم ہرے کئے ہوئے ہے کہ نہیں۔

ایک اور جگہ انہوں نے اپنے آنسو اس طرح چھپائے ہیں:

"سوال یہ ہے کہ وہ عالم قرآن ہمارے دل و جان سے کیوں جلوہ گر نہیں ہوتا"

اس بلیغ ترین جملے کی کیا کیا مدح سرائی کی جائے۔ مجھ جیسے گناہگار در مرکبِ عصیاں شخص کی نگاہیں جب انسانی رفعت کی تلاش و جستجو میں اپنے ہی پابند صوم و صلوٰۃ گنے چنے افرادِ خاندان اور احباب پر پڑتی ہے تو میں جی محسوس کرتا جاتا ہوں کہ یا اللہ، قرآن گھروں میں کہیں جزدان کی زینت ہے، کہیں رحل پر بھی کھلا ہے، کہیں تلاوت بھی جاری ہے اور پیشانیوں پر سجدہ ریزی کے نشانات بھی جلوہ گر ہیں لیکن تیری بارگاہ میں حاضری دینے والوں کے لئے یہ کیسے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مرحلے میں جھک کر دیکھنے کو کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ یہ جان کر بھی کہ زمین پر تیری ہی مخلوق رہتی ہے لیکن

ان کا تکبر تجھ سے قربت کے احساس پر بنی نوع انسان سے، انھیں ان کی دانست میں ممیز کئے ہوئے ہے اس موضوع کو جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے بعد کے لئے اٹھا رکھتا ہوں کہ فی الوقت مجھ پر یہ احتساب لازم ہے۔ اب صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مولانا اپنے معبود حقیقی سے امت رسول کے لئے مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی زبان میں یوں گڑگڑاتے ہوئے لگتے ہیں۔ ؎

صد رفیق و صد ہم دم پر شکستہ و دل تنگ
داورا کمی زیبد بال و پر بہ من تنہا

مولانا ہارون بھائی اپنے عنفوان شباب ہی سے اپنی فعالیت کا بوجھ ہنستے بولتے اٹھائے ہوئے تھے۔ انھیں شدید احساس تھا کہ اضطراب زندگی کی رفعتوں کو سر کر لینے کا پہلا زینہ ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ عابڈس جیسی قلب شہر کی سب سے نمایاں تجارتی آماج گاہ کی صرف صورت پذیری نہیں بلکہ اس کے وجود کا پہلا پتھر ہارون سیٹھ ہی نے رکھا تھا اور پھر اپنی پُرکشش شخصیت کے مقناطیسی اثر سے اس بازار کو حیدرآباد کا دل بنا کر رکھ دیا تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

عابد شاپ پہلے مصطفے بازار کے نام سے پہچانا جاتا تھا لیکن جلد ہی اس کو عابڈس (عابد کی شاپ اور پھر عابد روڈ) کے نام سے شہرت ملی - ۱۹۳۳ء کے قریب جب ہارون آدم کمپنی کا قیام عمل میں آیا تو سن برج ہاؤز کے نام سے ہارون سیٹھ کی دوکان مقبول ہونے لگی۔ ہارون سیٹھ نے ساتھ کے سربرآوردہ تاجروں میں ایک ایک کو ہموار کیا اور "عابڈس" کی رونق میں دیکھتے ہی دیکھتے چار چاند لگنے لگے۔ میر حسن کپڑوں کی دوکان اور ڈپارٹمنٹل اسٹورس، جے اے کریم

کپڑے اور ڈپارٹمنٹل اسٹور جب عابڈس کی رونق میں شامل ہو گئے تو ہارون سیٹھ نے للتا پرشاد جوہری اور اس وقت کے مشہور و منفرد دوا ساز عبدالرزاق سے اصرار کر کے دو دکانیں قائم کروائیں۔ اس وقت کے مشہور فوٹو گرافر "ہانا گراف" کی دوکان کا آغاز جب "عابڈس" پر ہوا تو گیزی نامی ایک شخص اس دوکان کا منیجر تھا۔ ہانا گراف کے کاروبار بنگلور میں جمے ہوئے تھے لیکن وہ ہارون سیٹھ کے دوستوں اور مداحوں میں تھا۔ ان کے اصرار پر انکار نہ کر سکا۔ چنانچہ گیزی ہانا گراف کی دوکان کی کنجی اور رقومات ہارون سیٹھ کے پاس رکھ دیا کرتا۔ ہارون بھائی کے بڑے بھائی ایوب ہارون صاحب بھی پیشہ تجارت ہی سے وابستہ تھے لیکن انکا کاروبار حیدرآباد میں نہ تھا۔

عابد یہودی نسل کا جیو JEW تھا۔ حالیہ پیلیس ٹاکیز کے سارے احاطہ میں اس کا برف کا بڑا کارخانہ تھا۔ اس کے علاوہ ڈپارٹمنٹل اسٹور بھی تھا۔ بیرونی حصہ میں اس کی متعلقہ دوکانوں کی قطار حالیہ جی پی او کی بائیں جانب ساگر ٹاکیز کے رُخ پر دور تک چلی گئی تھی اور یہ سارا علاقہ عابد روڈ کہلانے لگا تھا۔

۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء سات سال سے زائد عرصے تک جاری رہنے والی دوسری جنگ عظیم نے ساری دنیا کے معاشی نظام کو معاشرتی توانائی کو اخلاقی اقدار کو سب کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ مولانا ہارون سیٹھ کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ سن برج ہاؤس بھائیں بھائیں کرتا تقریباً پندرہ سال تک ہچکیاں لیتا رہا۔ لیکن ہارون سیٹھ نے ہار نہیں مانی۔ انھوں نے

ان دنوں مختلف دواؤں کی کمپنیوں کی ایجنسیاں حاصل کیں۔ U.S. VITAMIN CORPORATION یو ایس وٹامن کارپوریشن اور ڈان اینڈ کو کی دوائیں لئے پھرتے۔ اسکول آتے جاتے، بچوں کو ان کے خوش نما تشہیری اسٹیکرس دست بدست ایک ایک کو تقسیم کرتے اور بچے خوشی خوشی اپنی نوٹ بکس اور کتابوں پر چسپاں کرتے۔ یہ ہارون بھائی ہی کے ذہن کی اختراع تھی اور اسطرح ان معصوم دوستوں نے ان کے لئے مسرتیں فراہم کیں۔ ہارون سیٹھ نے دواؤں کے لٹریچر کا بغور مطالعہ کرکے ڈاکٹروں سے اتنا ربط بڑھایا کہ انکی افہام و تفہیم کی صلاحیت، انگریزی پر عبور اور مثالی انداز اظہار سے ان دنوں کے چوٹی کے ڈاکٹر ان کے قدرداں اور دوست ہو گئے۔

ہارون سیٹھ سیکل پر دوائیں لئے حیدرآباد اور سکندرآباد کے چکر لگاتے اور محنت شاقہ سے جی نہ چراتے۔ یہ سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ ان کے چھوٹے بیٹے انور امی ہارون بھی زمانہ طالب علمی سے اپنے والد محترم کا ہاتھ بٹانے لگے۔ انٹرمیڈیٹ میں پڑھتے اور ۱۹۶۵ء میں دواؤں کی مشہور کمپنی "افالی" میں دواؤں کی تشہیر و فروخت کا کام انجام دیتے۔

کچھ دن پہلے رحمت علی صاحب صدر اردو اکاڈمی آندھرا پردیش سے ملنے کیلئے میں اردو اکاڈمی گیا تھا تو مجھے خیال آیا کہ میاں انور ایک بار ہارون بھائی سے رحمت علی صاحب کے تعلق خاطر کا ذکر کر رہے تھے۔ رحمت علی اتفاق سے اکیلے بیٹھے ہوئے تھے ورنہ وہ لوگوں میں گھرے رہتے ہیں۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور مولانا کی بات چھیڑ دی۔

یادوں کا سہارا لیکر رحمت علی کچھ دیر کیلئے ہارون سیٹھ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ کہنے لگے میر حسن صاحب میرے رشتوں کے تایا تھے۔ اس زمانے کے بڑے تاجروں میں تھے "عابڈس" پران کا ڈپارٹمنٹل اسٹور تھا جہاں کشمیری قوام سے لیکر ضروریات کی دوسری چیزیں سب ہی مل جاتی تھیں۔ عابڈس کی روح رواں کے طور پر جو بڑے نام تجارت کے زمرے میں لئے جاتے تھے انھیں میں ہارون سیٹھ کے ساتھ میر حسن کا نام بھی جڑا ہوا تھا۔ ہارون سیٹھ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اہم ترین ہم پیشہ مہروں کو "عابڈس" کی دیدہ زیب اور پرشوکت حلقہ تجارت کا اس طرح حصہ دار بنایا کہ عابڈس جگمگانے لگا۔

رحمت علی صاحب نے اس بات کی توثیق کی کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ۱۹۴۲ء کے لگ بھگ ہارون سیٹھ کو ان صبر آزما گھڑیوں نے للکارا جبکہ بڑے بڑے جانبازوں کے پاؤں کارزار زندگی میں اکھڑ جاتے ہیں۔ لیکن ہارون سیٹھ نے اس مجاہدے میں گلشن زیست کی آبیاری کی۔

منہ میں پان کی گلوری، شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے اس وضع قلندرانہ میں بھی حیدرآبادی تہذیب کو رومی ٹوپی کی صورت میں سر پر اٹھائے رکھا اور سیکل پر حیدرآباد سے سکندرآباد اور سکندرآباد سے حیدرآباد چکر لگاتے رہے۔ اپنی محنت شاقہ سے اپنے بڑے دلوں کو زیر کیا۔ کسی کام سے عار نہیں کیا۔ وہی پندار وہی توازن طبع جھک کر ملنا شعار تھا۔ دب کر ملنا آیا ہی نہیں۔ کیسے آتا بھلا، جو شخص مسند چھوڑ کر پیدل چل پڑے اور پھر پاؤں کی گرد جھاڑ کر مسند نشیں ہو جائے اس کے پاس کوئی اونچ نیچ نہیں رہتی۔

رحمت علی صاحب نے چنانچہ بتلایا کہ بڑے بڑے بزنس کے لوگوں سے

ان کے مراسم تھے لیکن وہ کسی سے ایک پیسے کے روادار نہیں رہے۔ الٹے بند مٹھی کا بھرم رکھا، ضرورت مند لوگوں کی مدد کرتے اور اسطرح کرتے کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوتی، اپنی کاروباری مصروفیات کے علاوہ سماجی بھلائی کے کاموں میں بھی سرگرم حصہ لیا کرتے۔ مذہبی نیک اور صالح آدمی تھے۔ اور صالح معاشرہ کی تشکیل کے لئے بے آرام رہتے تھے۔ پندرہ برس خالی پڑی ہوئی دوکان بھی روزانہ برابر کھلتی تھی اور ملگی کا کرایہ ہر ماہ پابندی سے ادا کرتے تھے۔

۲۸/دسمبر ۱۹۵۲ء کو محصول پیشہ کے خلاف ایک ہڑتال منظم کی۔ رحمت صاحب نے دلچسپ باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد کی تاریخ میں پہلی بار ساری دوکانیں بطور احتجاج بند رہیں۔ گاندھی بھون سے جلوس نکالا گیا جو دیوان دیوڑھی پر جلسہ عام میں تبدیل ہوا تو ہر قسم کے پیشے سے تعلق رکھنے والوں نے اس جلوس میں شرکت کی۔ یہاں تک کہ محبوب مہندی کی کسبیاں اور رقاصائیں بھی تھیں۔ انھیں دیکھ کر زنخے بھی شامل ہوگئے تھے۔ پبلک کا اس قدر اژدہام تھا کہ سڑکیں پٹ گئیں تھیں۔ جلسے کو ہر پیشے سے تعلق رکھنے والوں نے مخاطب کیا۔ ہارون سیٹھ کی تحریک پر جب ایک زنخا مخاطب کرنے کے لئے شہ نشین پر آیا تو اجتماع قہقہہ زار بن گیا۔ اس زنانے نے جو گریجویٹ تھا۔ مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے لوگو مجھ پر کیوں ہنستے ہو اس حکومت پر قہقہہ لگاؤ۔ جو میری کمائی کھالے گی۔ کیونکہ اس نے مجھ پر بھی ٹیکس لگا دیا ہے اور مجمع کے آگے جھک کر زنخے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کوٹھے اور دھوپڑ پیٹ لئے۔ مجمع نے حکومت کے خلاف شرم شرم کے نعرے لگائے۔ جب وفد جس میں مرحوم ہارون سیٹھ

بھی میر اور پریسیا نڈنگ کمیٹی کے چیرمین سے ملنے گئے تو اسٹانڈنگ کمیٹی کے چیرمین CHAIR MAN نے محصول پیشے کے قانون پر نظر ثانی کا بھرپور تیقن دیا۔ اور نخوں کو محصول پیشے سے مستثنیٰ قرار دینے کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں ہڑتال کے سبب بہت ساری مراعات حاصل ہوئیں۔

رحمت علی صاحب نے بتلایا کہ اس زمانے میں وہ بھی پیشہ تجارت سے راست وابستہ تھے۔ ان کا ہوٹلس کا کاروبار تھا اور وہ ہوٹلس اونرس اسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری تھے اسی پیشہ ورانہ یگانگت نے انھیں ہارون سیٹھ کے زیادہ قریب ہونے کے مواقع دیئے۔ چنانچہ سارے بیوپاریوں نے مل کر جب دھندے داری سبھا قائم کی تو ہارون سیٹھ کو سبھا یعنی HYDRABAD TRADE ASSOCIATION کا جنرل سکریٹری نامزد کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہارون سیٹھ علیگڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے اور انگریزی زبان کے بہت اچھے مقرر تھے۔ خود رحمت علی بھی اردو کے اچھے مقرر ہیں۔ وہ بھی ہوٹلس اونرس اسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری تھے اسی یگانگت اور تعلق خاطر نے پیشے کی تہذیب کے رشتے سے استواری حاصل کی ہوگی۔ فعالیت دونوں کے مزاج کا وصف تھا یہ سچ کیا اپنی جگہ اہم نہیں ہے کہ۔

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

اللہ مولانا ہارون بھائی کو غریق رحمت کرے۔ جس کسی نے ان کا نام لیا اچھائیوں میں لیا، احترام سے لیا۔ مختصر یہ کہ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

شخصیّات

نادیدہ

اقبال متین

کہانی بغیچے سے اڑی بلبل کی

(سروجنی نائیڈو)

آمد: ۱۳ فروری سنہ ۱۸۷۹ء — یکم مارچ ۱۹۴۹ء رخصت

امی کہتی تھیں کہ سروجنی دیوی کا رنگ کم تھا لیکن چہرے پر ایسی موہنی، نمک اور ملاحت تھی کہ نواب خاندان کی گوری چٹی بیگمات انھیں اپنی نظروں میں چوری چوری بھر لیتیں۔ امی عمر میں سروجنی دیوی سے بہت چھوٹی تھیں۔ لیکن ان کی جوانی کی قسم کھاتی تھیں۔

میرے تایا بیرسٹر اکبر علی خاں کے گھرانے سے سروجنی دیوی کے اس درجہ مشفقانہ تعلقات تھے کہ سروجنی دیوی کے اس التفات کو مادرانہ تعلق خاطر کہا گیا۔ تایا ابا کے گھر آتیں تو اپنائیت کا یہ حال کہ بیگم اکبر علی خاں سے کبھی یہ بھی پوچھ لیتیں کہ بٹیا تو نے کیا پکایا ہے ——— لے آ۔ بھوک لگی ہے مجھے، اور وہ باورچی خانے کی طرف لپکتیں۔

بیرسٹر صاحب جو پہلے یوپی کے، پھر اڑیسہ کے گورنر رہے۔ ان کا کہنا

ہے کہ اخلاص و محبت کے جذبات کی تشکیل و تجسیم کا نام سروجنی نائیڈو ہے۔ وہ انھیں ماں کہتے تھے ــــ ایسی ماں جس نے اپنے بچوں کو شعور و آگہی کے راستے سجھائے ضرور لیکن جبراً متعین نہیں کئے ــــ آزادیٔ فکر و نظر پا بجولاں نہیں ہوئی ــــ وہ بلا شبہ جمہوریت کی علمبردار تھیں۔ ان کی بیٹی پدما جا نائیڈو کے ساتھی، رفیق کار، ہم نوالہ و ہم پیالہ بیرسٹر اکبر علی خان، سروجنی نائیڈو کے بیٹے تو تھے ہی اور چہیتے بیٹے تھے۔ سیاسی نظریہ انداز فکر، اقلیم سیاست میں ایک ایسی ردا اوڑھے ہوئے تھا جو تینوں میں مشترک تھی۔ سروجنی نائیڈو میں بھی، پدما جا نائیڈو میں بھی اور بیرسٹر صاحب میں بھی۔ اس طرح وہ صحت و تندرستی کی رفیق تھیں۔ تو ڈاکٹر نائیڈو جو اس زمانے کے انگلیوں پر گنے جانے والے ممتاز و ماہر ڈاکٹر تھے، دکھ بیماری کے معالج۔ لیکن ایک اور بیٹا درمیان میں آپڑا تھا۔ اور اس طمطراق سے آیا تھا کہ شاہی کانپ گئی تھی، جمہوری اقتدار سے روگردانی کر کے مسلمانوں کی اقلیت کے باوجود انھیں کے اقتدار کی مالا جپنے والا یہ جواں، جب سروجنی نائیڈو کے سائے میں پہونچا تو سروجنی دیوی نے اسے بھی اپنا لیا۔ بحثیں کیں، سمجھایا لیکن وہ چرب زبان بھی نہ مانا۔ سروجنی دیوی کی مامتا میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ محبت کے رشتے اٹوٹ رہے۔ سیاسی راستے بالکل جدا۔ یہ جوان تھا نواب بہادر یار جنگ تھے۔ صدر اتحاد المسلمین تقریر کرتے تھے تو زبان سے موتیاں جھڑتی تھیں۔ اپنی منہ بولی ماں سروجنی نائیڈو کی فصاحت و بلاغت کے مداح تھے۔ بیرسٹر اکبر علی خاں کے عزیز ترین دوست تھے۔

پدما جا نائیڈو سے چھپتی تھی۔ گویا قبیلہ و خاندان ایک ہی تھا لیکن راستے الگ تھے مختلف تھے کہ ان دوستوں نے پشت کو پشت دکھا کر زندگی کا سفر طے کیا۔

دارالسلام میں تقریر کرتے ہوئے ایک بار بہادر یار جنگ نے کہا تھا کہ آج میرے منہ میں میری ماں جائی سروجنی نائیڈو کی زبان بول رہی ہے۔ یہ باعث افتخار اندازِ اظہار بہادر یار جنگ کا سروجنی نائیڈو کو خراجِ عقیدت ہے۔ اب کتنے رہ گئے ہیں ۔۔۔ جو میدانِ سیاست میں اس عزتِ نفس کی تکریم کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔

ہر پھر کر نظر ٹھہرتی ہے تو ایک شخص پر جس کا نام اندر کمار گجرال ہے۔ اور جو شنتا ہوں کہ ۔

بند جلنے ہے، کبھی بندِ قبا جانے ہے
آبلہ پا ہے، یہ رفتارِ صبا جانے ہے

اردو کے بارے میں گجرال کمیٹی کی سفارشات پندرہ سال سے آج تک سرد خانے میں محفوظ پڑی ہیں۔ اردو والے امید کا دامن تھامے ہوئے ہیں تو گجرال یقین کا دامن ۔۔۔!

سروجنی نائیڈو کی رنگا رنگ شخصیت کا میں نے ایک پرتو بتلایا۔ لیکن اس ابھرے پرتو میں دیکھئے کہ کتنی تہہ داریاں ہیں کسی مکتبۂ خیال، کسی نظریہ سیاست پر جبر کی کمندیں نہیں پھینکیں۔ کسی آزادہ روی کو زنجیر نہیں کیا۔ جس قدر تفہیم کا بوجھ اٹھا سکتی تھیں، اٹھایا۔ پیار سے سمجھایا، پچکار کر دلار سے سمجھایا۔ نہ مانے تو بخش دیں۔ لیکن اپنے گھر کا دروازہ کبھی

کسی پر بند نہیں کیا ۔ اس کے لئے وہ مجبور محض تھیں ۔ دل کا دروازہ کھلا رکھ کر گھر کے دروازے بند نہیں کئے جا سکتے ۔ چنانچہ پدما جا بھی ان کی اکبر علی خاں بھی ان کے، جیسو را نائیڈو بھی ان کے، بہادر یار جنگ بھی انھیں کے ۔

اسی رنگا رنگ شخصیت کا یہ پہلو بھی دیکھئے ۔ اندازہ کیجئے کہ عمر کی کس منزل سے سروجنی نے ذات پات کے بندھن توڑ رکھے تھے ؎

درونِ خانہ ہنگامے تھے کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر تھی

موقع محل سے شعر میں تھوڑا سا تصرف، زماں کا تقاضہ ہے کہ بات ماضی کی ہو رہی ہے ۔

سروجنی دیوی اونچی ذات کی برہمن تھیں ۔ یہ بات بیرسٹر صاحب نے بہت وثوق سے بتلائی ۔ اور نائیڈو کمتر درجے کی ایک کاسٹ ہے ۔ چنانچہ سروجنی کے خاندان والے ناراض تھے کہ تم کمتر آدمی سے شادی کر رہی ہو ۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ " میں ذات پات اور اونچ نیچ جاننا نہیں چاہتی ۔ ڈاکٹر جی آر نائیڈو مجھے پسند ہیں اور انھوں نے میری یہ شرط بھی بہت محبت سے مان لی ہے کہ وہ میری سیاسی و ثقافتی زندگی میں حائل نہیں ہوں گے ۔ مجھے اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہیئے "

اور دسمبر ۱۸۹۸ء میں انھوں نے شادی کر لی جبکہ وہ ۱۹ سال کی تھیں ۔

مجلسِ جاگیرداران کی انتظامی کمیٹی میں بہادر یار جنگ اور اکبر علی خاں ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے ۔ یہ یگانگت یہ تعلقِ خاطر

یہ سیاسی اقدار سے انسانی قدروں کو ممیز کرنے کا شعور دین تھی۔ سروجنی نائیڈو کی۔ جن کا گھر کانگریس، مسلم لیگ، جن سنگھ، سبھی مکتبۂ خیال کے سیاستدان جمع ہوتے اور اپنے اپنے اذہان کو صیقل کرنے کی سبیل نکال لیتے ___

سروجنی نائیڈو بڑی نرمی سے، بڑے پیار سے ہر ایک کے ساتھ پیش آتیں۔ صاف صاف دو ٹوک باتیں کرتیں، غلط مبحث کا شکار نہ خود ہوتیں اور نہ کسی کو ہونے دیتیں۔ ضیافتیں، اس پر مستزاد ___ انھوں نے کہا کہ میرا سیاسی شعور پدما جا کی رفاقت میں سروجنی نائیڈو کی دو لیعت ہے۔ میں نے کبھی انھیں غصہ میں بحث و تکرار ہر کسی کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے نہیں دیکھا۔ سیاسی روش پر حلم و تحمل سروجنی نائیڈو ہی کا عطا کردہ ہے۔ چنانچہ جب گاندھی جی کا تعزیتی جلسہ میں نے "نظام کالج گراونڈ" پر منعقد کیا تھا تو میری گذارش پر اکبر یار جنگ نے اس کی صدارت کی تھی ___ عثمان علی خاں کا یہ دور دراصل قاسم رضوی کا دور تھا۔ لہٰذا قاسم رضوی آئے تقریر کرنی چاہی، مائک سنبھالا اور وہی اپنی گھسی پٹی یک طرفہ سیاست کا پرچار شروع کر دیا۔ میں نے بہت انکسار سے ان کو سمجھانا چاہا کہ یہ جلسہ تعزیتی جلسہ ہے۔ آپ کی تقریر آپ کا حق ہے، لیکن یہ محل نہیں ہے۔

جلسہ ختم ہوا تو رضا کاروں نے میرا گھیراؤ کر لیا اور مجھے پیٹا۔ کچھ دوسرے ہمخیال نوجوانوں نے بیچ بچاؤ کر کے مجھے اٹھایا اور کار میں بٹھایا، ہمیں سمجھئے کہ کھوس کر رکھ دیا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک میرے گھر کے سامنے نعرے لگائے جاتے رہے ___ غدارِ وطن ٹھہرایا جاتا، عقوبت سے ڈرایا جاتا اور قتل

کی دھمکیاں دی جاتیں۔ میں تو صبر کر کے بیٹھا رہتا۔ لیکن بیوی اور بچوں کی حالت پر ترس آتا مجھے ـــــ یہ داستان کچھ اور طویل ہے ـــــ اسے یہیں چھوڑتا ہوں ـــــ بس اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ حیدرآباد میں قاسم رضوی کے دور نے مسلمانوں سے ان کی شرافتِ نفس بھی چھین لی، اعتماد و ایقان بھی۔ راقم الحروف کا افسانہ "گھونگھٹ" میں "خون" چھپا تو ایک ٹولی نے سڑک پر روک کر کہا تھا کہ شعیب اللہ خاں کا حشر یاد رکھوں۔

سروجنی نائیڈو نے حیدرآباد کی سیاست کے تیور سمجھ لئے تھے۔ چونکہ وہ قومی سطح پر ہندوستان بھر کی سیاسی زندگی کی روح رواں تھیں۔ اور ان کے پاس اس وقت حیدرآباد کے لئے وقت بھی نہیں تھا۔ سو انہوں نے نئے خون میں اپنے خون کی آمیزش کر دی اور قومی یگانگت کے لئے ایک ایسا اجتماعی ذہن تیار کر دیا جس کی شعاعوں نے کئی اذہان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پدماجا نائیڈو، بی رام کشن راؤ، اکبر علی خاں، نرسنگ راؤ، جے سوریہ کاشی ناتھ دیدیہ، راما چاری اور پھر احمد علی خاں۔ اس ٹیم نے پدماجا نائیڈو کی رفاقت میں سروجنی نائیڈو کے بغیچے کی ہمیشہ آبیاری کی جس کا نام حیدرآباد ہے۔

وہ زمانے اور تھے، جب مسلمان نوجوانوں سے لیکر ضعیفوں کے لبوں پر بھی حیدرآباد کے شاہ عثمان علی خاں کا یہ شعر ورد کی صورت اختیار کر گیا تھا کہ ؎

سلاطین سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثماں
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

تو بہادر یار جنگ نے ضلع ورنگل میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمانو، عثمان علی خاں سے تم نہیں ہو، تم سے عثمان علی خاں ہیں۔ حضور والا کو یہ بات بہت ناگوار معلوم ہوئی تھی۔ انھوں نے غیض میں آکر کہا تھا کہ سروجنی کو ہم نے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا تھا۔ اور ڈاکٹر نائیڈو ہماری ہی سرکار سے وابستہ رہے۔ اس ہم میں گویا اپنے والد محبوب علی خاں کی عنایات کا ذکر ہے۔ بہادر یار جنگ خود کو سروجنی نائیڈو کا منہ بولا بیٹا بولتا ہے اور ہمارے ہی خلاف زہر اگلتا ہے۔ اور وہ بھی تو ایک بیٹا بنا پھرتا ہے، اکبر علی خاں جمہوریت کا علمبردار ـــــ اسے حاضر کیا جائے۔ طلبی ہوئی۔ اکبر علی خاں پہنچے۔

ارشاد ہوا کہ "ہم نے سنا تھا کہ تم میں اور بہادر یار جنگ میں ٹھن گئی ہے۔ اور تم دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے ہو۔ ہم نے سوچا کہ سروجنی کے ان بیٹوں سے ذرا بات تو کریں۔

اکبر علی خاں نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور، جس شخصیت کا آپ نے میری ماں کے رشتے سے نام لیا ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اگر کسی جذبے سے نابلد ہیں تو وہ نفرت ہی کا جذبہ ہے۔ جس عورت کے پاس مذہب وملت کی تخصیص، سیاسی ونظریاتی اختلافات کا بُعد۔ اُنس وانسانیت کے ارفع جذبے کے آگے کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو، تف ہے اس کی اولادِ معنوی پر اگر وہ آپس میں نفرت کرے۔ سچ پوچھئے تو میں اور بہادر یار جنگ نائیڈو ہوں کہ بہادر علی خاں کہ اکبر علی خاں، ہم آج بھی بھائی بھائی ہیں۔ سیاست میں بہادر یار جنگ سے میرے نظریاتی اختلافات ہیں۔ اور رہیں گے۔ لیکن ہم دوست ہیں اور رہیں گے۔

شاہ نے ورنگل کی تقریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا بھائی تو ہماری ہی جڑیں کاٹنے کے درپے ہے۔ اس کو سمجھا دو۔

اکبر علی خاں نے دست بستہ پھر عرض کیا۔ حضور یہ تو مسلمانوں کو شاہ سے قریب لانے ہی کا ایک طریقہ ہے کہ اُن کے دل میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ اور شاہ عثمان ایک روح دو قالب ہیں۔ یوں سمجھئے کہ "من تو شدم تو من شدی" والی بات ہے۔ ورنہ وہ تو آپ کا ہی خواہ ہے۔ آپ کا وفادار، مجھ میں اور اس میں اختلاف یہی ہے کہ وہ آپ کو صرف مسلمانوں کا بادشاہ سمجھتا ہے ـــ اور میں کہتا ہوں کہ آپ نے ہر جگہ علی الاطلاق بارہا یہی فرمایا ہے کہ ہندو مسلم میری دو آنکھیں ہیں۔ ایسے میں حضور والا میری ماں کی طرف سے سیاست درمیان میں آتی ہے۔ اور نہ ہی میرے شاہ کی طرف سے تو میں بہادر یار جنگ سے کس طرح نفرت کر سکتا ہوں۔

شاہ کے دل میں کیا تھا، وہ تو وہی جانیں یا پھر اُن کی شاہی۔ وقتیہ خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور اکبر علی خاں لوٹ آئے۔ بات آئی گئی ہوئی۔

لیکن کچھ ہی عرصے بعد گھروں کی چار دیواری سے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی نسائی آوازیں ڈھولک پر زنانے تک حیدر آباد کے لوگوں نے سنیں ـــ

دے کے حُقّے پہ دم بہادر جنگ
گئے ملکِ عدم بہادر جنگ

یہ فوک سانگ، یہ عوامی گیت حیدرآباد کے سیاسی اور ثقافتی المیے کا واویلا بن کر ایک زمانے تک جبر شاہی پر آنسو بہاتا رہا۔

ہوا یوں تھا کہ ایک پُر تکلف ضیافت میں عشائیے کے بعد حقے کی نے کو لبوں سے لگانے کی دیر تھی کہ بہادر یار جنگ نے دنیا چھوڑ دی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ شاہی کا ایک آزار تو کم ہوا۔ خواہ وہ سروجنی دیوی کا منہ بولا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

یہ وہی شاہ عثمان ہیں جن کے بارے میں بہت دنوں بعد کمیونسٹ پارٹی کی تلنگانہ جدوجہد کے زمانے میں ایک اور سر پھرے نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں نعرۂ مستانہ لگایا تھا۔ اور یہ مست قلندر تھے۔ مخدوم محی الدین۔

بنا رہا ہے نئی اک سحر تلنگانہ
پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربتِ کاری
حضور آصف سابع پہ ہے غشی طاری

مجھ سے یہ بات کرتے ہوئے ایک بار تایا ابا بیرسٹر اکبر علی خاں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ سروجنی دیوی نے اپنے نزدیک یہ طے کر لیا تھا کہ وہ کبھی بھی حیدرآباد کی سیاست میں خود کو ملوث نہیں کریں گی۔ وہ کہتی تھیں کہ جمہوریت میرا ایقان بھی ہے، میرا ایمان بھی، اور ساتھ ہی ساتھ حیدرآباد کی تہذیب سے حیدرآباد سے مجھے پیار ہے۔ یہاں کی اچھی بری سیاست میں شخصی طور پر میں دخیل ہونا نہیں چاہتی کہ مجھے

اپنے ہی گھر میں کسی ایک کا ہو کر رہ جانا اور کسی ایک سے منہ پھیر لینا اتنا آسان نہیں لگتا ـــ میں نے راستے سجھا دیئے ہیں ۔ اب یہ کام تم لوگوں پر چھوڑتی ہوں کہ دھیرج سے 'نرمی' سے بغیر کسی الجھاؤ، ٹکراؤ اور جھگڑے کے جمہوریت کا بول بالا کریں ۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آصف سابع شاہ عثمان کے پاس سے سروجنی نائیڈو کے پاس بھی کبھی کبھی خاصہ بھجوایا جاتا تھا ۔ یہ خاصہ بھی شاہی خصوصیات کی بناء پر جو آصف سابع کے نام سے مختص تھیں مضحکات کے کئی ڈھکے چھپے پہلو رکھتا ہے ۔

بڑے سے خوان پر زریں خوان پوش ۔ اندر ایک پلیٹ میں کسی موسمی میوے کا ایک 'دانہ' مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک عدد آم یا ایک امرود یا پھر بادام کی لذیذ مٹھائی کا ایک لوز جس پر چاندی کا ایک مہین سا ورق ـــ چاندی کے تصور کی طرح ـــ گویا یہ شاہ کا التفات تھا ۔ ان کی محبت، تھی کہ تناول کے وقت آپ یاد آ گئے ـــ اب اس یاد کی قیمت آپ کو چکانی ہے ـــ جو بھی آتا بہ سرو چشم آپ اس کو قبول کرتے اور ایک اشرفی خالی پلیٹ میں رکھ دیتے ۔ وہ تھا آپ کا یاد آنا ـــ اور یہ تھا آپ کا نذرانہ ۔ اس خوانِ نعمت سے کچھ بھی برآمد ہو سکتا تھا ۔ تھوڑا سا 'شوربہ' اس میں دو بوٹیاں ایک روٹی یا میٹھی سوندھی کھیر کی صحنک ۔ ہاں کھیر کی صحنک ہو تو چاندی کا ورق لازم ہوا ۔ وہی تصور کی طرح ۔

پدما جانائیڈو ہوں کہ لیلامنی نائیڈو ۔ دونوں ہی اپنی ماں کی طرح

اسی خمیر سے اٹھی تھیں جسے انس و انسانیت کی عظمتوں نے گوندھا تھا۔ سروجنی نائیڈو کی تقریر کے اقتباسات ان پر لکھے گئے مضامین میں اکثر مل جاتے ہیں۔ اس اقتباس سے جوان کا اعتراف ہے۔ انھیں آئینے میں نہیں، ان کی روح میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کبھی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں نے بہت سفر کیا ہے۔ بہت دنیا دیکھی ہے۔ سوچا اور سمجھا ہے۔ امید و بیم کی منزلوں سے گزر رہی ہوں، محبت کی دنیا کو وسیع بنایا ہے اور ہمدردیوں کے سمندر کو اتھاہ ۔۔۔ مختلف فرقوں، مذہبوں، نسلوں اور تہذیبوں کے لوگوں سے ملی ہوں، اسلئے میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ میرے ذہن میں نسل، فرقہ، ذات یا رنگ کا کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے۔"

لیلامنی نائیڈو حیدرآباد کے کسی کالج میں لکچرر تھیں۔ یہاں سے اکسٹرنل افیرس منسٹری میں ڈپٹی سکریٹری ہو کر چلی گئیں۔ وہ ویسٹرن کورٹ میں رہتی تھیں بیرسٹر اکبر علی خاں بھی ویسٹرن کورٹ ہی میں مقیم تھے۔ جب کبھی حیدرآبادی کھانوں کیلئے جی مچلتا بیرسٹر صاحب لیلامنی سے ایک دن پہلے وعدہ لے لیتے۔ پھر دسترخوان پر زبان، آشنا لذتوں سے انصاف کرتی ۔۔۔ یہ یگانگت، یہ رفاقتیں، یہ اخلاص یہ مداراتیں اس خاندان کا مزاج بن گئی تھیں۔

پدماجا نائیڈو نے شادی نہیں کی۔ عظیم ماں کی بڑی بیٹی ۔۔۔ لوگ جب قوم کا ورثہ بن جاتے ہیں تو ان کی نجی زندگی بھی نجی نہیں رہ جاتی ۔۔۔ لوگ خلوتوں میں بھی در آتے ہیں۔ اور اتنے خلوص سے خلوتی بن جاتے ہیں کہ ان کے

جذبۂ نارسا پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی ــــ پدماجا نائیڈو ــ اور سالار جنگ میں لگاوٹ تھی ــــ اور اس لگاوٹ نے شاید محبت کی منزلیں اس درجہ طے کر لی تھیں کہ جب محرومیاں ہاتھ لگیں تو نہ پدماجا نے کسی سے شادی کی اور نہ سالار جنگ نے ۔ رہ گئی یہ بات کہ ان دونوں کو ان کے اپنے سہروں کے پھول پردے والے کیوں نہیں ملے کہ حیدرآباد تو بس محبتوں کا شہر تھا ۔ سو بات اتنی گمبھیر نہیں، صاف ہے ۔

پدماجا نائیڈو کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی، کہ وہ اپنی ماں کی طرح صرف ایک ہی ذات کو مانتی تھیں ۔ ایک ذات کی پوجا کرتی تھیں ۔ عبادت کرتی تھیں ۔ اور وہ ذات تھی انسانیت اور اس کے اوتار تھے انسان ــــ سالار جنگ کو ان کی جاگیرداری، شاہ کی پاسداری اور حکومت کے لوازمات و موانعات نے اس دشت میں آبلہ پائی کی توفیق نہیں دی ہوگی ــــ وہ اور تھے جنھوں نے سلطنتیں چھوڑ دیں ۔

حیدرآباد سے دور دور رہ کر بھی حیدرآباد کی روح بنی رہنے والی سروجنی نائیڈو نے جب وہ یوپی کی گورنر تھیں، ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پر پولیس ایکشن POLICE ACTION کے بعد تاسف سے یہ کہا کہ "مجھے افسوس ہے کہ آج میرا حیدرآباد ہار گیا ــــ" تو سردار پٹیل نے سروجنی نائیڈو کے سیکولر ذہن پر وار کیا اور افسوس کا جواز مانگا ۔

سروجنی نائیڈو نے کہا کہ میرے سیکولر ذہنی سفر پر جو یہاں سے وہاں تک میری زندگی رہے کوئی انگلی رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا ۔ دنیا جانتی

ہے کہ میں نہ صرف سیکولر ذہن رکھتی ہوں گاندھی جی کی بھکت بھی ہوں۔ آن کا مٹیو بی کی جنھوں نے انگریز جیسی قوت کو اہنسا کے بل بوتے پر ہندوستان سے کوڑے کرکٹ کی طرح نکال پھینکا۔ حیدرآباد تو بہت ہی چھوٹی سی چیز ہے۔ وہ میرا باغ بھی نہیں بغیچہ ہے۔ لیکن میں کہہ سکتی ہوں کہ فوجی کارروائی نے میرے حیدرآباد کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ پولیس کارروائی کی جو باتیں میرے کانوں تک پہنچی ہیں۔ انھوں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ میں کس منہ سے حیدرآباد جاکر اپنے بچوں کا سامنا کروں گی۔ اگر میرے یہ جذبات میری سرکار کو گراں گذرتے ہوں تو گورنری سے میرا استعفیٰ حاضر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے جب تک بن پڑا حیدرآباد پر پولیس کارروائی کی مخالفت کی تھی۔ لیکن قاسم رضوی کی جذباتی تقریروں نے سردار پٹیل کے غصے کو مہمیز لگائی۔ جس کے غصے نے حیدرآباد کی اس داستان پارینہ کو خونچکاں کرکے رکھ دیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کس دفتر کی کن امثلہ میں یہ باتیں محفوظ ہیں کہ نہیں ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ چند سینوں میں آج بھی وہ دل دھڑکتے ہیں جن میں رازہائے سربستہ دفن ہیں۔ اور انھیں سینوں میں میرے تایا حضور بیرسٹر اکبر علی خان ہیں جنھیں یوپی کی گورنری دی گئی تو انھوں نے آنجہانی اندرا گاندھی کے اصرار پر اسے قبول کیا۔ اور جب قبول کرلیا تو کہا کہ مجھے فخر ہے کہ میں اس اسٹیٹ کا گورنر بنایا جارہا ہوں جہاں میری ماں گورنر تھیں اس طرح میری ذمہ داریاں انسانی اور جذباتی دونوں لحاظ سے بہت بڑھ جاتی ہیں۔ میرا اللہ میری مدد کرے کہ میں اپنی ماں کے نقش قدم پر چل سکوں۔

سروجنی نائیڈو نے یکم مارچ ۱۹۴۹ء کو اسی ڈرامائی انداز سے اس بھری دنیا سے آنکھیں پھیر لیں جیسے کوئی زندگی کا مذاق اڑاتا ہے۔

۱۳ سال کی عمر میں انگلستان جانے سے قبل ۱۳ سو لائینس کی لیڈی آف دی لیک جیسی طویل نظم لکھنے والی یہ ذہین اور باشعور لڑکی سولہ سال کی عمر میں مسز اینی بیسنٹ کے ہمراہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلی گئی۔ اسی طرح ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۸ء تک تین سال انگلستان میں گذارنے کے بعد وہ اپنے وطن حیدرآباد (دکن) لوٹ آئی۔ اور اسی سال، دسمبر میں خاندانی رکاوٹوں کو پس پشت ڈال کر اپنی شادی رچائی۔

زندگی کے ساتھ اس طرح آن بان کا سلوک کم ہی لوگوں کے حصّے میں میں آتا ہے کہ وہ قوم اور وطن کا ورثہ بن کر امر ہو جائے۔

بستر مرگ پر نرس سے گیت سنتے سنتے اس کو گواہ رکھ کر یہ کہنا کہ اب میں کسی سے نہ بولوں گی اور پھر کسی سے نہ بولنا، ہندوستان کی اس بلبل کا ایک ایسا کرشمہ ہے۔ جس نے (۴۱) سال کے بعد بھی اپنی آواز کی ہوک کو ان سبھوں کے سینوں میں بسا رکھا ہے۔ جنھوں نے کبھی اس کی چہکار سنی تھی۔

گولڈن تھریشولڈ جیسی نفیس عمارت، جو قلب شہر میں واقع ہے اور جہاں سروجنی نائیڈو مالکن بن کر رہتی تھیں۔ جہاں پدماجا نائیڈو۔ لیلامنی نائیڈو راجن اور جے سوریا نائیڈو نے ڈاکٹر جی۔ آر۔ نائیڈو کے سایہ عاطفت میں بچپن گذارا تھا۔ اسی عمارت کو، اس میں بسی بسی یادوں سمیت پدماجا نائیڈو نے حیدرآباد یونیورسٹی کے لئے گورنمنٹ کو تحفہ بطور نذر کر دیا۔ اسی طرح اس

خاندان کا کوئی نشان حیدرآباد میں نہیں رہا۔

جب بیرسٹر اکبر علی خاں نے ڈاکٹر چینا ریڈی سے ان کی پہلی چیف منسٹری کے زمانے میں خواہش کی کہ سروجنی نائیڈو کی یادگار کے طور پر ان کے نام سے سینٹر کھولا جانا چاہیئے تو چینا ریڈی نے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس سنٹر کے لئے ایک بلڈنگ خریدنے کے فوری احکام جاری کر دیئے۔ چنانچہ دفتر روزنامہ "سیاست" کے سامنے ایک عمارت ۹ یا ۱۰ لاکھ روپے میں خریدی گئی اور ایک لاکھ روپے سالانہ اس کا کرنٹ اکاونٹ بھی ڈاکٹر چینا ریڈی نے جاری کر دیا۔ بیرسٹر اکبر علی خاں کو اس سنٹر کا چیرمین بنایا گیا۔ آئینگار اعزازی سکریٹری ہوگئے اور دراج کرن آئی اے ایس پیڈ سکریٹری۔

اس حسنِ اتفاق کا کیا کہنا کہ مابعد یہ بات ثبوت کو پہنچی کہ سروجنی نائیڈو اسی گھر میں پیدا ہوئی تھیں جس کو ان کے والد اگھورناتھ چٹوپادھیائے نے کرایے پر لے رکھا تھا اور جہاں آج سروجنی نائیڈو کلچرل سنٹر قائم ہے۔ سکندر علی وجد نے کہا تھا۔

ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

(ہریانہ اردو اکادمی پنچکولہ کے زیرِ اہتمام سروجنی نائیڈو کل ہند سیمینار میں ۳۰ جون سنہ ۱۹۹۰ء کو پڑھا گیا۔)

••

اقبال متین

میاں خستہ کا لڑکپن

الطاف حسین حالی

آمد: ۱۸۳۷ ـــــــــ ۳۱/دسمبر ۱۹۱۴ء رخصت

بات یوں شروع کروں کہ چار برس سے کچھ زیادہ کا سِن۔ قاری ممتاز حسین کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ ہاتھ میں قرآن حمید تھمایا گیا تو اس منچلے نے بسم اللہ کیا پڑھی، سارا قرآن ہی سینے میں چھپا کر رکھ لیا۔ استاد بھی ایسے انھیں سمجھاتے کہ شاگرد ہو تو ایسا ہو۔ نام اپنا تلمیذِ رحمانی۔ ایسی خوش الحانی سے بچپن میں تلاوت کرتے کہ بڑے بڑے منہ تکا کرتے پھر سر دھنا کرتے اور قرآن رحل پر نظر نہ آتا۔ سینے سے دل سے لبوں سے ورق ورق بکھرتا جاتا اور دوسروں کے سینوں میں اترتا جاتا۔

پانی پت کے محلہ انصار کے اس بچے کا بچپن بھی شاید عمر کی کوئی ایسی منزل اپنے ساتھ لے آیا تھا جس سے عمر پہچانی نہ جائے۔ چھوٹی سی جان چمکدار آنکھیں لیکن آنکھوں سے شعور کی گہرائیاں سی جھانکتی تھیں۔ اتی تھیں تو ایسی تھیں کہ بیٹھے

تکا کریں دیواروں کو، کبھی کچھ بات کی تو کسی کے پلّے نہ پڑی۔ کسی کے کچھ پلے پڑا تو
[illegible] میں جو جنت ہے وہ اس بچے کے حصے میں نہ
آئی۔ اس باغ کے سارے پھل پھول بڑے بھائی اور [illegible] بہنوں کے حصے
[illegible] ختم نہیں ہو گئے۔ [illegible] کو [illegible] تو ایسا پیڑ جس کے پات ہی
نہ تھے۔ ایسے بچے جو بچپن ہی میں اپنا سب کچھ کھو دیتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] سے ان کا بچپن [illegible] زیرکی [illegible] ذہانت [illegible] کوئی حدِّ فاصل نہیں
رکھتی۔ اس بچے کے ساتھ بھی یہ سب کچھ ہوا۔ اس زیرکی نے حدود توڑ دیے تو
سرحد پر کھڑی [illegible] پاتے پاتے ساری قوم کا درد
اپنا لیا۔ یہ باتیں تو بہت ہیں اور بہت بڑی ہیں۔ میں تو اس بچے کی
بات کر رہا ہوں۔ جس نے دنیا میں آتے ہی زندگی کو [illegible] کرنا سکھلا دیا۔

اس وتیرے کے ساتھ ساتھ کھیل کود کم، شعر و [illegible]
شوقِ فضول زیادہ۔ محلہ نصاریٰ کی گلی کوچوں میں بٹیرے کا تیتر پھرنے والا
یہ ننھا، سترہ سال کا ہوا تو پکڑ کر اس کو منڈپ میں بٹھا دیا گیا۔ بزرگوں کا خیال
تھا کہ لوہے کی زنجیر مضبوط نہیں ہوتی۔ پھولوں کے دھاگے سے بندھے ہاتھ سارے
وجود کو اس طرح کس لیتے ہیں کہ ایک اور نرم و نازک شخصیت اپنے جسم و جان کا
سب کچھ تج کر اپنی دوئی مٹا لیتی ہے۔

تب یوں ہوا کہ ایک ۱۸ سال کا نوعمر لڑکا جس کے سر سے باپ کا
سایہ بچپن میں اٹھ گیا تھا اور ماں فاطر العقل تھیں۔ گھر بار یہاں تک کہ اپنی
دلہن کو چھوڑ کر پاپیادہ پانی پت سے دلّی کے لئے نکل پڑا۔ سینے میں قرآن

تلاوت میں خوش الحان، زادِراہ کے طور پر نہ بوریا نہ بستر، نہ گٹھری نہ سامان، بس میں کچھ بھی نہیں۔ اللہ نگہبان اور یہی مجزو ایمان۔

اس طرح اپنا سب کچھ تج کر کوئی جاتا ہے؟ اور پھر لالچ کیا تھی۔ نہ عیش و عشرت راہ تکتے تھی نہ چاہنے والوں کی رفاقت کا تصوّر۔ ساتھ کچھ تھا تو عسرت تھی اور لوہے کے چنے چبانے کا عزمِ صمیم۔ نہ سامنے کوئی نقش پا کہ راستہ سجھائے۔ بڑے بھائی کی محبت انھیں کو سونپ دی۔ نہ التفات گوارہ، نہ انبساط کی ہوس، تالو میں بیٹھا کوئی چلاتا تھا، تم کچھ ہو۔ تمھیں کچھ ہونا ہے۔

دِلّی پہنچے تو اس گہوارۂ علم کی خاک کو اپنی پلکوں کا غازہ بنایا۔ آئے اسی لئے تو تھے کہ دولتِ علم سے مالامال ہو کر لوٹیں۔ جانتے تھے کہ تہی دست آیا ہوں، تہی دست لوٹوں گا۔ لیکن وہ خزانے جو ساتھ لے جاؤں گا۔ ان کو دلّی کی جامعہ مسجد سے پانی پت کے محلہ انصار کی گلیوں تک نہ کوئی چور اُچکا چرا سکے گا، نہ کوئی رہزن لوٹ سکے گا۔ بہرحال اُمید و بیم کے عالم میں مولوی نوازش علی صاحب کے درس و تدریس میں شرکت کے لئے حسین بخش کے مدرسے کی سیڑھیاں رگن ڈالیں۔ جو دلّی کی جامعہ مسجد کے قریب تھا۔ کبھی کھایا، کبھی نہیں کھایا۔ مسجد یا مدرسے کا فرش بچھونا رہا ہوگا۔ اینٹوں کو تکیہ بنایا ہوگا۔ اینٹوں کو تکیہ بنایا ہوگا۔ میر تقی میر تو پھر ہاتھ سرہانے رکھ لیتے تھے۔ میاں خستہ کو ہاتھ کا یہ استعمال بھی نہیں آیا۔ ان کی نواسی صالحہ خاتون لکھتی ہیں۔

"اس زمانے کا مفصل حال کہیں دستیاب نہیں ہوتا"۔

صالحہ خاتون وہی ہیں جو بعد میں صالحہ عابد حسین ہوئیں۔

حالی نے یادگارِ غالب لکھی اور حق ادا کیا۔ حالی کی اس نواسی نے یادگارِ حالی لکھی اور حق ادا کر دیا۔ شبلی ہوتے تو شاید وہی اعتراض یادگارِ حالی پر بھی کر بیٹھتے، جو انہوں نے یادگارِ غالب پر کیا تھا۔ کیونکہ وہاں تو تھا کہ ذہنی ارتباط اور شعر و ادب کا انسلاک گرہ میں باندھ کر حالی نے اپنے استاد اور پیرِ معنوی غالب پر قلم اٹھایا تھا۔ اور یہاں صالحہ خاتون نے رگوں میں دوڑتے اس خون کی بھی اپنی روشنائی میں آمیزش کر لی ہے جو حالی اور صالحہ میں یکساں رواں دواں تھا، لیکن ضبط و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ نہ غلو سے کام لیا نہ کہیں مبالغہ آرائی دخیل ہو سکی۔ نانا کی سنجیدگی طبع کو اپنی تحریر کی گہرائی میں سمیٹ لیا۔ میں کہوں نانا کا احسان ساری قوم پر ہے تو نواسی کا احسان بھی ساری اردو زبان پر۔

اچھا اور سنیے۔ یہ لڑکا جس کی میں بات کر رہا ہوں اور جس کے نانا بننے میں ابھی بہت زمانہ ہے اور جو ابھی خستہ سے حالی بھی نہیں بن سکا ہے۔ تھا بھی بڑا سر پھرا۔ خوب خوب سے خوب تر کی تلاش جو اس لڑکے کا مزاج بن گیا۔ کہتے ہیں کہ وہی خود اعتمادی کارفرما رہی ہے جو علم کے سمندر کو قطرہ قطرہ پی جانے کے اضطرار سے پیدا ہوئی تھی۔ میاں خستہ غالب کے کلام پر اس وقت مرمٹے تھے جب ذوق کا طوطی بولتا تھا۔ اور غالب کو قبول عام حاصل نہ تھا۔ اس عشقِ سخن نے غالب کے گھر کے چکر لگوائے، طواف کروایا یا زیارت حاصل کی تو اس طرح کے سیدھے غالب کے دل تک جا پہونچے۔ انھیں کا کلام جو ادق ہوتا انھیں سے سمجھنا اور سر دھننا۔ غالب بھلا اتنے نازکس کے اٹھاتے کہ خط کشیدہ اشعار کے مطالب سمجھائے ہیں جو اسد اللہ خاں نے موزوں کئے ہیں، اور جو

الطاف حسین خستہ کی فہم سے بالا ہیں۔ لیکن غالب کی جوہر شناس نظریں جلد ہی جان گئی تھیں کہ یہ سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا سیدھے آنکھوں کے راستے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ذہن کی طرف بڑھ رہا ہے کہ واقعی اس کو کچھ ہونا ہے۔ کچھ بننا ہے۔ اسی لئے اس کی کچھ طلب بھی ہے۔ اس کو کچھ چاہیے اور اس کچھ کو پکڑ لینے میں غالب کی نظریں کبھی نہیں چوکیں اور انہوں نے پیالے کے ظرف قدر کو مقدور بھر لبریز کیا۔ نہ ہیں دیکھا نہ ذہنی بلوغ " وہ جو تخلیقی صلاحیتوں کا ایک شرارہ سا کہیں دبا رہتا ہے۔ اس کو غالب جھٹ سے کرید کر راکھ میں سے اس طرح اٹھا لیتے کہ انگلیوں کی پوریں تک نہ جھلسیں اور اگر وہ جگنو کی طرح تھا رہا ہو تو غالب مٹھی میں بند کر لیتے۔ تب یہ جگنو سورج سے آنکھ مچولی کھیلتا۔ اسی لئے غالب نے نہ شیفتہ کی شیفتگی سے عار کیا نہ خستہ کی خستگی سے۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بھی غالب محبی تھے اور الطاف حسین خستہ کے بھی مربی۔ پھر بعد میں تو شیفتہ اور خستہ کی بہت گھٹی لیکن اس وقت تک خستہ، خستہ نہ رہے تھے، حالی ہو گئے تھے۔

یہ باتیں بھی بہت بعد کی ہیں۔ میں تو پھر اس لڑکے کے اطراف گھوموں جو ابھی بڑا نہیں بنا تھا لیکن عظمتیں اس کے قدم چھونے کے لئے بڑھ رہی تھیں۔

ایک دن اس منچلے کو یہ سوجھی کہ غالب کو سمجھنے کے لئے تو عمر پڑی ہے۔ یہ بھی تو جان لیں کہ حضرت غالب خود اس کو کیا سمجھتے ہیں۔ اپنی غزلیں غالب کے آگے اصلاح کے لئے پیش کر دیں اور منہ لبورے اس طرح ٹک ٹک حضرت غالب

کو نکاکئے، کہ اب پھٹکار پڑے گی، اب اپنی اصلیت کھُلے گی، غالب نقدِ شعر میں سخت گیری کی معراج پر تھے۔ کبھی اس بات کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا کہ ہر گلے باز شاعر بنا بیٹھا ہے۔ ذہن و دل سے کوئی واسطہ نہیں۔ حلق میں پتی لگی کہ شعر تیار ہوا۔ شاعری کیا ہوئی، گلیاری کی آترن ہوئی۔ دلی کے ہر کوچے کے ہر گھر میں قافیہ ردیف کے پیوند لگا کر ٹلنکے دیئے جا رہے ہیں۔ اور شاعری کا لبادہ اوڑھ کر ہر کس و ناکس جیسے دنگل یا مشاعرے کی بات اِترا رہا ہے۔ اس بدعت کی اُن دنوں بھی کثرت تھی، آج بھی کمی نہیں۔

غالب نے میاں خستہ کے کلام کو دیکھا۔ پھر سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ میاں خستہ اپنی خستگی کا بوجھ اٹھائے خجل ہو رہے تھے، کہ یہ کیا کر دیا ہم نے کچھ اور تحمّل سے کام لیا ہوتا۔ ابھی تو شاعری کا یہ سفینہ کاغذ کی ناؤ سے بھی کم ہے، اور ہم نے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں چھوڑ دیا اس کو۔

غالب نے پھر اُلٹ پھیر کر کاغذ کو دیکھا اور میاں خستہ پر نظریں جما دیں۔ یہاں یہ حال کہ خستہ کی نہیں خستگی کی داد ہی مِل جائے تو پنڈ چھوٹے۔

غالب نے کہا۔

'میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے'۔

غالب کی نظروں میں اپنی اس وقعت و منزلت نے خستہ کے دل میں دلی کے گلی کوچوں کو شہر رگ بنا کر رکھ دیا، جس کا رشتہ ہر پھر کر غالب کی دہلیز تک بہر صورت پہنچتا۔

لیکن غالب سے اس والہانہ عقیدت کے باوجود اور غالب کے بے پناہ التفات کے باوصف میاں خستہ کو دلی چھوڑنی پڑی۔ جان چھڑکنے والے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے چند اور رشتہ داروں کے ہمراہ ۱۸۵۵ء میں انھیں جا پکڑا۔ جوں ہی انھیں پتہ چلا کہ ان کا چہیتا ساری آسائش تیاگ کر حصول علم کے لئے ہر صعوبت کو پکڑ پکڑ گلے لگا لیتا ہے تو وہ بے چین ہو اٹھے۔

۱۸۳۷ء میں پیدا ہونے والے الطاف میاں ۱۸۵۵ء میں "یا بدست دگرے دست بدست دگرے" دلی سے پانی پت لوٹے تو اٹھارہ سال کی چھوٹی سی عمر میں کچھ دن مومن کی شاگردی سے استفادہ کیا ہی تھا کہ غالب کے ہو لیے۔

میرے اس مضمون میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں ہے کہ خستہ کو حالی تک لے جاؤں۔ بس اتنا کہہ کر بات ختم کروں کہ میاں خستہ جب حالی کی عظمتوں کو چھونے لگے تو اس وقت تک زندگی کے نامساعد حالات کا ایک ایسا سلسلہ ان کا مزاج بن گیا۔ جس نے تحمل، صبر و ضبط، قناعت، بندگی اور انکسار سارے اوصاف کا احاطہ کر لیا۔

دنیا کی سب سے بڑی دولت جس کا نام صحت و تندرستی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے نوعمری ہی میں حالی سے چھین لی تھی۔ اس کے بعد اپنے ہر ہر سانس کا حساب اپنے قلم کے ایک ایک لفظ سے جوڑ کر حالی نے لگایا اور آخری سانس تک لکھتے رہے۔

آخر یوں ہوا کہ شبلی نے کہا۔

"شمس العلماء کے خطاب کو آج مولانا حالی کی نسبت سے
عزت و توقیر حاصل ہوئی"

سر سید احمد خاں نے کہا:

"روزِ محشر جب میرا اللہ مجھ سے پوچھے گا کہ کیا میرے لئے
کیا لے آئے ہو تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا
لایا ہوں"

یہ باتیں میں نے اپنے لفظوں میں لکھ دی ہیں۔ بڑوں کی بڑی باتیں من و عن
حافظے میں نہیں ہیں۔

لیکن سوچتا ہوں میاں خستہ، حالی بن کر بھی اپنے لئے کیا لے گئے۔
جاتی ہوئی صحت اور آتی ہوئی عسرت نے متحد ہو کر یلغار کیا تو اس طرح کیا کہ "حیاتِ جاوید"
سر سید کو بھی نہ دکھا سکے۔ ہاں یہ غم ضرور اپنے ساتھ لے گئے۔

حالی نے ۱۹۱۵ء کی صبح نہیں دیکھی۔ لیکن جس شخصیت کی عظمتوں نے
موسموں پر زمانوں پر یہاں تک کہ صدیوں پر کمندیں پھینک دی ہوں، اس کا
نہ ۱۹۱۵ء کی پہلی جنوری کچھ بگاڑ سکی ہے اور نہ کسی صدی کا پندرھواں سال کچھ
بگاڑ سکے گا۔

ان ساری عظمتوں کے باوجود زندگی نے حالی کے ساتھ جو سلوک کیا وہی
سلوک کسی اور سے روا رکھتی تو عظمتیں متزلزل ہو جاتیں۔

اپنا ہی فارسی کلیات اس طرح مرتب کیا جیسے اکھڑی اکھڑی سانسوں
کو کوئی ترتیب دے رہا ہو، اور جب کلیات چھپ کر آیا تو حالی کے پاس

ان کی آخری سانس بھی نہ رہی۔

آخری عمر میں قوتِ گویائی چھین لینے والی زندگی نے حالی کو اپنے کلیات پر ایک اچٹتی نظر ڈال لینے کی مہلت بھی نہیں دی۔ بصیرتیں ہی بصیرتیں بکھیر کر جانے والا ہائے کس وقت بصارت سے محروم ہوا۔ رہ گئی موت سو وہ حالی کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔

اقبال متین کی زیرِ طبع کتابیں

★ صریرِ جاں .... شاعری

★ باتیں ہماریاں ...... یادیں

★ تارتار .... افسانے

★ آنگن میں سہاگن .... طویل مختصر افسانے

خاکے

اقبال متین

آوارۂ خلوص

لطیف ساجد مرحوم

آمد: ۲۵/اپریل ۱۹۲۳ء —— یکم مارچ ۱۹۵۵ء رخصت

شاید ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ میں سٹی کالج میں جماعت نہم کا طالب علم تھا۔ بچوں کے "سب رس" کے مقبول شاعر اور مضمون نگار کی حیثیت سے اپنی جماعت کے سوا دوسری جماعتوں میں بھی جانا پہچانا جاتا تھا۔ چیتاپور سے مڈل کامیاب کرنے کے بعد سٹی کالج میں آٹھویں جماعت میں مجھے داخلہ مل گیا تھا۔ اس طرح ۱۹۴۱ء تک کالج میں میرا حلقۂ احباب کچھ وسیع ہو گیا تھا اور وہ اجنبیت نہ رہی تھی جو کسی تعلقہ یا ضلع کے طالب علم کے لئے شہر کے بڑے اسکولوں میں ایک مدت تک صبر آزما ہوتی ہے۔ اس وقت تک لطیف شریف میری زندگی میں داخل نہ ہوا تھا۔ ۱۹۴۱ء کے وسط میں کالج آتے جاتے ہوئے راستے پر، کالج میں گھومتے پھرتے وقت اور پھر کالج کی لائبریری میں دو اجنبی شخصیتیں میری توجہ کا مرکز بن جاتیں۔ ایک سا رنگ روپ، ایک سا پہناوا، ایک سی چال ڈھال۔ قدرے فرق کے ساتھ بڑے بڑے بال لیکن قد وقامت میں زمین آسمان کا فرق۔ قامت کے اس فرق کے باوجود یہ دونوں ایک دوسر

ییسے لازم و ملزوم تھے ۔ میں نے ان دونوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ بہت کم دیکھا۔ گھنٹہ ختم ہوا گھنٹی
دوسرے گھنٹے کے آغاز کے انتظار میں جماعتوں کے باہر منٹ دو منٹ کے لیے ہماہمی بڑھ گئی
ے بلند ہوئے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا ۔ اور اسی چہل پہل میں میری نظریں ان دونوں پر جم
ں ۔ ایک گردن جھکائے اور ایک گردن اونچی کئے راز و نیاز میں مصروف ۔ میں مسلسل
ں دیکھتا رہا یہاں تک کہ ہماری نظریں چار ہوئیں اور ان دونوں نے کچھ اس طرح مجھے دیکھا۔
ے خود ان کا بھی وہی عالم ہے جو میرا ہے لیکن پہل ہم میں سے کسی نے نہیں کی ۔ میں
بچوں کے "سبارس" کا مقبول شاعر میں کیوں پہل کرتا' وہ ٹھہرے کالج کے طالب علم
سے دو جماعت آگے' وہ بھلا کیوں پہل کرتے ۔ لیکن دل تھا کہ کھنچا چلا جاتا ۔ ان
ں میرے ایک بچپن کے ساتھی غلام دستگیر جمیل بھی ساجد کے کلاس فیلو تھے ۔ وہ مجھ
ے اکثر ملتے رہتے ۔ دوپہر کا کھانا میں' وہ اور محمود اکبر بشیر ساتھ ہی کھاتے ایک دن
ں کچھ تاخیر سے آئے ان کے ساتھ ساجد اور حسینی شاہد بھی تھے ۔ جمیل نے دونوں سے
تعارف کرایا ۔ ساجد نے کہا کہ مجھے آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا ۔ مخدوم نے
ے بار آپ کا تذکرہ کیا تھا ۔

اس کے بعد ہم مسلسل ملتے رہے ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ساجد لطیف شریف
، حسینی شاہد صرف احمد حسینی تھے اور میں مسیح الدین متین ہماری ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ
اخلوص بے اندازہ ہوتا گیا ۔ ساجد ان دنوں کالج میں بھی شاعر کی حیثیت سے کم پہچانے جاتے
، حسینی شاہد نے ابھی شاعری شروع بھی نہیں کی تھی ۔ مخدوم محی الدین ان دنوں سٹی
، میں استاد تھے ۔ ان سے ہمیں عقیدت تھی ۔ ان سے ملے تو یہ عقیدت محبت میں

بدل گئی۔ مخدوم کی شخصیت کے بانکپن۔ ان کے اخلاص ان کی شفقت جس میں بزرگوں کی مشفقانہ شان بھی تھی اور ساتھیوں کا مخلصانہ انداز بھی ہمیں بہت متاثر کیا اور ہم ان کے محبوب طالب علم سمجھے جانے لگے۔ ان کی صحبتوں نے جہاں ہمارے سوچنے اور سمجھنے کے راستے متعین کئے وہیں ہمیں اپنے اس قدر قریب کر لیا کہ ہماری ہیئت نے بھی ان کی پیروی شروع کر دی۔ ساجد نے اپنے بال ڈھلے حسینی شاہد کے بال پہلے ہی سے بلیک تھے۔ میں نے بالوں کی تھوڑی ہی لمبائی کے ساتھ ساتھ اپنی ٹوپی اتنی ٹیڑھی کر لی کہ مخدوم کی کلاہ کج بھی مات کھا گئی یہ باتیں ہمارے شعور کی نیم پختگی کے ساتھ ساتھ مخدوم کی بے اندازہ مقبولیت کی دلیل تھیں۔ یہ ہی اس مخلص تعلق نے جو مخدوم سے محبت کے جذبے کے سوا اور کچھ نہ تھی آغاز کیا کہ ہمارے انداز فکر کو جلد بلند کیا ذہنی سطح کو ہموار کیا اور ہمارے کردار کو استحکام بخشا۔ ساجد کی شاعری کا صحیح معنوں میں آغاز انھیں دنوں میں ہوا۔ اور مخدوم نے بہت فوری محسوس کیا کہ ساجد کی شاعری جو ابتداء ہی میں زبان و بیان کی نوک پلک سے آراستہ ہے بہت جلد ایک خوبصورت دلہن بن جائے گی۔ ان دنوں پروفیسر ابوظفر عبدالواحد نے بھی جو علم عروض کے ماہر ہیں ساجد کو ان کی صلاحیتوں سے آگاہ کیا اور ساجد ان کے بہت چہیتے شاگرد ہو گئے۔ انٹرمیڈیٹ کے سال دوم میں پہونچتے پہونچتے ساجد کالج کی چار دیواری میں شاعر کی حیثیت سے بہت مقبول ہونے لگے۔ میں ان دنوں میٹرک کے آخری سال میں تھا۔ کالج سکشن کو ساجد اور شاہد مل گئے تھے۔ ہائی اسکول سکشن میں منیرالدین شرر تھے۔ غلام مصطفےٰ ساغر تھے اور میں تھا۔ کاوش حیدرآبادی ہائی اسکول ہی سے تعلیم ختم کر چکے تھے اور انھیں کالج چھوڑ کر غالباً زیادہ دن نہیں ہوئے تھے لیکن انھیں شاعر کی حیثیت سے کافی لوگ جاننے لگے تھے۔ ہائی اسکول سکشن سے کالج کے باہر جن شاعروں کے نام سے تھوڑے بہت لوگ واقف ہوئے ان میں میں بھی تھا۔ لیکن کالج سکشن میں میرا سکہ نہ چل سکا کیونکہ لطیف ساجد بڑے اطمینان سے مورچے پر

ڈٹا ہوا تھا اور اس کو مٹانا میرے لئے مشکل بھی تھا۔ پہلے پہلے ہائی اسکول سکشن اور کالج سکشن کی روایتی رقابت نے شاعروں کی بھی جماعت واری تقسیم کردی تھی۔ لیکن میری، ساجد ... اس رقابت کو رفاقت سے بدل دیا اور دونوں سکشنوں میں ہمارا حلقۂ احباب مشترکہ طور پر بہت وسیع ہو گیا۔

اب ہماری ملاقاتوں اور راز و نیاز کے لئے کالج کے لیثر پیریڈس (LEISURE PERIODS) اور انٹرول کا وقت کافی نہ ہونے لگا۔ میرے گھر پر یا پھر ہوٹل میں ہم تینوں ملا کرتے۔ نئی نظمیں اور غزلیں ایک دوسرے کو سناتے اور خوب پڑھتے۔ یا پھر غلام دستگیر جمیا کے گھر پر ملاقاتیں ہوتیں۔ وہاں ہماری شاعری کم چلتی اور جمیل صاحب کا ادب لطیف زیادہ چلتا یہ مخصوص صنف ادب جمیل صاحب ہی کی طرح مختصر ہوتی اور دلچسپ بھی پتہ نہیں کہ جمیل صاحب کی اختراع بھی ہو۔ اس میں مضمون کم ہوتا تھا۔ علامتیں زیادہ ہوتی تھیں ۔ وہ کچھ اس طرح لکھتے تھے۔

آہ!! رادھا! ــــ اور رادھا کو ناگن نے ڈس لیا!؟؟ ــــ پڑھنے میں چونکہ ان علامتوں کا اظہار نہ ہو سکتا تھا اس لئے ان کے سنانے کا انداز پڑھنے سے مختلف نہ تھا۔ پڑھ کر سناتے وقت وہ نوٹ بک اس انداز سے ہمارے سامنے رکھتے کہ ہم نوٹ بک پر ان کی رینگتی ہوئی انگلی کو بھی دیکھ سکیں ــــ آہ (اور ہم نے انگلی کی طرف دیکھا) پہلے دو سوالیہ علامتیں ایک لمبا ڈیش ــــ رادھا (بھیگی ہوئی رادھا) پہلے لمبا ڈیش بعد میں دو تین علامتیں۔ ہم کبھی انھیں چھیڑتے کبھی ان کی معصومیت پر رحم کھاتے۔ ساجد کہتا کہ جمیل میاں اس تمہاری

رادھا کو تم کبھی ناگن سے ڈسواتے ہو کبھی غنڈوں سے مٹولتے ہو لیکن بے رحم اتنے ہو کہ اس کو چین سے مرنے نہیں دیتے بھی مر جانے دو نا فوری بیچاری کو۔ یہ اتنے ملبے ملبے ٹریٹس۔ اتنی بہت ساری علامتیں۔ رادھا کا کرب ہم سے دیکھا نہیں جاتا اور میں شہ دیتا، کہیں اس کے مرنے سے قبل ہماری موت نہ واقع ہو جائے" شاہد کہتا کہ ہاں بھئی رائٹر کو اپنے کرداروں سے انصاف برتنا چاہیئے اور جمیل بھائی برہم ہو کر اندر چلے جاتے۔ واپس ہوتے تو ان کے ہاتھ میں بڑی سائز کا کوئی ہفت روزہ رسالہ رہتا" پارس ہفت روزہ دہلی" اور ہم دیکھتے کہ جمیل میاں کا ادب لطیف اپنی ساری کی ساری علامتوں کے ساتھ بہت نمایاں طور پر شائع ہوا ہے۔ جمیل بھائی کچھ اس انداز سے ہمیں دیکھتے جیسے چیلنج کر رہے ہوں کہ تم شاعر و چھپوا دو نا اپنی نظم تب جانیں۔

ایک دن ساجد، میں اور شاہد ابوظفر صاحب کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ساجد کی ایک تازہ نظم" نوجوان بیوہ" کی وہ تعریف کر رہے تھے جس کی ان دنوں کالج میں دھوم تھی۔ جمیل آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ہم نے انھیں بلایا۔ ساجد نے ابوظفر صاحب سے کہا آپ سے ملئے آپ غلام دستگیر جمیل ہیں بہت اچھا" ادب لطیف" لکھتے ہیں اور آپ کا" پارس" کا معیار ہے" پارس" کا معیار۔ اس انداز سے ساجد نے تعارف کرایا کہ ابوظفر صاحب اپنی ہنسی نہ روک سکے۔ جمیل نے دو روز تک بات نہ کی۔ ساجد نے بہتیرا منایا۔ دو روز گزر گئے تو ساجد بہت بے چین ہو گیا۔ تیسرے دن شام کو حسب وعدہ میرے گھر نہ آیا۔ چوتھے دن کالج میں مجھے جمیل اور ساجد ساتھ ساتھ دکھائی دیئے۔ جمیل نے

کہا کہ کل شام ذات شریف میرے گھر آئے تھے۔ میں ملا نہیں کہلوا دیا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ دروازہ حسبِ دستور قدیم بند کر دیا گیا اور آپ چوکھٹ پر ٹکے رہے رات کے دس بجے کے قریب میرا چھوٹا بھائی سینما سے لوٹا تو اس نے کہا کہ آپ کے وہ دوست اب تک چوکھٹ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں باہر نکلا تو پوچھ لو اس سے۔ اس کی کیا حالت تھی۔!

کالج کے آخری زمانے میں اپنی معاشی زبوں حالی کے سبب ساجد کو تعلیم ترک کر دینی پڑی۔ انٹر فائینل کا امتحان قریب تھا وہ امتحان کی فیس داخل کر سکتا تھا کئی ماہ کی ماہانہ فیس بھی اس پر واجب الادا تھی۔ میں بھی ریاضی کیمیا اور طبعیات کے خشک مضامین سے تنگ آچکا تھا۔ ہم نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ کالج کی بجائے آصفیہ لائبریری میں دن گذارے جائیں۔ گھروں سے نہایت سعادت مندانہ انداز میں ہم اپنی اپنی کتابیں بغل میں داب کر ٹھیک وقت پر نکل جاتے اور ہماری ملاقاتیں آصفیہ لائبریری میں ہوتیں۔ دس بجے سے چار بجے تک ہم لائبریری ہی میں گذارتے میرا ایک راز دار ملازم دوپہر کا کھانا دہیں لے آتا۔ یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا۔ ان دنوں ہم احسان دانش کی شاعری اور ان کی زندگی سے بہت متاثر تھے۔ ہم نے کہیں پڑھ لیا تھا کہ احسان دانش روزانہ تین سو سے زائد صفحات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ گھر میں چراغ جلتا نہیں ہے تو فٹ پاتھ کے چراغوں کی روشنی میں وہ کتابیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم نے بھی طے کیا کہ روزانہ تین سو صفحات پڑھیں گے۔ آصفیہ لائبریری میں مہینوں تک ہم نے اسی جذبے کے تحت پناہ لی۔ گستی کتب خانہ ذاب پاکستان منتقل ہو گیا ہے۔ ان دنوں شباب پر تھا۔ آصفیہ سے نکل کر

شام کو ہم گشتی کتب خانے سے کتابیں لے لیتے اور گھر جا کر رات کو پڑھتے - کم از کم تین سو صفحات روزانہ پڑھنا ہمارا معمول بن گیا تھا - ان دنوں سے ساجد کو مطالعہ کی ایک عادت سی ہو گئی تھی - وہ رات کو سونے کے لئے بستر پر جاتا تو کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ اس کے ساتھ ضرور ہوتا - خواہ وہ کسی عالم میں رہے کچھ نہ کچھ پڑھے بغیر سو نہ سکتا تھا - مرنے سے چند دن پہلے تک آصفیہ لائبریری کی اس دین کو اس نے سینے سے لگائے رکھا - اس کے تقاضے پر میں نے کرشن کی "میں انتظار کروں گا" گورکی کی "CHILD HOOD" اور شاہراہ کے چند پرچے اس کو لیجا کر دیئے تھے - وہ باوجود کوشش کے ان میں سے کچھ بھی نہ پڑھ سکا - کتابیں قریب رکھ کر انھیں دیکھتا اور اس سے اس کو تسکین ہوتی یکم مارچ کی شام جس رات اس کا انتقال ہوا - شحنہ صاحب "گجر" کا پہلا شمارہ اس کے لئے آئے - ساجد نے بڑی حسرت سے شحنہ صاحب سے کہا "اب میں پڑھ کہاں سکتا ہوں بھائی - معلوم نہیں میری کتنی عزیز چیزیں مجھ سے چھوٹتی ہیں"

بقول مخدوم - زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے - ساجد کی کیا کیا باتیں یاد کروں - آصفیہ لائبریری کی مختصر زندگی کے آخری دنوں میں ساجد بہت اداس اداس رہنے لگا - اس کی جولانیٔ طبع ماند پڑ گئی - وہ پڑھتا کم اور کھلی ہوئی کتاب پر نظر جمائے ہوئے سوچتا زیادہ - مفلس ماں باپ - آٹھ دس بھائی بہنیں - چھوٹے بھائی کو پاؤں کی دق - کبھی سوکھی روٹی، کبھی فاقہ - سب کی امیدیں ساجد سے وابستہ - ایک دن میرے پہلو میں بیٹھا ہوا وہ کتاب کو گھور رہا تھا - میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو رہا - لیکن میں غیر مطمئن تھا - یکا یک ساجد اٹھا اور آنکھوں پر دستی رکھ کر لائبریری کے باہر نکل گیا -

اس کے بعد ہمارا لائبریری آنا جانا بند ہوگیا اور ساجد نے کسی دفتر میں نقل نویسی شروع کر دی اس کی اس نو عمری ہی میں دفتریت نے اس کے دل پر گہرے زخم لگائے۔ اس کے نازک احساسات ان جراحتوں کے متحمل نہ ہو سکے اور وہ بہت جلد اس ماحول سے اکتا گیا۔ ایک دن دوپہر کو کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ساجد کھڑا تھا۔ میں نے دفتر نہ جانے کی وجہ پوچھی۔ اس نے کہا کہ دفتر ہی سے آرہا ہوں اور اب کبھی نہیں جاؤں گا تازہ نظم کہی ہے سنیئے گا۔ ؟" میں نے کہا "ضرور سنوں گا۔ تم اندر آجاؤ" ۔۔۔ کچھ دفتر سے متعلق باتیں ہوئیں۔ پھر میں نے تقاضہ کیا کہ نظم سناؤ۔ اس نے جیب سے پسینے میں بھیگا ہوا کاغذ نکالا اور پہلی بار تحت اللفظ سنانے لگا۔ نظم میں دفتری ماحول اور ارباب اقتدار کی ذہنیت پر طنز تھا۔ نظم ختم کرتے کرتے اس پر رقت طاری ہوگئی اور بعد کے اشعار وہ پڑھ نہ سکا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا۔ جس مصرعہ پر وہ رک گیا تھا وہ تھا۔ ع

جس جگہ حسنِ یقین دل بھی غرق اشتباہ

یہ نظم بعد میں "الموسیٰ" میں شائع ہوئی تھی جس کو اس نے میرے نام سے معنون کیا تھا۔ دیر تک ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کا موڈ کچھ ٹھیک ہوا تو اس نے مجھ سے پوچھا " تو کچھ کھویا کھویا سا ہے۔ کیا بات ہے۔ کیا خط نہیں آیا" میں نے کہا "خط آیا ہے اور مجھے بلایا ہے"۔

سچ

ہاں

بہت مدت ہوئی تجھے ان کو دیکھے ہوئے۔

ہاں پیارے

کب بلایا ہے

ابھی کوئی پون گھنٹہ باقی ہے۔

کیسے ممکن ہوا

پھوپی اماں کہیں جا رہی ہیں لیکن گھر میں دوسرے بچے اور ملازمین ہیں۔

پھر جائے گا کیسے

برقعہ پہن کر۔ تیرے ساتھ

برقعہ پہن کر؟

ہاں؟

تو پھر برقعہ سہی

اونھوں

تقریباً پون گھنٹہ تو ہے نا۔ بس میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔

آدھ گھنٹے ہی میں ساجد سیکل دوڑاتا چلا آیا۔ ہینڈل پر برقعہ —— بغل میں تیرے پسینے میں شرابور —— میں نے پوچھا کہاں سے لا رہا ہے "چھوڑ کبھی یہ باتیں بتلاؤں گا" —— مشکل حل ہوئی۔ میں نے برقعہ پہنا۔ برقعہ مجھے چھوٹا پڑا۔ ساجد کہنے لگا چلتے وقت پیروں کا خیال رکھنا ہوگا۔ ہم دونوں ہنسے۔ مجھے خوش دیکھ کر وہ اپنا سارا دکھ درد بھول گیا تھا۔ میں نے ساری باتیں اس کو سمجھا دیں وہ کس قدر بشاش نظر آ رہا تھا۔ ٹھیک وقت پر ہم گھر سے نکلے وہ گنگنا رہا تھا۔

دھیرے دھیرے چلتے پائل کھڑکانا
پیا ملن تو جانا

میں برقعے کے اندر مسکرا رہا تھا۔ برابر سے ایک صاحب مجھے تاکتے ہوئے گذرے۔ ساجد نے قریب ہو کر آہستہ سے کہا "پیروں کو چھپا لے۔ پیروں کو چھپا لے" گلی آ پہونچے تو میں نے چال تیز کر دی اور ساجد سے کہا۔

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے

وہ کہنے لگا اور سینۂ شمشیر کون دیکھے گا" گھر پر پہونچے تو ساجد نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ملازم باہر آیا تو اس نے کہا کہ بیگم صاحبہ سے کہنا حرمت بی خالہ آئی ہیں۔ ملازم نے مڑتے ہوئے جواب دیا" بیگم صاحبہ گھر میں نہیں ہیں" ساجد نے چھوٹتے ہی کہا۔ "چلو اچھا ہوا پھر تو صاحبزادی ہی سے کہدو بھئی" ملازم چلا گیا تو ساجد نے کہا CONFIRMED ملازم پھر واپس آیا "چلئے بلاتے ہیں حرمت" خالہ دھڑکتے دل سے دروازے میں داخل ہوئیں۔ ملازم کے سوال کے جواب میں ساجد گھبرائے ہوئے انداز میں جلد جلد کہہ رہا تھا "میں حرمت خالہ کا بیٹا ہوں۔ گھنٹے بھر سے آؤں گا۔ مجھے کام ہے یا لیشہ کرسی کی ضرورت نہیں"

دفتر چھوڑ دینے کے بعد ساجد پھر اس سوچ میں رہا کہ کالج میں داخل ہو جائے میں نے حساب اور کیمیا کے آگے سپر ڈال دی تھی اور زیادہ تر وقت گھری پر گذرتا تھا۔ ساجد میرے پاس ہی آجاتا۔ یہ غالباً ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ شاہد برابر کالج جاتے اور شام کو ان سے ہماری ملاقات ہوتی۔ اسی زمانے میں وہ المومن کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ایک دن ہم نے مشترکہ طور پر فیصلہ کیا کہ اپنی نظمیں رسالوں میں شائع کروانا چاہیئے شاہد نے اپنی ایک نظم جو انھوں نے مخدوم سے متاثر ہو کر لکھی تھی "ہندوستانی ادیب" کو بھیج دی۔ اور ہم تینوں اس کے شائع ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ تازہ شمارہ

نکلا تو اُن کی نظم بھی اس میں شامل تھی۔ اب یہ مرحلہ مجھے اور ساجد کو طے کرنا تھا۔ یعنی شاہد میدان مار چکے تھے اور اب ہماری باری تھی۔ ہم نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ہم بھی "ہندوستانی ادب" ہی کو منتخب کریں کیونکہ ناکامی کی صورت دیکھنی پڑتی تو ہمیں زیادہ دکھ ہوتا اور شاہد کی فتح کے تعلق سے بات راست ہو جاتی۔ ابتدا میں ہر شاعر اور ادیب کو اس دور سے گذرنا پڑتا ہے چنانچہ میرے ذہن میں اس وقت کی ساری جزئیات محفوظ ہیں۔ کوئی راشد حجازی صاحب نے ایک ماہنامے "ارم" کا اجراء کیا۔ اس کا سالنامہ شائع ہونے والا تھا۔ میں نے اپنی ایک نظم جس کا عنوان "کیوں" تھا۔ بھیج دی نظم شائع ہوئی اور ایڈیٹر صاحب نے شکریہ کے ساتھ مزید قلمی تعاون کے لئے لکھا۔ اب رہ گئے لطیف ساجد وہ ابھی کہیں شائع نہ ہوئے تھے۔ شاہد کی متذکرہ نظم غالبًا ان کی پہلی اور آخری نظم تھی جو غالبًا ۱۹۴۱ء کے اواخر میں شائع ہوئی تھی۔ میری نظمیں ارم میں دو تین بار پھر شائع ہوئیں اور اس کے بعد "سب رس" کے کسی شمارہ میں "عشرتِ حزیں" کے عنوان سے ایک اور نظم شائع ہوئی یہ زمانہ ۱۹۴۲ء کے وسط کا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت تک بھی کالج میگزنس جیسے "المومن" اور "مجلہ عثمانیہ" کے سوا ساجد کسی دوسرے پرچے میں شائع نہیں ہوئے تھے جس کا انھیں دکھ تھا اور جس کی طرف وہ کبھی کبھی دبی زبان میں اشارہ کرتے تھے۔ درآں حالیکہ مشاعروں میں لوگ انھیں پسند کرتے تھے اور ان سے ادبی ذوق رکھنے والا طبقہ امیدیں وابستہ کر چکا تھا۔ اور سچ پوچھیے تو میں اور شاہد دونوں نے ہی دل ہی دل میں یہ محسوس کر لیا تھا کہ شاعر کی حیثیت سے ساجد ہمیں بہت پیچھے چھوڑ دے گا۔ یہ اور بات ہے کہ شاہد نے یہ بات فوری محسوس کی اور میں نے دیر سے۔

ہاں تو بات کہاں سے کہاں پہنچی ہے۔ امتحانات قریب تھے اور ساجد متفکر تھا اسے پھر سے کالج میں داخلہ مل جائے۔ ایک دن شام کو میرے گھر آیا۔ بہت اداس تھا۔ کہنے لگا کہ ابو ظفر صاحب کی مہربانی سے کالج میں شرکت کی توقع ہو گئی ہے لیکن "سخن در ایں است" اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر واپس ہو گیا۔ ان دنوں ہم نے ایک نیا ملازم رکھا تھا۔ دوسرے دن صبح ملازم غائب ہو گیا تو مجھے میز کے ڈرائر میں رکھی ہوئی اپنی پرس کا خیال آیا۔ میں نے پرس دیکھی تو دس روپے غائب تھے۔ بات صاف تھی مفرور ملازم کے نام پر فاتحہ پڑھ کر میں خاموش ہو رہا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ وہ پیسے ساجد کے کام آجاتے۔ تین چار دن تک ساجد نہیں آیا۔ مجھے اس کی کالج میں شرکت اور عدم شرکت کے متعلق کوئی اطلاع بھی نہ مل سکی۔ چوتھے یا پانچویں دن سہ پہر ساجد آیا۔ میں نے پوچھا "اتنے دن کیا کرتے رہے" اس نے جواب دیا کہ کالج میں کلاس اٹنڈ کرتا رہا لیکن دل و دماغ پر تیرا ہی تسلط رہا۔ میں نے کہا "اسی لئے تم نے شام کو آنے کی زحمت بھی نہ کی" ساجد نے نظریں نیچی کر لیں۔ کہنے لگا مجبور تھا اس لئے نہ آسکا" اس کے آگے وہ اور کچھ نہ کہہ سکا اور مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا میں حیران تھا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ سسکیاں لیتے ہوئے اس نے چپکے سے دس روپے کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس بڑائی پر میرا ضمیر آج بھی اسی کی پرستش کرتا ہے۔

ایک رات مجھے اپنی محبوبہ سے ملنے جانا تھا۔ ان دنوں مجھ پر بہت سی پابندیاں تھیں۔ اتفاق سے ایک دن قبل ہی میرے والد اور والدہ بھی گاؤں سے آگئے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ ملاقات کی کوئی سبیل نہ تھی۔ دوسرے دن

جب شاہد سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے ساری باتیں کہہ دیں۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا کہ کسی دوست کی شادی کر دیں۔ اب سوال یہ تھا کہ شادی کسی ایسے دوست کی کی جائے جسے والد اور والدہ بھی جانتے ہوں۔ نظر انتخاب ساجد پر پڑی۔ اسلئے کہ وہ میرے خاندان کے ہر فرد کا چہیتا تھا۔ شاہد نے اسی دن پندرہ بیس رقعے ساجد کے والد محترم کی جانب سے چھپوا دیئے۔ رقعہ والد صاحب کو بتلا کر میں نے رات باہر گذارنے کی اجازت حاصل کر لی۔ بات یہیں تک ختم ہو جاتی تو کوئی بات نہ تھی۔ ہم نے شرارت یہ کی کہ بقیہ رقعے دوست احباب میں تقسیم کر دیئے۔ بعض وقت اتفاقات عجیب ہوتے ہیں۔ جس گلی میں ساجد کا گھر تھا اسی گلی کے ایک دوسرے گھر میں "بسم اللہ" کی تقریب تھی۔ ساری گلی اور باہر کے کچھ حصے کو جھنڈیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ لوگ نہایت اطمینان سے ساجد کے گھر پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ شادی بیاہ کچھ نہیں ہے۔ لوگ رقعے پیش کرتے اور ساجد کے والد دیکھنے کے بعد دیگرے سب کو سمجھاتے کہ بھئی معلوم نہیں لطیف شریف سے کس دوست یا دشمن نے یہ شرارت کی ہے۔ ساجد اس وقت گھر پر موجود نہ تھا جو خود نپٹ لیتا۔ ساجد کے والد بہت منکسر المزاج اور خلیق الطبع بزرگ ہیں۔ انھوں نے مسلسل دعوتیوں کی یورش دیکھی تو باہر چبوترے پر آکر بیٹھ گئے۔ ہر آنے والے کو سمجھاتے اس سے معافی مانگتے۔ میں اور شاہد آنے جانے والوں کی نظروں سے چھپ کر دور کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ دوسرے دن شام کو ساجد سے ملاقات ہوئی تو میں اور شاہد اس کی متوقع برہمی سے خائف تھے لیکن ساجد ہمیں دیکھتے ہی مسکرانے لگا۔ اس نے کہا کہ مجھے یقین تھا کہ

اس قسم کی شرارت تم دونوں کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ تم نے نوشہ کو رقعہ نہیں دیا ورنہ نوشہ میاں چلئے پانی کا انتظام تو کر ہی دیتے۔ احباب اپنی دودر آ کر مایوس لوٹے ہوں گے اور اب میں واقعی شادی کروں بھی تو میری شادی میں سوائے تم دونوں کے کون آئے گا اور تم دونوں بھی اسلئے آؤ گے کہ تم نے اس شادی میں شرکت نہیں کی؟

بی اے کرنے کے بعد ساجد نے پہلے پہلے کچھ دن اخباروں میں کام کیا۔ یہ کام اس کے فطری مذاق کے مطابق تھا لیکن اس سے معاشی فراغت اسے حاصل نہ ہو سکی۔ دو دو ماہ اسے تنخواہ نہ ملتی اور اگر ملتی بھی تو پوری نہ ملتی اور پھر اس کی ذمہ داریوں کا لحاظ کرتے اس کو جو کچھ ملتا وہ بہت کم ہوتا۔ اس کی ملازمت کا وہ زمانہ جب کہ وہ ریڈیو اورنگ آباد میں تھا نسبتاً بہتر گذرا۔ ذہنی آسودگی کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت معاشی سکون بھی اس کو ملا۔ میر حسن اور ظفر الحسن کا بھی ان دنوں اورنگ آباد ریڈیو سے تعلق تھا۔ وہ اکثر ان کا ذکر بڑے خلوص سے کرتا۔ جب تک ریڈیو اورنگ آباد سے اس کا تعلق رہا اور جب کبھی اس کو موقع ملا اس نے کوئی نہ کوئی پروگرام میرے لئے فراہم کیا۔ مجھ سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی اور بارہ پندرہ روپئے کی سبیل کردی۔ اس سے زیادہ کچھ کر سکتا تھا۔ ریڈیو کی نوکری کے بعد ساجد محکمہ مارکٹنگ میں مہتمم ہو گیا۔ میں نے والد کے زمانہ ملازمت میں ایک مہتمم صاحب مارکٹ کو دیکھا تھا اور ان کے محکمہ کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو کم از کم ساجد اپنی تہی دستی اور زبوں حالی کا انتقام تو لے سکے گا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ساجد اس خدمت کے لئے انٹرویو کو جا رہا تھا تو اس کے پاس ڈھنگ سے پہننے کے لئے کپڑے تک نہ تھے۔ میں ان دنوں موسیٰ رام باغ میں مقیم تھا۔

ساجد بھی دو روز سے میرے پاس ہی تھا۔ میں نے اپنا سوٹ پہنا کر ٹائی باندھ دی تو ساجد نے قد آدم آئینے میں اپنے کو دیکھا۔ کہنے لگا کہ سوٹ پہن کر آدمی کس قدر معتبر ہو جاتا ہے۔ انٹرویو میں چن لیا جاؤں تو اس "معتبری" کی انتہا کر دوں۔ ساجد انٹرویو میں چن لیا گیا۔ مہتمم مارکٹ بنا۔ مرنے تک مہتمم مارکٹ رہا۔ لیکن جب کبھی حیدرآباد آیا۔ میرے سوٹ پہنتا رہا۔ یادگیر سے اس کا تبادلہ ہنگولی ہوا تو قرض خواہوں نے سامان اٹھنے نہ دیا۔ سات آٹھ سال تک مہتمم مارکٹ رہنے کے بعد بھی وہ ایک اچھا سوٹ نہ سلوا سکا۔ ساجد اپنی صحت کے زمانہ میں آخری بار جب حیدرآباد آیا تھا تو اس نے اپنے کپڑوں کے لئے سو، سوا سو روپے فراہم کئے تھے۔ دو اوسط درجہ کے قمیص اور پتلونوں کا کپڑا اور ایک ریڈی میڈ اچھا سا بشرٹ خریدنے کے بعد اس نے مجھے اور سردار سلیم کو بئیر پلائی۔ ہم ٹیلرنگ فرم پہنچے تو ایک سلیٹ کلر ٹرا پیکل اس کو بہت پسند آیا۔ فرم کے مالک سے چونکہ میری شناسائی تھی اسلئے ساجد سے پیشگی کچھ لئے بغیر ہی اس نے آرڈر بک کر لیا اور طے پایا کہ وہ آنے والے مہینے کی پہلی تاریخ کو اس کا کوٹ ذریعہ وی پی ہنگولی بھیج دے۔ لیکن پہلی تاریخ سے پہلے ہی ساجد کا خط ٹیلرنگ فرم کو وصول ہوا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کے مکرر خط لکھنے تک وی، پی نہ کیا جائے۔ یہ ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے جبکہ وہ ہنگولی میں شدید بیمار تھا اور بہت زیر بار ہو چکا تھا۔ فرم کے مالک نے کچھ دن انتظار کے بعد وی، پی بھیج دیا۔ معلوم نہیں ساجد کس طرح وی۔ پی چھڑا سکا۔ کوٹ کا آرڈر بک ہونے پر ساجد بہت خوش تھا۔ اس نے سردار سلیم سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ کوٹ پہن کر جب میں کمرہ نمبر ۱۲ آؤں گا تو ادیب بھی

فیسی اور عشرت کو بہت مرعوب کروں گا۔ سالے مانیں گے نہیں تجھے گواہی دینی ہو گی کہ کوٹ بلاشرکتِ غیرے لطیف ساجد کی ملکیت ہے لیکن ساجد پھر کمرہ نمبر ۲ اپر نہیں آیا۔ اس کے کسی دوست نے اس کو کوٹ پہنے نہیں دیکھا۔ اس کی زندگی کو تو شاید محرومیوں ہی سے معتبر ہونا تھا۔ سو اس نے اس معتبری کی انتہا کر دی۔

یاد گیر سے پہلے جب ساجد منیجر پال کی مارکٹ پر تھا تو میری پوسٹنگ آبکاری کے پروبیشنر سب انسپکٹر کی حیثیت سے وہیں ہوئی تھی کالج کی زندگی ختم کر کے میں عملی زندگی میں قدم رکھ رہا تھا تو مجھے اس قدر اطمینان تھا کہ ساجد یہاں بھی میرے ساتھ ہے۔ ساجد کو اس بات کی اطلاع ملی تھی تو اس کی حالت فرطِ مسرت سے غیر تھی۔ اس نے مجھے مبارکباد کے خط لکھے۔ میرے وہاں آنے پر دیوانہ وار خوشی کا اظہار کیا لیکن میں نے اس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ یہی سوچتا رہا کہ جانے کی تاریخ متعین ہو جائے تو اس کو اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع کر دوں گا۔ ویسے خطوط کے جوابات نہ دینے پر اس کو ہمیشہ مجھ سے شکایت رہی۔ میرے پہونچنے میں تاخیر ہوتی گئی تو ساجد تین دن کی رخصت اتفاقی لیکر حیدرآباد پہنچ گیا۔ سیدھے میرے گھر آیا۔ آتے ہی پوچھنے لگا کب چل رہے ہو۔ کہیں عادل آباد سے گھبرا کر تبدیلِ مقام کی کوشش میں تو نہیں لگ گئے، میں نے یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ الٹا اس سے شکایت کی کہ پرسوں رات کی ٹرین سے جب کہ میں وہاں جا رہا ہوں تو یہاں آگیا ہے۔ ساجد حسبِ عادت مسکرا دیا۔ مجھے ایک چپت رسید کی

کہنے لگا کہ تین روز کی رخصت پر آیا ہوں۔ اگر پرسوں تیرا جانا ضروری ہے تو تیرے ساتھ ہی چلوں گا" یہ صرف اتفاق ہے کہ مہتمم مارکیٹ کی حیثیت سے ساجد کی پوسٹنگ پہلے منچریال پر ہوئی اور مجھے بھی منچریال جانا پڑا۔ ہم ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں بسا اوقات حصہ دار رہے ہیں لیکن مرنے سے قبل ساجد نے شاید زمانے کے سارے غم اپنے حصے میں لے لئے تھے۔ مرنے تک بے پناہ جسمانی تکلیفوں کے ساتھ وہ بے شمار ذہنی اذیتوں میں بھی مبتلا رہا اور آخر کار بقول عزیز قیسی اس نے موت سے چپ چاپ مفاہمت کر لی۔

میں اور ساجد پولیس ایکشن تک منچریال ہی میں رہے۔ ان دنوں بھی ساجد کو معاشی آسودگی نصیب نہ تھی۔ میرا موقف بھی ٹھیک نہ تھا کیونکہ والد صاحب میرے تعلیم ترک کر کے ملازمت اختیار کر لینے پر خوش نہ تھے۔ ساجد کی بیوی اپنے میکے میں تھیں اور میری بیوی اپنے سسرال میں اور ہم دونوں منچریال میں ایک دوسرے کے زخم کا مرہم بنے ہوئے تھے۔ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ جیبیں خالی تھیں۔ اناج بھی ختم ہو گیا تھا جس سے میں لاعلم تھا۔ ساجد اس مارکیٹ کا اعلیٰ عہدیدار تھا جس مارکیٹ میں اناج کی بوریوں کی بوریاں بھری ہوئی تھیں۔ ایک دن صبح اٹھ کر ساجد نے مجھ سے کہا کہ اس کی کہیں دعوت ہے اور منہ ہاتھ دھو کر کہیں چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے میرے ناشتے کا انتظام کروا دیا۔ ہم جن صاحب کے پاس مقیم تھے وہ جنگلات کے گتہ دار تھے۔ ان دنوں وہ بھی دو روز سے کہیں دورے پر گئے ہوئے تھے۔ میں نے تنہا ناشتہ کر لیا۔ چائے پی رہا تھا کہ ساجد لوٹ آیا۔ اس نے خلافِ معمول دو کپ چائے غٹاغٹ پی لی مجھے گل مہوے کی وصولی کے سلسلے میں متعلقہ انسپکٹر کے ساتھ قریب ہی کے ایک موضع کو جانا تھا۔ ساجد نے دفتر کی راہ لی اور میں

اپنے کام سے چلا گیا۔ شام کو لوٹا تو ساجد سو رہا تھا میں نے سوچا کہ تنہائی سے اکتا کر اس کی آنکھ لگ گئی ہو گی۔ اس کو جگانا چاہا تو ملازم نے مجھ سے کہا کہ "صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے انھوں نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں"۔ میں سمجھ گیا باورچی سے جو ایسے مواقع پر ہمارا ہمراز رہ چکا تھا، میں نے رات کے کھانے کی تیاری سے متعلق پوچھا۔ اس نے کہا کہ "صاحب سب انتظام کر کے سوئے ہیں۔ مجھ سے کہہ دیا ہے کہ کھانا تیار ہوتے ہی انھیں جگا دوں"۔

برسات کی ایک شام تھی بھیگا ہوا موسم تھا۔ سورج وقت سے پہلے چھپ گیا تھا۔ ماحول پر اداسیاں چھائی ہوئی تھیں۔ ہمارے دلوں کی بھی یہی حالت تھی، بیزاری، گھٹن، تنہائی۔ دور افتادہ پیاروں کی یاد۔ شام دوسرے احباب کے ساتھ ہم نے گذار لی باتیں کرتے کرتے ساجد گنگنا لیتا۔

ہم بستروں پر گئے تو نیند نے نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی کبھی خاموشی، کبھی بے مقصد گفتگو، اس سے بھی کام نہ چل سکا تو ساجد جست لگا کر پلنگ سے کود پڑا کہنے لگا چچا غالب سے جی بہلائیں۔ غالب کا دیوان کھولا تو پہلے اسی شعر پر نظر پڑی۔ ساجد نے شعر پڑھا ؎

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

غالب نے کس انداز سے کس زمانے میں یہ بات کہی تھی۔ یہ تو بالکل آج کا شعر تھا۔ ہم مسلسل یہی شعر گنگناتے رہے شعر دل میں اترتا گیا۔ دل بہلانے چلے تھے۔ بات الٹی ہو گئی۔ دامن ضبط چھوٹ کر رہا۔ دلوں سے غبار چھٹا تو

ذرا سکون ملا - پھوار رک چکی تھی - رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی - میں رُوٹھی ہوئی نیند سے سمجھوتہ کر رہا تھا - ساجد کی آواز جیسے دور سے میرے کانوں میں آ رہی تھی سے

تیری دفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اِدھر کچھ مدت سے ساجد تقریباً روز پینے لگا تھا - ویسے میں نے اس کو کبھی آپے سے باہر ہوتے ہوئے نہیں دیکھا - جس محفل میں پیتا اس محفل کے آداب کو ملحوظ رکھتا - پینے کے بعد بھی میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ اس نے کسی کی دل شکنی کی ہو - مخصوص اور قریب ترین دوستوں کی محفل میں بھی کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ زیر بحث آتا تو وہ اس وقت تک ہی مباحثے میں حصہ لیتا جب تک کہ مباحثے کی فضا نرم اور خوشگوار رہتی - بات کہنے یا سننے کے انداز میں ذرا سا بھی فرق پڑ جاتا تو وہ گنگنانے لگتا - دھیمے سُر سے اس کا مقصد پورا نہ ہوتا تو اونچی آواز میں گنگناتا اور کسی نہ کسی طرح گفتگو کا موضوع بدل کر دیتا -

حیدرآباد کے دورانِ قیام میں وہ زیادہ تر میرے پاس رہتا - پی کر جب کبھی گھر آتا نہایت سنجیدہ بن جاتا - باہر دیوان خانے ہی میں بیٹھ رہتا - اور آتے ہی پوچھتا کہ کہیں حیدی جاگ تو نہیں رہی - منیر بھی مصلحتاً بستر میں دبکی رہتی - میں اسے اندر لے آتا - وہ دھیمی آواز میں گفتگو کرتا - چپ چاپ جو کچھ مل جاتا کھا لیتا اور پڑ رہتا - اس عالم میں منیر کا سامنا ہو جاتا تو وہ بڑا عجیب عجیب سا دکھائی دیتا - ساجد کو زندگی بھر نہ معاشی سکون حاصل ہو سکا نہ ذہنی

گھر میں کوئی بات ناگوارِ خاطر ہوتی تو اس کی خاموشی راز فاش کر دیتی۔ ایسے لمحات میں وہ بڑا حساس ہو جاتا۔ چپکے سے میرے پاس چلا آتا اور میری معمولی سی لغزش بھی اس وقت اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ ساجد اپنی صحت کے زمانے میں جب آخری بار حیدرآباد آیا تھا تو ایک بار رات دیر گئے میرے پاس پہونچا۔ مکان کی گھنٹی بجی تو میرا خیال اس کی طرف منتقل نہ ہوا۔ دروازہ کھولنے پر معمولی سی تاخیر ہوئی تو ساجد لوٹ گیا۔ مجھے جب اپنے نئے ملازم سے جو ساجد کو نہیں جانتا تھا معلوم ہوا کہ کوئی بھاری بھرکم سجاد صاحب تھے تو میں باہر بھاگا۔ ساجد بہت تیز تیز واپس جا رہا تھا۔ میں پیر دبا کر اس کے پیچھے بالکل قریب پہنچ گیا تو ساجد روتا ہوا تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کو میرے پیچھے پیچھے آنے کا احساس نہ تھا۔ میں نے پیچھے سے اس کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لئے۔ وہ مڑ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کرتا تو میں اس کے پیچھے چھپ جاتا۔ وہ ہنس پڑا۔ جب میں اس سے لپٹ گیا تو کہنے لگا کہ اگر تیرا دروازہ بھی میرے لئے بند ہو جائے تو بس میں جی چکا۔

اس کی بیماری کے زمانے میں ہم جب بھی جاتے کسی نہ کسی طرح اس کو ہنسانے کی کوشش کرتے لیکن اس کے سامنے ہنستے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔ اس حالت میں بھی ساجد کو اپنے احباب کی راحت کا خیال رہتا۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ میں دیر تک ساجد کے پاس بیٹھا رہا تو اس نے مجھ سے بار بار گھر جانے کے لئے کہا۔ بچوں کی مزاج پرسی کی۔ بڑوں کو پوچھا۔ ایک دن قیسی ملنے کے لئے آیا چار دن کی طویل غیر حاضری کے بعد وہ بہت شرمندہ تھا۔ ساجد کے بستر کے قریب پہونچا تو اس نے کہا کہ مسخرے تو کیوں عذر لنگ کی تلاش میں ہے ساجد کے لب و لہجے نے قیسی کی ہمت

بندھی تو اس نے چار دن کے غیاب کی کسر نکال دی۔ شاہد صدیقی کے لطیفے۔ جگر مرادآبادی کا تذکرہ۔ اریب کی نئی غزل شاذ تمکنت کی تازہ نظم غرض کہ ہر طرح اس کو بہلاتا رہا۔ ساجد اس عالم میں بھی بڑے اطمینان سے اشعار سنتا رہا۔ جب میں نے اریب کی غزل سنائی تو ساجد نے یہ شعر یاد کر لئے۔

بہت عجیب ہے یہ داستانِ جرم و سزا
کبھی بہ پاسِ صداقت بھی منہ نہیں کھلتا

گذر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم سے
حیات دیکھ کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

اور کہا کہ تنہائی میں تحت اللفظ پڑھ لوں گا کیونکہ گنگنانا اب میرے بس میں نہیں۔

ساجد نے زندگی کے ہر موڑ پر صبر و تحمل سے کام لیا۔ بیماری کے زمانے میں جب وہ عثمانیہ ہاسپٹل میں تھا تو ایک دن کیفی اعظمی، عالم خوندمیری اور اختر حسن اس سے ملنے آئے۔ کیفی نے کہا کہ بڑی امریکن قسم کی بیماری معلوم ہوتی ہے تمہاری لیکن جب تم صحت یاب ہو جاؤ گے تو بہت گورے ہو جاؤ گے۔ ساجد نے جواب دیا کہ کوئی امریکن چیز آدمی کو خوبصورت نہیں بنا سکتی یوں کہو کہ چت کبرا ہو جاؤں گا۔ ان دنوں ساجد کا جسم سرتاپا زخم بنا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر خیال آتا کہ اس کے اندر چھپے ہوئے سارے زخم باہر نکل آئے ہیں۔ یہ ساجد کی بدنصیبی تھی کہ جن لوگوں نے اس کے زخمی جسم کا علاج کیا۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اس کے دل کے کسی زخم کو دیکھنے کی کبھی زحمت نہیں کی۔

ساجد نے ہنگولی سے ۵؍ ستمبر ۶۷ء کو مجھے آخری خط لکھا تھا۔ اس کا مرض الموت شروع ہو چکا تھا۔ نہ خود اس کو خبر تھی نہ ہم میں سے کسی کو۔

اس نے لکھا تھا۔

"میں آج کل اپنے سر میں بری طرح "پھیل گئے" پھوڑوں کے علاج میں مصروف ہوں۔ پورے سر کی "خشخشی" کروا چکا ہوں۔ اس کے باوجود لوگوں کا کہنا ہے کہ بھولے میلوا سے ہاتھ تک نہیں ملا سکتا۔ لیکن کفِ افسوس ملنے کے بعد اس عارضہ کو دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھ رہا ہوں ـــــ یعنی کہ

"آج زخمِ سر بہتر دل پہ چوٹ کھانے سے"

ہم دونوں یوں تو ہم دلی میں بدنامی کی حد تک مشہور تھے ہی۔ اس کے بعد "ہم جسم" بھی ہو گئے۔ اور اب تو "ہم سر" بھی کہلائیں گے کہ "ڈاکٹر کی رائے ہے کہ میری چندیا ہمیشہ کے لئے" فارغ البال "رہے گی۔

"ہم سلامت رہیں ہزار برس" !!

اور تین ماہ کے اندر ہی یکم مارچ کی شب کو ساجد نے زندگی سے ناطہ توڑ لیا۔

نظیر علی خاں نظیری

محترم نظیر علی خاں نظیری جن کو میں "چھوٹے چچا" پکارتا تھا۔ بزرگ ہونے کے باوجود ساجد کی شاعری سے متاثر تھے۔ ہم دونوں سے اس طرح ملتے جیسے ہم ان کے برابر ہیں۔ تاریخ نکالنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اس طرح تاریخ نکالتے کہ شعر

سے چھوٹے چاچا کا لاڈ پیار میں مخفف۔

ہے حسن صوتی اعتبار سے بھی مجروح نہ ہوتا اور اعداد شعر کا جزو بدن بن جاتے
ہیں۔ شعری نزاکتوں کے ساتھ ایسی رواں تاریخیں بہت کم دیکھیں۔ دیکھئے کس
سے تاریخ کہی ہے۔

تاریخ وفات

نوجواں مرد برفت یک درِ نایاب زما
وائے وا شاعرِ بے مثل لطیفِ ساجد

۱۳۷۴ ہجری

یکم مارچ ۱۹۵۵ء

اقبال متین

عرفان گزیدہ

[حضرت تمکین سرمست مرحوم]

آمد: ۱۹۰۳ء — ۱۰/دسمبر ۵-۱م رخصت

میرے بچپن نے جب شعور کی سرحد میں پہلا قدم رکھا تھا تو محسوسات کو ابا اور امی کے بے پایاں لطف و کرم اور بے اندازہ محبت کے ساتھ ساتھ جو ایک اور شے بالکل برابر دھری ہوئی ملی تھی، وہ تھی چچا صاحب کی علمی فضیلت اور برتری۔ اِس فضیلت کے ابا بھی معترف تھے امی بھی —— اباؔ نے زبان و بیان کے معاملے میں چچا صاحب سے مشورہ کرنے میں بزرگ ہونے کے باوجود پس و پیش نہیں کیا تمکین سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ ابا کہتے ہیں۔ اباؔ کہتے اور امیؔ تائید کرتیں۔

"ہاں بھئی چھوٹے صاحب سے پوچھ لینا چاہیئے" اب اگر چھوٹے صاحب کہہ دیں کہ یہ لفظ اپنے اس تلفظ کے ساتھ صحیح ہے تو صحیح۔ غلط ہے تو غلط —— بات ختم ہوئی۔ پھر کسی سند کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

میرے سارے ماحول میں شعر و ادب کی فضا کچھ اس طرح رچ بس گئی

تھی کہ گیند کو دیوار سے ٹکرا کر کیچ پکڑنے کے دوران ٹپا ٹپ کی سریلی آواز کے ساتھ کانوں سے ٹکرانے والے ناموں میں جوش، جگر، اصغر، حسرت اور نیاز فتح پوری بھی ہوتے۔ اور جب ہیں امی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "چھوٹے صاحب ہم اس غزل کو بلبین سے سُنیں گے۔ تو میری گیند اپنی ٹپا ٹپ بھول جاتی اور چچی صاحبہ کچھ شرما کر لجا کر سر پہ پلّو اوڑھ لیتیں پھر ان کی آواز کا جادو ہمارے کھیل کھلونوں پر بھی ہو جاتا۔

منجلے چچا نادر ڈرامے لکھتے تھے۔ بھری جوانی میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ سنتا ہوں بہت محنتی اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ڈرامہ نگار بھی تھے۔ پروڈیوسر بھی۔ سینما کے پردوں پر جب گونگے آدمی چلتے پھرتے تھے۔ نادر کے ڈراموں نے کتنے ہی کرداروں کو گلی کوچوں میں زبان دے رکھی تھی۔ محلہ یا بازار سے گزرتے تو کانوں میں بھنک پڑتی کہ نادر صاحب یہی ہیں۔ غرض نوعمری ہی میں جانے پہچانے گئے۔ ابھی گویا منزلت کا آغاز تھا کہ عمر نے وفا نہ کی ــــ عجیب بات ہے کہ ان کی موت کا حادثہ میری یاد کا پہلا سانحہ ہے پھر ان کی باتیں ہم نے کم کم سُنیں، یادوں کی گٹھریاں کھلتیں تو وہ بھی کبھی کبھی جھانک لیتے ورنہ خاندان بھر میں شعروادب کی مسند پر کوئی متمکن تھا تو اپنی ساری تمکنت کے ساتھ تمکین ہی تھے۔ ابّا شعر کہتے تھے۔ ناصر تخلص کرتے تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی تمکین سرمست کو شعر سناتے تو بڑی برخورداری سے سُناتے دو چار شعر آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔ ؎

میری وارفتگی جانے کہاں لے جائے گی مجھ کو
میں منزل پر پہونچ کر بھی گذر جاتا ہوں منزل سے

اس قدر نامرادیاں ناصر
زندہ رہ کر کمال کرتے ہو

اپنے دکھائی دیتے ہیں وہ لوگ بھی ہمیں
جو ایک بار تیری گلی سے گزر گئے
بت بن کے بیٹھے ہو، جو حسینوں کی بزم میں
وہ شوخیاں، وہ ولولے ناصر کدھر گئے
وہ بھی عجیب ہستی تھی ناصر کہ آج تک
آتے ہیں اشک آنکھ میں ذکرِ صفی کے ساتھ
اس طرح ذکر اس کا کیوں آج جا بجا ہے
تجھ سے بھی کوئی پوچھے آخر کہ بات کیا ہے

چچا صاحب کوئی شعر پسند کر لیتے تو ابا کو جیسے زمانے بھر کی داد مل جاتی۔ اپنے سب سے چھوٹے بھائی نسیم قاسمی صاحب کو شعر سناتے تو دھونس جما کر سناتے کہ شعر سنو، تمکین نے پسند کیا ہے ـــــ چلو چھٹی ہوئی ـــــ ناصر صاحب کا شعر تمکین صاحب نے پسند کیا۔ اب بھلا نسیم صاحب داد کیسے نہ دیتے۔ شعر و ادب کی ان چھوٹی چھوٹی محفلوں کی "محدود وسعتیں" میرے ابا اور سب سے چھوٹے چچا نسیم قاسمی صاحب کیلئے تو بہت تھیں لیکن تمکین صاحب تو کچھ اور ہی شئے تھے۔ ان کے فن کو کچھ اور وسعتیں چاہیے تھیں ـــــ لیکن اس مردِ خدا نے اپنے ہنر سے اپنے فن اور اپنی عظمت سے کچھ ایسی بے نیازی برتی کہ خود اپنے آپ کی پہچان بھی بھول بیٹھے۔ میں چھوٹا سا تھا۔ چچا صاحب کی ایک نظم "نگار" میں چھپی تھی۔ یہ ۴۲ء کی بات ہے۔ بہر حال یہ وہ زمانہ تھا کہ عبدالحمید عدم اور تمکین سرمست فرمان فتح پوری کے نہیں نیاز فتح پوری کے "نگار" میں سرِ فہرست رہتے تھے۔ نظم کا عنوان تھا "آنکھ مچولی" اس نظم نے ہندستان بھر کے ادبی حلقوں

ہیں دھوم مچادی تھی۔ تمکین صاحب اتنی تیزی سے شعر و ادب کی دنیا میں آنکھوں کو خیرہ کرتے ہوئے وارد ہوئے کہ آنکھ مچولی والے تمکین پکارے جانے لگے۔ پھر نیاز صاحب کے نگار نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ "بے خودی" "تلاش" "بازگشت" "معراج محبت" "مفلس کی دنیا" "اعتراف شکست" یہ تمکین صاحب کی بعض نظموں کے عنوانات ہیں جو ۶۳ سے ۱۹۳۹ء تک نگار میں چھپیں۔ اور مقبول ہوئیں۔ یعنی یہ اس وقت کی بات ہوئی جب ترقی پسند تحریک غوں غاں سے نکل کر اپنا قد ناپنے لگی تھی۔ نیاز صاحب کی مراسلت اگر محفوظ ہوتی تو یہ بھی ایک خاصے کی چیز ہوتی لیکن تمکین صاحب تو ان لوگوں میں سے تھے کہ سگریٹ کی ڈبیوں پر پنی کے کاغذوں پر شعر لکھے ——— رہ گئے تو ان کے ہوئے کھو گئے تو دوسروں کے ——— ایسے آزاد منش اور رند پارسا کی بے نیازی اگر کسی کی نیاز مند ہوئی بھی تو وہ نیاز صاحب کی کہ نگار میں چھپا سو محفوظ ہو گیا۔ بقیہ سب پراگندہ ہے دیکھئے نا ——— "پراگندہ" کے لفظ سے صفی صاحب یاد آئے اور پھر ان کی یاد نے صفی صاحب اور تمکین صاحب کے تعلق خاطر کی کتنی ہی یادیں جگا کر رکھ دیں خیر ان محبتوں کو پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

شاعر کی حیثیت سے تو تمکین صاحب گمنامی کے باوجود صف اول کے شاعر تھے ہی۔ ان میں وہ کس بل ہے کہ ان کی ادبی حیثیت کو پرکھنے اور تسلیم کرنے کے لئے زمانہ اپنا ہاتھ خود بڑھائے گا۔ وہ سب کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ میرے چچا بھی تو ہیں۔ شعر و ادب میں "میں ان کا قاری سہی" مداح سہی ان کا بھتیجہ بھی تو ہوں۔ اپنے بزرگوں میں سب مجھے اپنے ابا کے بعد جس شخصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ چچا صاحب ہی کی ذات گرامی ہے۔ پدرم سلطان بود والی بات یقیناً مضحکہ خیز ہے۔ لیکن

اپنے بزرگوں کے کردار پر فخر کرنا میری دانست میں قبیح نہیں ہے کہ اس سے اپنے کردار کا محاسبہ آدمی غیر شعوری طور پر کر لیتا ہے۔

۱۲ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو بند ہونے والی آنکھیں آج میری طرف نگراں ہیں۔ انتقال سے چار پانچ دن پہلے میں اور میری بہن نجمہ نفیس ملنے گئے ہیں لوٹنے لگے تو قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا ہوں —— انھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے چھوڑتے ہی نہیں۔ سر جھکائے کھڑا ہوں۔ وہ ہاتھ جنھوں نے ملدہ گھما کر کتنی ہی حسیناؤں کے دل چھین لئے تھے۔ وہ ہاتھ جن کی پوروں نے قلم اٹھایا تو شعر و ادب میں دھاک جما دی —— وہ ہاتھ آج میرے ہاتھوں میں یوں تھے جیسے اپنی عظمت کی طرح اپنی حرارت بھی کھو چکے ہوں —— لیکن مجھے تو جلدی تھی نا —— آج اپنے پر ملامت کرتا ہوں —— اتنا ہی تو کیا کہ ہاتھ چھڑا کر بھاگا نہیں۔ لیکن یہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ ان ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا لیتا —— عدیم الفرصت آدمی ہوں نا —— مشین کے دور میں پیدا ہوا ہوں —— مروتوں کو شفقتوں کو محبتوں کو کچل کر پھینک دینے کی سیاست سیکھ گیا ہوں۔ مصلحتوں کے آگے جھک کر بھی اپنے پندار پر اترانے کا گُر جان گیا ہوں۔ یقین کیجئے اگر ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلتا تب بھی ان کی تیوری پر بل نہ پڑتے۔ سوچتا ہوں ان کا چہرہ کبھی میرے ذہن میں اسطرح بھی آئے کہ وہ خفا ہیں برہم ہیں ہائے ہائے اس شخص نے کبھی کسی پر غصہ ہی کیا ہوتا کہ ہم کو اپنی بیزارگی کا جواز ملتا۔ شاید آج کا دور محبت کے لئے سازگار ہی نہیں ہے۔ لیکن چچا صاحب اس دور میں بھی سراپا محبت تھے۔ محبت ہی محبت۔ سچ کہتا ہوں، بلا مبالغہ محبت میں اندھے۔ بالکل اندھے اور اس اندھے نے شروع ہی سے اپنے کو دنیا کی

غیبتوں سے بلند و برتر رکھا ـــــ کہیں کچھ سنا تو اسطرح سنا جیسے کان نہ تھے۔ محفل سے اُٹھا تو محبتیں بٹور لیں۔ رنجشیں اس طرح چھوڑ دیں جیسے ان کا کوئی واسطہ ہی نہیں اور اب تو صرف آنکھیں رہ گئی تھیں۔ سماعت نام کو نہ تھی۔ سنتے تھے تو وہ حال تھا اب تو سنتے ہی نہیں ویسے بھی دنیا ایسے لوگوں کو کم ہی خاطر میں لاتی ہے جو اس کی مصلحت پسند سیاست پر کان بند کر لیتے ہیں ـــــ اور یہاں یہ حال تھا کہ باتوں کے ترازو بن کر دل میں اترنے والے خنجر بھی بے اثر تھے ـــــ صرف آنکھیں ہیں، ذہن ہے دل کی ٹِک ٹِک ہے اور سچ پوچھئے تو یہ ذہن اور دل کی ٹِک ٹِک سب آنکھوں میں سمٹ آئے ہیں۔ یہ آنکھیں اب ساری دنیا میں صرف چار چہرے دیکھتی ہیں ان کے سوا جیسے وہ کچھ دیکھنا چاہتی ہی نہیں ـــــ وہ آنکھیں جن کی ایک نظر سے دوشیزاؤں کے ماتھے عرق عرق ہو جاتے تھے وہ آنکھیں جو کتابوں سے علم و بصیرت چن کر اس طرح ذہن کا حصہ بنالیتں کہ جیسے ورق ورق سادہ ہو گیا ہو ـــــ محبت میں اندھی یہ آنکھیں، سدا کی اندھی رہیں۔ جن کو چاہا ٹوٹ کر چاہا۔ اپنا آپ بھلا کر چاہا۔ سودو زیاں دیکھا نہیں۔ سودو زیاں میں بس زیاں ہی زیاں سے دل بہلائے رکھا۔ محبت کا یہ اندھا کھلاڑی بھی عجب عجب کھیل، کھیل گیا ہے۔

خاموشی سے ۱۲۔ دسمبر کو آنکھیں بند کر لیں جیسے سب کو باور آجائے کہ اب یہ آنکھیں بھیا صاحب کو نہیں دیکھ رہی ہیں۔ ممی خالہ امی اور پیر جی کو نہیں دیکھ رہی ہیں ـــــ میں ایک بات ان آنکھوں سے پوچھوں، ایسے شعر چھوڑ جانے کے بعد کوئی آنکھ کہیں بند ہو سکی ہے۔

زندگی آسان ہو جاتی ہے تمکین عشق میں
زندگی دشوار ہو جائے انساں کے لئے

دل میں غم و اندوہ تبسم سا لبوں پر
دنیا کو رہے گی مرے جینے کی ادا یاد

اُس کی جفاؤں پر نہ کیوں سجدۂ شکر کیجیے
مانا کہ بے وفا ہے وہ اتنا بھی تو کوئی نہیں

نگاہ یار رہنے دے بس اب چارہ گری اپنی
کہ یہ آنسو خریدے ہیں لٹا کر زندگی اپنی

واقعی انھوں نے زندگی لٹا کر آنسو خریدے تھے برسہا برس سے یہ عالم تھا کہ سونے سے پہلے گڑگڑا کر اپنے بچوں اور متعلقین کے لیے دعائیں مانگتے۔ آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ایسا تحمل، ایسا صبر و ضبط، جراحتوں کو اپنے دل میں اتنے پیار سے چھپا رکھنے کا انداز انہیں کا حصہ تھا۔

۱۲/ دسمبر سے آٹھ دس دن پہلے جب میں نے نیاز حاصل کیا تھا تو مجھے یہ شعر سنایا تھا۔

نہ کوئی آسرا ملتا نہ یوں بے آسرا ہوتے
نہ کوئی ناخدا ہوتا نہ کشتی ڈوبتی اپنی

اللہ اللہ کیسے بتلاؤں کہ اس شعر میں ان کی محرومیوں کی ایک داستان پنہاں ہے۔ میں آپ کو ان کے کچھ اور شعر سناتا چلوں۔ غم سے وابستگی جب مقدر بنتی ہے۔ تب ہی ایسے شعر نکلتے ہیں۔

غم کو خوشی سمجھنا، ہنس ہنس کے زہر پینا
آساں نہیں ہے یا رب مجبور ہو کے جینا

میں غرق بھی نہ ہوا، پار بھی اتر نہ سکا
تجھے بھلا کے خدا کو بھی یاد کر نہ سکا
ٹھہر خلا کے لئے کچھ تو جذبۂ بے تاب
میں دردِ عشق کا مقصد ذرا سمجھ تو لوں
نیکی بھی کوئی کر نہ سکے وہ مرے لئے
میں نے گناہ تک بھی کئے جن کے واسطے
اتنے نازک وقت آئے اتنے سنگین مرحلے
اب تو ہر تازہ مصیبت پر ہنسی آنے لگی
ختم ہی ہونے کو آیا یہ نہ لیکن کھل سکا
جام و مینا سے ہوں میں یا جام و مینا مجھ سے ہیں
چمن والے چمن میں آشیانے کو ترستے ہیں
ہم آج اپنے ہی گھر میں سر چھپانے کو ترستے ہیں
ویسے ہی بہت مجبور ہیں ہم اب اور ہمیں مجبور نہ کر
ہر ظلم ترا منظور مگر للہ چمن سے دور نہ کر

میں اکیلا نہیں شعر و ادب کا ہر قاری جانتا ہے کہ ایسے اشعار کے خالق کی آنکھیں، موت آج تک بند نہیں کر سکی جو اپنے اشعار سے اس طرح جھانک سکتا ہے۔

یہ تو شعر و ادب کے لئے دیدہ و دل بچھانے والوں کا معاملہ ہوا جو مستقبل کو سونپتا ہوں ویسے مجھے تو آج بھی یہ آنکھیں ڈاکٹر یوسف سرمست کی سیڑھیوں پر ملتی ہیں۔

قیصر سرمست اور سید اسد جیلانی بابا کے گیٹ پر ملتی ہیں میں بھاگ کر پناہ لینے کے لئے اپنے بچپن سے چمٹ جاتا ہوں جو اس دنیا میں نہیں ہے۔

••

اقبال متین کی مطبوعہ تصانیف

★ اجلی پرچھائیاں ..... افسانے ۔ سنہ ۱۹۶۰ء

★ بچا ہوا البم .... افسانے ۔ سنہ ۱۹۷۳ء

★ چراغ تہہ داماں .... ناول ۔ سنہ ۱۹۷۶ء

★ خالی پٹاریوں کا مداری .... افسانے ۔ سنہ ۱۹۷۷ء

★ آگہی کے ویرانے .... افسانے ۔ سنہ ۱۹۸۰ء

★ مزبلہ .... افسانے ۔ سنہ ۱۹۸۹ء

★ میں بھی فسانہ تم بھی کہانی .... افسانے ۔ سنہ ۱۹۹۳ء

اقبال متین

بھیّا صاحب

(ڈاکٹر یوسف سرمست)

آمد: ۲۸/ڈسمبر ۱۹۳۶ء

ڈاکٹر یوسف سرمست کا نام آج میرے لئے ایک معتبر ادبی شخصیت کا نام بن گیا ہے۔ ورنہ یوسف سرمست میری نظر میں آج بھی وہی سیدھے سادے معصوم سے یوسف شریف الدین ہیں جو طالب علمی کے زمانے سے آج تک اسم نصف مسمیٰ ہیں نصف پر میں نے زور اس لئے دیا ہے کہ وہ اپنے نام کی مناسبت سے حسن ظاہری میں یوسف ثانی تو نہیں ہیں لیکن شرافت میں اول تا آخر شریف الدنیا بھی ہیں شریف الدین بھی یوسف ثانی ہونے پر کبھی شہناز نے بھی اصرار نہیں کیا ہے۔ جو ان کی شریک حیات ہیں۔ لیکن شرافت کی وہ بھی قائل ہیں۔

کسی ایسی شخصیت پر قلم اٹھانا جو اجلی دھلی ہوئی سفید پوشاک کی طرح صاف ستھری ہو بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ لطف تو جب آتا ہے جب کہ شخصیت کا یہ لباس کہیں سے پھٹا ہوا بھی ہو۔ کہیں کہیں اس پر دھبے بھی ہوں۔ یہ ملتے

ہوئے بھی کہ مکمل شخصیت وہ نہیں ہوتی جو ہمیں نظر آتی ہے اور وہ بھی نہیں ہوتی جو ہمیں نظر نہیں آتی ہے میں نے یوسف سرمست کو ان کے ظاہر و باطن میں کھوجنے کی سعی نامشکور کی۔ جو ہاتھ لگا وہ صرف "بھیا صاحب" تھے۔

بھیا صاحب کو میں ان کے بچپن سے جانتا ہوں۔ یہ میرے چچا زاد چھوٹے بھائی ہیں۔ محترم چچا تمکین سرمست صاحب کے فرزند ارجمند۔ قبلہ تمکین صاحب بھی انھیں بھیا صاحب ہی پکارتے تھے۔ جس لڑکے کو اس کا باپ بھی صاحب کہہ کر مخاطب کرے اس لڑکے کا امیج خاندان بھر میں کسی نہ کسی انداز سے احترام کا کوئی نہ کوئی پہلو لیے ہوئے ہی ابھر سکتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے بھیا صاحب کے بچپن میں ان کے لڑکپن کی تلاش شروع کی تھی تو مجھے کچھ بھی نہ ملا تھا۔ مجھے بھیا صاحب کا بچپن کہیں ملا ہی نہیں۔ نہ کسی سے لڑنا جھگڑنا نہ کسی بات پر ضد کرنا۔ زندگی کی ہر صعوبت سے اس طرح سمجھوتہ کر لینا جیسے کوئی خوشی مل گئی ہو۔ خواہشوں کا سلسلہ یں اتنا کہ ختم تو کیا ہوتا جبکہ شروع ہی نہ ہوتا تھا۔ چھوٹے تھے تو برف کے لڈو پر نہیں جھپٹے۔ ذرا اور سیانے ہوئے تو نہ گیند اچھالا نہ بلا گھمایا۔ اسکول میں داخل کرائے گئے تو کتابوں ہی کو اوڑھنا بچھونا سب کچھ سمجھ لیا۔ پرائمری سے مڈل اسکول تک بھیا صاحب کا صوفیانہ لڑکپن وہی ترکِ تمنا کی منزلیں طے کرتا رہا۔ ایک بار اسکول جاتے ہوئے مجھے راستے میں ملے۔ قمیص کے بٹن اس طرح لگا رکھے تھے کہ درمیانی بٹن گلے کے کاج میں جڑا تھا۔ پیروں پر نظر گئی تو اس "طفلِ خدا" نے ایک جوتے میں ڈوری باندھ رکھی تھی تو دوسرے جوتے کو سُتلی سے کس

لیا تھا۔ میں نے قمیص کے بٹن تو ٹھیک کر دیئے بڑی لجاجت اور برخورداری سے بھیّا صاحب مسکرائے۔ میں نے جوتے کے فیتے کے بارے میں سوال کیا۔ تو شرما کر کہا۔ "جی وقت ہی نہیں تھا کہ خرید لیتا"۔ اور اطمینان سے چل دیئے۔

سُنا کہ تین چار دن تک انھیں فیتہ خریدنے کو وقت ہی نہیں ملا۔ یہ باتیں بادی النظر میں لاابالی فطرت کی مظہر ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے بھیّا صاحب کے مزاج کا یہ پہلو ان کے ہم عمروں سے انھیں ممیز کرتا تھا۔ کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک معصوم سا ذہن اپنی سوچ بچار کے وسیلے سے عقل و فہم کی بھول بھلیوں میں راستے کی تلاش کر رہا ہے اور یہ تلاش اس سے اس کا بچپن چھین رہی ہے۔ کچھ اسی طرح بھیّا صاحب نے اپنے بچپن کو اس کی مانے بغیر پیچھے چھوڑ دیا۔ اور جب مسیں بھیگیں تو الھڑ جوانی کے مقابل شعور و آگہی کے صحرا بھی تھے، سمندر بھی ــــ اب کبھی آگہی کے صحرا کی دشت نوردی میں ـــ کبھی شعور و احساس کے سمندر کی غواصی میں بھیّا صاحب نے خود اپنے آپ پر نظر کی تو ان کی جوانی سے الھڑ کا لفظ ٹوٹ کر، بچھڑ کر جانے کہاں بھٹک گیا تھا جانے کہاں کھو گیا تھا ــــــ زمانے کی دست برد سے بچ بچا کر جب عمر کا یہ دورِ زرّیں بھیّا صاحب کے ہاتھ آیا جسے شباب کہتے ہیں تو نہ بھیّا صاحب سے اس کی صورت پہچانی گئی نہ دیکھنے والوں نے ہی اس دولت کا اندازہ کیا جو عمر سے پہلے عمر سے بچھڑ جانے پر کسی انسان کو حاصل ہوتی ہے ــــــ اسی کھونے اور پانے کی شکست و ریخت سے بھیّا صاحب کی

شخصیت کا خمیر اٹھا ہے ۔

یہ عجیب بات ہے کہ تخلیقی فن کی نشو و نما کو جانے کیوں ایسا ہی
زاج راس آجاتا ہے۔ "بیسویں صدی کے ناول" میں جہاں ڈاکٹر یوسف سرمست
ی گہری تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے وہیں صفحات کے صفحات ان کی تخلیقی
سترس کا مظہر ہیں۔ اس مبسوط تھیسس کی انھیں خوبیوں کے باعث میں اس کو
یک وقیع تخلیقی تنقید سمجھتا ہوں۔ اپنے اس تنقیدی مقالے میں یوسف سرمست
ے اردو ناول پر تحقیق و تنقید کا ناقابل تردید معیار قائم کیا ہے۔
ردو ناول پر جو کچھ آج تک لکھا گیا اس سے ناول کی وقعت کو جانچنے کی
رٹی تو بھلا کیا ملتی۔ فکر و نظر کی تحقیر و توقیر میں خط فاصل کھینچنا بھی مشکل
ر آتا تھا۔ ہر پھر کر نظر ٹھہرتی تو علی عباس حسینی کی" ناول کی تاریخ و تنقید"
پر۔ جس میں تاریخ تو ملتی تھی تحقیق و تنقید کم کم۔ ایسے میں یوسف سرمست
نہ صرف یہ کہ سجاد حسین انجم اور سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کی تخلیقات
بارے میں اہم تحقیقی کام کیا ہے بلکہ قاری سرفراز حسین کے "شاہد رعنا"
مرزا ہادی رسوا کے "امراؤ جان ادا" کی نسبت ایسے اہم سوالات اٹھائے
کہ ایک حد تک "امراؤ جان ادا" کا اردو ناول میں سارا ایریا ٹوٹ سا جاتا
ہے۔ خاص طور پر اس مسئلہ میں اردو ناول پر یہ تحقیق دوسرے لکھنے والوں کو
یرت فکر دیتی ہے۔ ایک بہت ہی اہم ترین بحث یوسف سرمست نے
ردو ناولوں کو "مقبول اور سنجیدہ" کے عنوان کے تحت منقسم کرکے اٹھائی
ہے اور آفاقی ادب میں ناول کی تکنک کے اثرات کو اردو ناولوں میں

تلاش کیا ہے ۔ شعور کی روانی' تکنک کو اردو ناول میں برتنے میں سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات" کو یوسف سرمست نے اولین کوشش قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے کتاب کے تعارف میں ان سارے اہم نکات کا احاطہ کرتے ہوئے مستقبل کے نقادوں سے مزید روشنی ڈالنے کی توقع کا اظہار کیا ہے۔

مجھے سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی ہے کہ ڈاکٹر یوسف سرمست نے ابراہیم جلیس کے ناول چور بازار کی بازیافت کی ہے تقسیم ملک سے قبل لکھنے والوں میں ابراہیم جلیس نے اردو فکشن کو بہت کچھ دیا ہے جو ہر طرح ناقابل فراموش ہے ۔میرا حیدرآباد اس سفاکانہ بے اعتنائی کا مجرمانہ حد تک مرتکب رہا ہے کہ اس نے اپنے ہی جواہرات کو بازار کے چھوٹے کنکروں کی وقعت بھی نہیں دی۔ جلیس جہاں کہیں بھی رہیں ۔ حیدرآباد کا ورثہ ہیں۔ یوسف سرمست نے چور بازار کو اردو کے بہترین ناولوں میں سے ایک ناول قرار دیا ہے ۔ یوسف سرمست نے لکھا ہے کہ "چور بازار اردو کا بجید منفرد ناول ہے اور ہر لحاظ سے اردو کا جدید ترین ناول ہے" اپنے اس دعوے کے جواز میں انھوں نے چور بازار کی اہمیت پر کھل کر بحث کی ہے ۔ یوسف سرمست سے گذارش کروں گا کہ وہ ابراہیم جلیس کے سارے کنٹری بیوشن کو پیش نظر رکھ کر جلیس کی صحیح قدر و قیمت سے دنیائے ادب کو روشناس کرائیں ۔ یوسف سرمست پر ایک اور قرض بھی ہے جو ناخن کا قرض ہی نہیں رگِ جاں کا قرض ہے اور وہ ہے حضرت تمکین سرمست جیسے منفرد اور

باکمال شاعر کی منزلت کو پہچانا۔ کل کے دن کہیں ایسا نہ ہو کہ اردو شاعری کا مستقبل یوسف سرمست کی اس بے اعتنائی کا شکوہ سنج ہو۔

یہ ساری باتیں میرے مضمون میں برسبیل تذکرہ آگئی ہیں اس کتاب کی ادبی تحقیقی اور تنقیدی اہمیت پر دوسرے فاضل مضمون نگار روشنی ڈالیں گے۔

میرا منصب تو صرف اتنا ہے کہ بھیّا صاحب میں ڈاکٹر یوسف سرمست دیکھ لوں اگر وہ ہاتھ لگیں۔

تلاش، تلاش، تلاش۔ جب یہ لفظ بھیّا صاحب کی شخصیت کا جزو ہو گیا تو دروں خانہ کیا کیا ہنگامے ہیں ان کی طرف کم ہی کسی کی نگاہ گئی ہے۔ سبھوں نے ضرور دیکھا ہے کہ بھیّا صاحب باتیں کرتے کرتے کھو جاتے ہیں۔ محفل میں رہ کر بھی اکثر محفل میں نہیں ہوتے۔ سڑک پر چل رہے ہوں تو یہ بھول جاتے ہیں آنکھیں کھلی بھی ہوں تو کبھی کبھی نہیں دیکھ سکیتں۔ کان گونج رہے ہوں بھی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ موٹر کے ہارن اور اپنے ہی جسمانی خول کے اندر کی چیخ و پکار میں کوئی تفریق کی جا سکتی ہے۔

تماشہ دیکھنے والا خود کس طرح تماشہ بن جاتا ہے یہ منظر شہناز نے دیکھا ہے ——— ایک دن یوں بھی ہوا کہ بھیّا صاحب اپنی شریک زندگی شہناز کے ہمراہ صنعتی نمائش دیکھنے چلے۔ بچہ بھی انگلی پکڑے ساتھ تھا۔ نمائش گاہ میں گھومتے پھرتے بھیّا صاحب نے اپنے بچے سالٹو کو گود میں اٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد اچھے خاصے چلتے پھرتے حواس باختہ پکار اٹھے۔ عرفان کہاں ہے ——— شہناز نے بھی پریشان ہو کر بھیڑ میں آگے پیچھے دیکھا ——— بھیّا صاحب

روہانسے سے ڈھونڈھ رہے تھے۔ جب شہناز کی نظر پڑی تو انھوں نے فرطِ مسرت سے قریب قریب چلا کر کہا۔

"آپ کی گود ہی میں تو ہے"

بھیّا صاحب نے اضطراری طور پر بچے کو چھو کر دیکھا اور جھپٹ لیا۔

اب اس واقعہ کا تجزیاتی مطالعہ کیجئے تو بھیّا صاحب کے اندر کا دبا دبا شور صاف سنائی دے سکتا ہے۔ جس شور سے چھٹکارا پانے کیلئے بھیّا صاحب بے تحاشہ شہناز اور سالٹو کی طرف بھاگنا چاہتے ہیں۔

شہناز کو بھیّا صاحب سے مستقل شکایت ہے کہ جب وہ کوئی اہم مسئلہ لے بیٹھتی ہیں تو مولانا شوہر اعظم بات سنتے سنتے کہیں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ——— اور اس کے بعد ان کی اہم ترین باتیں بھیّا صاحب کے کانوں کے آس پاس ہی سے گذرتی رہتی ہیں ——— جب یہ بات شہناز کی ناگواری تک پہنچتی ہے تو وہ بھیا صاحب کو جھنجھوڑ کر پوچھتی ہیں ———

"سُن رہے ہو کچھ"؟

"ہاں بھئی کیوں نہیں سُن رہا ہوں ——— تم کہتی جاؤ"....

"کیا خاک کہتی جاؤں۔ کس سے کہوں ؟"

اب بھیّا صاحب جانے کہاں کہاں سے ہو کر دوڑتے بھلانگتے ہانپتے کانپتے۔ شہناز کے آگے عجز مجسم ہو جاتے ہیں۔

شہناز شاید ابھی یہ فیصلہ نہیں کر سکی ہیں کہ انھیں بھیّا صاحب کی یہ ادا نا پسند ہے یا پسند ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک دم نرم ہو جاتی ہیں ———

اور بڑے تحمل سے پوچھتی ہیں۔

آخر آپ بات کرتے کرتے کہاں کھو جاتے ہیں۔؟

بھیّا صاحب کے لہجے کی کھلاوٹ سنا ہے کہ ایسے میں شیرو شکر سے بھی کچھ فزوں ہو جاتی ہے۔

وہ کہتے ہیں۔

"میں تمہارے اور بچوں ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا"

شہناز مُٹ مُٹ ان کا منہ تکتی ہیں کہ یہ کیسے آدمی ہیں جو مجھے سامنے بٹھا کر میرے ہی بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔

آج میں بھری محفل میں بھیّا صاحب کی طرف سے جان نثار اختر کا یہ شعر شہناز کی نذر کرتا ہوں ؎

میں جب بھی اس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
وہ خود بھی بات کرے تو بُرا لگے ہے مجھے

شہناز کو یہ بھی شکایت ہے کہ بھیّا صاحب کبھی کبھی بات کی نزاکت و فوری نہیں سمجھتے — یہ شکایت ویسے مجھے بھی ہے — یہ خود فراموشی اصل بھیّا صاحب کی زندگی کے اسی خارجی اور داخلی ٹکراؤ کا بنیادی سبب ہے جو ان کے جسمانی وجود ہی کو معرض بحث میں لے آتا ہے — کیا بھیّا صاحب وہی ہیں جو اس وقت شہ نشین پر بیٹھے ہیں یا وہ ہیں جنھیں ان کی بنیادی تخلیقی فن میں تلاش کرنا ہے — یا پھر وہ شہ نشین پر

ہیں نہ اپنی کتاب میں بلکہ خود کی تلاش میں سرگرد
بھیّا صاحب ہی کا مقدر نہیں بلکہ ہر ذی روح کا ازلی اور ابدی سفر ہے۔ صرف
فرق اتنا ہے کہ ادراک و آگہی اس سفر میں توازن اور عدم توازن کا کاروبار انجام دیتے ہیں۔

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

ایک دن بھیّا صاحب نے مجھے اور ڈاکٹر مغنی تبسم کو کسی خاص
مسئلہ میں گفتگو کی غرض سے ایک ہوٹل میں بلایا تھا۔ جب بات اہم موڑ
پر آئی تو مغنی نے جماہی لے کر کہا کہ یوسف سرمست صاحب میں کسی بھی اہم
بات کے اہم پہلو پر غور کرنے کیلئے ہوٹل جیسی عامیانہ جگہ کو کچھ مناسب نہیں
سمجھتا۔

میں نے بات کا رخ پہچان لیا۔ اور مغنی کی تائید کرتے ہوئے
لقمہ دیا۔ کہ۔

"ہاں ایسے وقت تو وہ روشنی طبع ضروری ہوتی ہے جو اکتسابِ علم
سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ عرفانِ ذات چاہتی ہے"

میری اس پر زور تائید کے باوجود بھیّا صاحب کچھ نہیں سمجھے
آخرش انھیں سمجھانا پڑا۔ اور ہم میکدے کی جانب روانہ ہوئے۔ بھیّا صاحب
یوں چل رہے تھے جیسے یا بدست دگرے دست بدست دگرے لے جائے
جا رہے ہوں۔ خود نہیں چل رہے ہوں۔

مغنی نے کہا کہ ـــــ "یہ آپ کو آپ کے نام کے ساتھ سرمست
کا لفظ نازیبا نہیں لگتا۔؟

بھیّا صاحب اپنے صوفیانہ تبسّم کے پیچھے بھی اس چوٹ کو نہ چھپا سکے کہا۔

"آپ کی سرمستی عارضی ہے اور میری سرمستی مستقل" اور یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔

خیر صاحب ہم نے وہسکی سنبھالی اور بھیّا صاحب نے کوکا کولا۔ خیر و شر ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ اچھی اچھی پر مغز باتیں ہوئیں — بھیّا صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یوں لگا ہماری وہسکی کوکا کولا کے آگے فلاپ ہو رہی ہے۔

یکایک وہ اُٹھے۔ کہا میں ذرا رفیعہ آپا کو فون کر لوں۔ اپنی کتاب کی رسم اجرا کے جلسے کی صدر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ سے فون پر بات کرنے کے لیے وہ چلے گئے تو مغنی نے کہا۔

"یوسف کو ذرا پریشان کریں گے"

باور کیجیے کہ ہم نے وہسکی کا ایک قطرہ بھی کوکا کولا میں نہیں ملایا۔ اس لئے کہ ہم ایک قطرہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بھیّا صاحب لوٹ آئے اور اطمینان سے کوکا کولا سیپ کرنے لگے۔ میں نے اور مغنی نے مسکراتے ہوئے انھیں بغور دیکھا۔ گلاس لبوں سے ہٹا کر بھیّا صاحب نے میز پر رکھ دیا۔ کہنے لگے۔

"آپ لوگ اس طرح مجھے بغور کیوں دیکھ رہے ہیں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ تب ہی تو کوکا کولا میں کچھ تلخی سی آگئی ہے اور مجھے اپنا سر بھی کچھ بوجھل سا لگ رہا ہے۔"

دیکھا آپ نے یہ سرمستی صرف بھیّا صاحب کی پاکیزگی نفس کی تھی۔
ورنہ کوکا کولا میں کوئی تلخی تھی ہی نہیں۔ بیسویں صدی میں ایسے لوگ کم ہیں۔
اور پھر اس عمر میں جو بھیّا صاحب کی ہے۔

مجھے ان دنوں کی باتیں یاد آتی ہیں جن دنوں بھیّا صاحب اپنا ڈاکٹریٹ
کا تھیسس مکمل کرنے میں منہمک تھے، جواب کتابی صورت میں آپ کے سامنے
ہے۔ اتنی لگن اور اتنی عرق ریزی سے بھیّا صاحب نے اس کام کو مکمل کیا ہے کہ
انھیں اپنی سدھ بدھ ہی نہ تھی۔ ان کا خارجی وجود صرف اس حد تک تھا کہ
انھیں ہم کبھی کبھی گھر میں چلتا پھرتا دیکھ سکتے تھے۔ ایک کمرہ انھوں نے
گھر کے قریب لے رکھا تھا۔ چوبیس گھنٹے اسی میں بند رہتے تھے۔ ان کے
گھر میں بھی انھیں دیکھ کر ان کی بے گھری ہی کا نہیں بلکہ بے زمینی کا احساس
ہوتا تھا ـــــ جیسے کوئی آدمی نہ صرف یہ کہ روزمرہ کی زندگی ہی سے کٹ
گیا ہو۔ بلکہ اس کے پاؤں بھی زمین کا لمس بھول گئے ہوں ـــــ بھیّا صاحب
کو شاید اپنی اس افتادِ طبع کا اندازہ تھا کہ وہ بیک وقت دو محبتوں کو اپنے
جسم و جان کا حصہ نہیں بنا سکتے سو انھوں نے دلہن والوں کے تقاضوں
کے باوجود اپنی شادی ملتوی کروا دی کہ پہلے تھیسس مکمل کر لیں گے۔ میں
سمجھتا ہوں کہ شہناز کیلئے شادی سے زیادہ یہ تاخیر مبارک و مسعود ہوئی
درنہ وہ اپنی اس سوتن سے بھیّا صاحب کا والہانہ لگاؤ برداشت ہی نہ
کر پاتیں جس کا نام "بیسویں صدی میں اردو ناول" ہے۔

اس والہانہ عشق کا ایک کرشمہ ہو تو سناؤں۔ اس داستانِ عشق

بحر بیکراں کو کوزے میں بند کر لینا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی میں کوشش
رہا ہوں۔

بھیا صاحب کسی سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ پلیٹ فارم پر پہنچے تو ٹرین
س آنے ہی والی تھی۔ لپک کر ونڈو پر پہنچے۔ نوٹ جیب سے نکال کر بکنگ
ک کے حوالے کئے۔ اس نے پہلے رقم لوٹائی۔ ابھی ٹکٹ دے بھی نہ سکا تھا کہ
یا صاحب رکشا والے کا کرایہ چکانے کیلئے بھاگے۔ کرایہ ادا کیا تو ٹکٹ
تب تھا۔ افتاں وخیزاں پھر کھڑکی پر پہنچے۔ بکنگ کلرک نے کہا کہ میں تو ٹکٹ
ے چکا ہوں ۔ ٹرین اب پلیٹ فارم پر آ رہی تھی ۔ دوسری بار نوٹ نکالے
ک نے کچھ ریزگاری لوٹائی۔ بھیا صاحب ریزگاری جیب میں محفوظ کرتے
ے ٹرین کی طرف بھاگے۔ سیٹ سنبھال کر ٹکٹ دیکھا ٹکٹ غائب
دیوانہ وار تیسری بار کھڑکی پر پہنچے۔ بڑی لجاجت سے بکنگ کلرک سے

"میں پھر ٹکٹ لینا بھول گیا ہوں"۔
اس نے اس لجاجت کا جواب خشونت سے دیا۔ بھیا صاحب
داخلیت کے بادشاہ تھے۔ تو وہ بھی اپنی خارجیت کا شہنشاہ تھا
جید تھے وہ بھی جید تھا۔ اس نے کہا جناب میں تو دوسری
بھی ٹکٹ دے چکا ہوں ۔ آخر یہ کیا چکر چلا رہے ہیں آپ ۔
بھیا صاحب نے پیسے نکالے۔ تیسری بار ٹکٹ خریدا اور
گئے۔ بھیا صاحب خوش نصیب ہیں کہ ٹرین میں ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ

نہیں پوچھا۔ پوچھ بیٹھتا تو اس وقت بھی ان کے پاس ٹکٹ کہاں تھا۔

اس عشق مجازی کو عشقِ حقیقی تک پہنچنے میں قدمے فاصلہ دارد کی بات رہ گئی تھی۔ اللہ میاں نے چچا صاحب محترم پر رحم کیا تھا۔ شہناز ابھی بھیّا صاحب کی زندگی میں داخل نہیں ہوئی تھیں ــــ بھیّا صاحب تھے ان کا تھیس تھا۔ اسی خیال میں گم دنیا ومافیہا سے بے خبر ایک دن ریل کی پٹریوں سے ہو کر گذر رہے تھے۔ ایک دھماکہ سا محسوس کیا۔ دیکھا تو خود کو مال گاڑی کے دو ڈبوں کے درمیان محفوظ حالت میں پایا ــــ دونوں ڈبوں کے آہنی توے آپس میں مل گئے تھے اور درمیانی فصل میں بھیّا صاحب بیسویں صدی کے سارے ناول ذہن میں اٹھائے کھڑے تھے ــــ ایک قدم پیچھے رہ جاتے یا ایک قدم آگے بڑھ جاتے تو آہنی توؤں کے درمیان ان کا وجود اپنے عدم کا جواز ہی تلاش کرتا رہ جاتا اور اس طرح ایک تلاشِ مستقل کا قصہ تمام ہو جاتا۔

ہمارے خاندان کا ضخیم ناول میں سب سے زرین باب بھیّا صاحب ہی سے وابستہ ہے اگر یہی باب اس ضخیم ناول سے نوچ کر پھینک دیا جاتا تو سارا ناول بے روح ہو جاتا ــــ تخلیقی کرب میں یہ خود فراموشی عام آدمی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بہرحال اللہ نے بڑا فضل کیا۔

"خدا رکھے بہت سی خوبیاں ہیں جینے والے میں"

بھیّا صاحب اپنی زندگی میں اس احتیاطِ ضبطِ نفس کے لئے مشہور ہیں جس کی داد مجھ جیسا بے سروسامان کیا دے گا۔ ...

گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرنے کے عواقب و نتائج سے آج بھی غافل ہے۔ میں اس غفلت کی طرفداری میں نہیں ہوں لیکن دبی زبان میں بھیا صاحب سے اتنا تو کہوں۔ ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مجھے یقین ہے کہ بھیا صاحب میرے اس مشورے کو لائق اعتنا نہیں سمجھیں گے اور اگر ایسے میں ان کی نگاہیں شہناز کی نظروں سے ٹکرا گئیں تو پاسبانِ عقل کے پہرے اور بھی شدید ہو جائیں گے۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ میرے اس زریں مشورے کی تائید ڈاکٹر عالم بھی کریں گے ڈاکٹر مغنی بھی۔ لیکن ڈاکٹر انور معظم کبھی تائید نہیں کریں گے۔ خیر یہ ان کا اور جیلانی بانو کا معاملہ ہے اور ویسے بھی کسی وہسکی کی تائید کوئی "نی نٹا" یا "کوک" کر ہی نہیں سکتا۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

—— اور اگر سمجھ جائے بھی تو کیا برا ہے۔

●●

سرخ ٹیلیفون

راشد آزر

آمد:- ۳۱/اگست ۱۹۳۱ء

اقلیم سخن کا ایک سفید کھک شہزادہ اپنے احباب میں راشد آذر اور خاندان میں راشد علی خاں کے نام سے جانا پہچانا بھی جاتا ہے، چاہا بھی جاتا ہے۔ مارکسزم اور ارسٹوکریسی (ARISTOCRACY) میں سمجھوتہ ناممکن ہو یا نہ ہو، راشد آذر نے اس کو ممکن کر کے دکھا دیا ہے۔ وہ لڑکا جس نے بچپن میں فرش کے نیچے پیر میلے نہیں کئے۔ ہوش سنبھالا تو زندگی کی گندگیوں کو دور کرنے کا سودا اس کے سر میں سما گیا تھا۔ سنتا ہوں یہ داستان طویل ہے لیکن اس ساری طویل داستان میں ایک بات واضح ہے اور وہ ہے اپنے سامنے نعمتوں کے انبار رکھ کر بانکپن سے خالی کشکول لئے گداگروں کے انبوہ پر نظر ڈالنا اور پھر ترس کھا کر رہ جانا۔ ذہنی انقلاب کی یہ ہیئت ترکیبی بے عمل سہی مستحسن ضرور ہے۔ زندگی کی صعوبتوں میں سماجی استحصال اور معاشرہ میں نابرابری کے شدید احساس نے راشد کو اپنے گھر کے روشن فانوس اور

جگمگاتے قمقموں سے ہٹا کر اندھیروں کے سفر پر راغب کیا۔ جلو میں: غارت سامنے بے اماں تہی دستوں کا کارواں۔ راشد کی تربیت میں جہاں اُن کی نبض شناس امی[1] کی آغوشِ عاطفت کی نرمی گرمی شامل رہی وہیں اُن کے والدِ محترم پروفیسر حسین علی خاں[2] نے ادراک و آگہی کے بند کواڑ راشد کے ذہنِ رسا پر وا کیے ـــــ اس تربیت نے راشد میں بردباری، رکھ رکھاؤ، اصول پسندی تو پیدا کردی، لیکن وہ لچک اس کے حصّہ میں نہیں آئی جو زمانے کے سرد و گرم سہنے کے بعد مزاج کا حصّہ بنتی ہے اس طرح ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ یہاں راشد اپنے اصولوں کی پرستش میں معصوم پجاری کی طرح لگتا ہے۔ ایسا پجاری جس کے صنم اُس کی نظروں کے سامنے تہس نہس کردیئے گئے ہوں۔ لیکن وہ شوقِ جبیں سائی میں بتوں کی شکست و ریخت کا منظر بھی بھول بیٹھا ہو۔ ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے

اسی وفا کیشی نے راشد کی شخصیت کو بڑی حد تک متوازن بنا دیا ہے اُس نے اپنے اطراف اُصول پسندی کے ایسے ہالے بنا رکھے ہیں کہ ان حصاروں کو توڑ کر راشد کو چھوتے ہوئے اس کے دوست احباب کو بھی ڈر لگتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بعض وقت اس انداز سے دیکھتا ہے کہ اُس کے قریبی احباب کی بھی اِن واقعات پر اُن زاویوں سے نظر نہیں جاتی۔

ایک بار اُس کے کسی ہم عصر شاعر نے بات کرتے کرتے اس کے کندھے

---

[1] معصومہ بیگم سابق وزیر آندھرا پردیش

[2] پروفیسر حسین علی خاں مرحوم۔ صدر شعبہ انگریزی جامعہ عثمانیہ

پر ہاتھ رکھ دیا۔ جن سے وہ کبھی بھی بے تکلف نہیں رہا تھا۔ راشد دل مسوس کر رہ گیا اور مروّت میں ناگواری کے احساس کو چھپا گیا۔ باتیں کرتے کرتے اُن صاحب نے ترنگ میں پھر وہی حرکت کی۔ راشد نے بڑی نرمی سے اُن کا ہاتھ شانے پر سے ہٹا دیا۔ وہ جل چکے تو راشد کہنے لگا۔ عجب لوگ ہیں بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں۔

پابندِ وضع راشد کی پابندیٔ اوقات بڑے جوکھم میں ڈال دیتی ہے۔ مخدوم[3] بھائی کی یاد میں پروانہ ہال میں جلسہ تھا۔ صدارت راشد ہی کو کرنی تھی۔ وقتِ مقررہ پر راشد کا موٹر گیٹ پر کھڑا تھا۔ منتظمین ابھی انتظامات کے ابتدائی مراحل میں سرگرداں تھے۔ راشد کی حالت دیدنی تھی۔ احاطے سے نکل کر گیٹ کے باہر چلا جاتا۔ موٹر کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچتا۔ پھر لوٹ آتا۔ سیماب تھا۔ وہ بھی زیرِ آتش، کہنے لگا عجیب لوگ ہیں، وقت کیا دست بستہ اُن کے سامنے کھڑا رہتا ہے جو یہ اہمیت نہیں دیتے ——— اور دیر ہو گی تو میں چلا جاؤں گا ———

میں نے کہا راشد تم جانتے ہو کہ مخدوم بھائی خود کس قدر وقت کے پابند آدمی تھے لیکن ایسے وقتوں پر وہ بھی طرح دے جاتے تھے۔ شاذ نے اُس مضمون کو پڑھنے کے بہانے جو اُس جلسے میں راشد سنانے والا تھا۔ اس کو اُلجھائے رکھا۔ ایک بار میری صدارت میں اسی جلسہ تھا مجھے بار بار پروانہ ہال پہنچتے وقت یہ خیال ستا رہا تھا کہ آج میں نے کسی کی دستی گھڑی مستعار ہی سے لی ہوتی۔ تاخیر سے پہنچوں گا تو راشد خود ہی اپنے جلسے کی صدارت کرتا کرسیٔ صدارت پر متمکن نظر آئے گا۔ وہ

---

[3] مخدوم محی الدین

مجھ سے مائک پر آکر کہے گا ۔ جناب آپ کی صدارت برخواست کردی گئی ۔ میں نے خود صدارت سنبھال لی ہے ۔ عابد علی خاں[1] صاحب مہمان خصوصی ہیں ۔ وہ وقت پر آئے ہیں ۔ آپ چاہیں تو مہمان غیر خصوصی کی حیثیت سے ڈائس پر آسکتے ہیں ۔ میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں ۔ راشد گواہی دیں گے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ کی صورت میں آپ سب ہی دیکھ سکتے تھے اگر میں وقت پر نہ آتا ۔

راشد بڑا کل کھرا بھی ہے بہت کھردرا ———— اس کی دھان پان شخصیت کی موہنی میں یہ کھردراپن چھپا رہتا ہے ۔ لیکن جب یہ کھردراپن اس کی موہنی پر غالب آتا ہے تو دوست احباب پیار میں سپر ڈال دیتے ہیں ۔ بزرگ حضرات اس کی کم عمری کا خیال کرکے رنجش بے جا سے گریز کر جاتے ہیں ۔ اس کے پاس اصول صرف بننے کیلئے ہوتے ہیں ۔ ٹوٹنے کے لئے ہوتے ہی نہیں ۔

اب میں اس شخص کا ایک اور روپ بھی آپ کو بتاؤں جو میرے اپنے بیانات کی خود ہی تردید کرے گا ———— ۲۱ دسمبر کو راشد کے ساتھ یہ شام منائی جانے والی تھی جو آج منائی جارہی ہے ۔ راشد نے مجھ سے اسکیچ پڑھنے کی خواہش کی ———— میں نے ہاں کہہ دی ۔ لیکن برا ہو حالات کا ۔ میں کچھ اسطرح اپنے ہی خول میں بند رہا کہ باہر دیکھنے کی الجھنوں نے مہلت ہی نہ دی ۔ راشد مجھے بار بار یاد دلاتا رہا ۔ میں نے آخر ش حواس مجتمع کرکے اور ٹیلیفون پر اس سے التجا کی کہ بھائی اس موقع پر مجھے معاف کردو ۔ راشد مصر تھا اس نے کہا ۔ میں نے اور شاذ نے یہ طے کرلیا ہے کہ آپ لکھیں گے

---

[1] عابد علی خاں ، مدیر اعلیٰ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد

اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اخباروں میں نیوز بھی چھپ چکی ہے۔ راشد سے مجھے جو تعلقِ خاطر ہے اُس نے مجھے اجازت ہی نہ دی کہ فارمالیٹی FORMALITY کی تکمیل کیلئے اس کے جلسہ میں شریک ہو جاؤں۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ اپنی تہی دامنی کا بھرم رہنے دوں۔ لکھنے لکھانے کی اللہ توفیق دے تو راشد پر اطمینان سے لکھوں لیکن راشد نے نہ صرف یہ گھاٹے کا سودا گوارا کر لیا، بلکہ تاریخ کی تبدیلی پر بھی آمادہ ہو گیا۔ راشد کی یہ محبت میں بھلا نہیں سکوں گا۔ شاذ[*] اور نیر[*] صاحب کے پُرخلوص تعاون نے مجھے راشد سے عمر بھر کی شرمندگی سے بچا لیا۔ آپ نے دیکھا راشد محبتوں کے آگے اپنی اصول پسندی کے پُرخچے بھی اڑا سکتا ہے۔ یہاں اگر اس کی اپنی ذاتیات کا مسئلہ ہوتا تو وہ کسی قیمت پر بھی سمجھوتہ نہ کرتا۔

وضعداری جو نفسِ مطمئن کو حسنِ دوام بخشتی ہے۔ راشد کی شخصیت کا ایک جزو ہے۔ اس کا بانکپن اُس کے صاف ستھرے کردار کا عکس لگتا ہے وہ شاہزادوں کی طرح شاہانہ زندگی گزارتا ہے۔ اُس کا احساسِ جمال قدم قدم پر دامنِ دل کھینچتا ہے۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

جب وہ مجھے ایک شام میرے دفتر سے اپنے گھر لے گیا تو میں ایک ایک قدم پر اس کی خوش سلیقگی کا قائل ہوتا گیا۔ شاذ بھی ساتھ تھے۔

---

* شاذ تمکنت ** صلاح الدین نیر

میں نے سُن رکھا تھا کہ ... نے اپنے کسی مضمون میں راشد کی اس جنتِ ارضی کا بڑے خوبصورت پیرائے میں نقشہ کھینچا ہے۔ خاص طور پر اُس کے منی بار کا جو اس کے ڈرائنگ روم ہی کا ایک بہت دلکش حصہ ہے۔ مجھے بھی خوبصورت بوتلیں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔ اتفاق سے میں نے بھی اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں یہ خالی بوتلیں ایک بک شلف پر سجا رکھی ہیں۔ ایک دن مجھ سے میرے بڑے لڑکے نوید نے کہا "آپ کا یہ بک شلف آپ کے کمرے کا سب سے زیادہ جاذب نظر حصہ ہے۔ اس وقت تک میں نے راشد کا یہ نیا گھر دیکھا نہ تھا۔ میں نے نوید سے کہا "سنا ہے راشد کے ڈرائنگ روم میں ایک بہت حسین سا منی بار ہے۔ کبھی راشد کو اپنے گھر لے آؤں گا اور اسے اپنا امپٹی منی بار (Empty Mini Bar) بھی بتلاؤں گا۔ لیکن جب میں نے راشد کا گھر دیکھا تو مجھے سوچنا پڑا کہ میں جب اس کو اپنا امپٹی منی بار بتلانے کے لئے گھر لے جاؤں گا تو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دوں گا۔ ہاتھ پکڑ کر اپنے امپٹی بار تک لے آؤں گا۔ پٹی کھول دوں گا اور جب وہ قہقہہ کر ہنس پڑے گا تو پھر آنکھوں پر پٹی باندھ دوں گا اور ہاتھ پکڑ کر اس کو اس کی موٹر تک پہنچا دوں گا۔ دیکھیں راشد اس پل صراط سے گزرنے کے لئے کب تیار ہوتا ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے راشد کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کی بات کیوں سوچی۔ میرا گھر بھی راشد کے گھر کی طرح مثالی ہے۔ اس کے پاس جو سب کچھ ہے، میرے پاس نہیں اور میرے پاس جو کچھ ہے، وہ اس کے پاس بالکل نہیں۔ اس باب میں سمجھوتہ ناممکن ہے۔

شعر نوید اقبال۔ صدر اسٹوڈنٹس ویلفیر اسوسی ایشن (اے پی)

جب راشد کا موٹر اُس کے گیٹ پر پہونچا تھا تو میں نے اس سے کہا تھا۔ تمہارے اس گھر کو میں پہلی بار آرہا ہوں۔ بہت تعریف سُنی ہے۔ اُس نے تعجب سے پوچھا۔ تو کیا آپ فاطمہ* کی زندگی میں یہاں نہیں آئے۔ میں نے نہیں کہہ کر بات مختصر کردی۔

جب راشد میرے اور شاذ کے لئے نقل کا انتظام کرنے اپنے کچن میں گیا تو میں اور شاذ بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔ راشد بڑی خاموشی سے وہ سارا کام کر رہا تھا جو کبھی فاطمہ کرتی تھیں اور وہ ہاتھ بٹاتا تھا۔ میں نے اور شاذ نے کسی ڈھکے چھپے جذبے کے تحت ایک دوسرے کو چپکے سے دیکھا اور اُلٹی سیدھی باتوں میں اسے بہلایا۔ مجھے وہ شام یاد آنے لگی۔ جن دنوں راشد پبلک اسکول میں پڑھاتا تھا۔ وہ ایک حادثے میں زخمی ہوگیا تھا۔ میں اور مُنیر مرحوم اس کی عیادت کے لئے گئے تھے۔ فاطمہ نے اُس وقت بھی ہماری خاطر مدارات کی تھی۔ ننھا حسین سُو رہا تھا۔ وہ حسین جو آج راشد کا صرف بیٹا ہی نہیں ہے، اُس کا دوست بھی ہے۔ اس کا ہمدم و دمساز بھی ہے جو غیر محسوس طور پر اُس کی تنہائیاں بانٹ لیتا ہے۔

کچن سے نکل کر جب ہم میز پر پہونچے تو میں نے میز پر بکھرے ہوئے ایشٹریز کو بغور دیکھا۔ جس ایشٹرے پر میری نظر جم کر رہ گئی اُس میں میں نے اپنی بیڑی کا سرا رگڑ دیا۔ جسے میں نے ابھی ابھی جلایا تھا۔ راشد کن انکھیوں سے مجھے دیکھ کر مُسکرایا۔ میں نے بھی مُسکراہٹ کو چھپا لینے کی کوشش کی۔ لیکن

---

* راشد کی شریک حیات (مرحومہ)

جانے کیوں ہم دونوں بے اختیار ہنس پڑے ۔ دوستوں کی محفلوں میں راشد ہنستا ہے اور قہقہے لگا کر ہنستا ہے ۔ لیکن اس کے گھر میں اس کو ہنسا کر مجھے یوں لگا ۔ جیسے میں نے اسکو ڈھونڈ نکالا ہے ۔

ٹیلیفون کی گھنٹی کئی بار بج چکی ۔ راشد نے سرفراز صاحب[۹] کو کئی بار تسلی دی تھی کہ ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں ۔ جب ہم چلنے لگے تو میں نے راشد سے سوال کر ہی لیا ۔ اس نے اپنا سرخ سا ٹیلیفون سیڑھیوں پر رکھ چھوڑا تھا ۔ میں نے کہا ۔ اس ٹیلیفون کو ڈھنگ سے اپنی جگہ پر تو رکھ دو ۔ راشد نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا ۔ یہی تو اس کی جگہ ہے ۔ میں نے کہا ۔ مذاق چھوڑو بھئی اب چلنا ہے ۔ راشد گلے کا ہار ہو گیا ۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ڈرائینگ روم میں گھسیٹا ۔ کہنے لگا ذرا یہاں سے ذرا ٹیلیفون پر نظر ڈالئے میں صوفے پر بیٹھ کر جونقوں کی طرح دیکھنے لگا ۔ اجی جناب اسی زاویئے سے دیکھئے ۔ بیٹھ کر نہیں کھڑے ہو کر اور اس نے مجھے پھر گھسیٹا ۔ میں کھڑے ہو کر بھی دیکھا ۔ اور عافیت اسی میں سمجھی کہ تعریف کر دوں ورنہ راشد مجھے اکڑوں بٹھا کر دکھلاتا ۔ اس کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا ۔ لپک کر وہ سیڑھیوں تک جا پہنچا ۔ ایک سیڑھی پر بیٹھ کر پچھلی سیڑھی سے اپنی پشت لگا اور نیم دراز ہو کر چونگا اٹھا لیا ۔ دیکھئے کس قدر اطمینان سے بات کی جا سکتی ہے ۔

اس سے پہلے کہ سرفراز صاحب کے فون کی گھنٹی بجتی ۔ ہم روانہ ہو گئے ۔ حسین اپنے باپ سے زیادہ اعتماد کے ساتھ موٹر چلا رہا تھا ۔ وہ راستے میں اپنی گرل فرینڈ کے گھر اتر گیا جو ڈنر پر اس کا انتظار کر رہی تھی ۔ مجھے راشد کی "نظم" یاد آئی ۔ ساتھ ہی سیڑھیوں پر دھرا ہوا فون یاد آیا ۔

---

[۹] سرفراز حسین خان، ناظم تعلیمات

سرفراز بھائی کے گھر پہنچے تو حسن عسکری اور سعادت علی خاں مرحوم
کے خطوط کے مکتوب الیہ ، عمر خاں صاحب پہلے ہی سے موجود تھے ۔ وحشت رز
سے پذیرائی ہو رہی تھی ۔ ہم نے بھی جام چھلکائے ، ٹکرائے ، ایک دوسرے کا جائزہ
لیا ۔ علمی باتیں ، ہنسی مذاق ، سرفراز بھائی کی اپنائیت ۔ اعظم میاں کی سرشاری ،
شاذ کی تمکنت ، عسکری صاحب[1] کا پروقار اندازِ تکلم ۔ لیکن نگاہ جا کر ٹھہرتی تھی اسی
بھک سفید شہزادے پر ۔ عسکری نے بہت خوبصورت نثری نظمیں سنائیں ۔
بلا ردیف اور بغیر قافیے اور بلا وزن کے ایک سماں باندھ دیا ۔

بات جانے کس طرح نکلی ۔ میں انھیں پروز پوئیٹری کہہ رہا تھا ، غالباً
شاذ اور میں ہم خیال تھے کہ ان چیزوں کو شاعری تسلیم کر رہے تھے ۔ راشد کو اصرار تھا کہ
یہ پیسیس ہیں ۔ عسکری کا ادعا یہ کہ انھیں شاعری نہ سمجھنا سراسر شعر و ادب سے ناانصافی
ہے ۔ عسکری اور راشد میں بحث چھڑ چکی تھی ۔ پیسیس کا صحیح (Definition
ڈیفینیشن راشد کے پاس کیا تھا مجھے معلوم نہیں ۔ لیکن اب موضوع صرف راشد اور
عسکری کے درمیان زیرِ بحث تھا ۔ راشد جب بحث شروع کرتا تو وہی باتیں اس
کے سامنے ہوتی ہیں ۔ یا تو قائل ہو جائے یا اپنے مخالف کا پڑا کر کے رکھ دے ۔ اہلِ مجلس
اہلِ مجلس ہو جاتے ہیں اور اہلِ خانہ ، اہلِ عزا تماشہ ، اسے کوئی فکر نہیں رہتی ۔ وہ
غلط مبحث کا شکار نہ ہو سکا ۔ لیکن دلائل و براہین کی تلاش میں اپنا وجود معنوی
بھی کھو بیٹھے گا ۔ شاذ نے مجھے ٹہوکا دیا ۔ کہنے لگا ، متین بھائی اب گیا شعر ہاتھ
سے ۔ سرفراز بھابھی اندر سے سُن رہی تھیں ۔ اسی اہتمام سے انھوں نے کھانے کا

[1] پروفیسر حسن عسکری ۔ عثمانیہ یونیورسٹی

استقبال کیا تھا کہ مشامِ جاں معطر ہو رہی تھی۔ اندر سے بار بار بلایا جا رہا تھا۔ سرفراز بھائی بے چین تھے۔ راشد دوسروں کی حالت زار سے بے نیاز تھا۔ عسکری نے استادانہ فراست کا ثبوت دیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میز پر پہونچے تو ادب اور شاعری ہمارے ساتھ نہ تھے۔ مگر راشد چار چھ لقموں کے بعد تازہ دم ہو گیا اور مجھ سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ میں نے اس کی پلیٹ میں مُرغ ڈال کر سمجھوتہ کرنا چاہا۔ اس پر بھی وہ نہ مانا۔ شاہد نے بیچ میں پڑ کر میری جان بچائی اور ہم دونوں بلند آواز میں کھانے کی تعریفیں کرنے لگے اور جُٹ گئے۔

پتا نہیں راشد اس مضمون میں بحث کے کتنے پہلو اب تک تلاش کر چکا ہے۔ لیکن میں نے ٹھان لی ہے کہ وہ بحث کرے گا تو میں پائنٹ آف آرڈر (point of order) ریز کروں گا اور اپنی آج کی صدارت اس کا چوتھا مجموعہ چھپنے تک چلاؤں گا۔ اِس پر بھی وہ نہ مانے تو عابد صاحب سے رجوع کروں تاکہ وہ فرمان خصوصی میں احکام خصوصی صادر کریں۔ لیکن کیا مجھے عابد صاحب سے انصاف کی توقع کرنی چاہیے۔ سُنتا ہوں راشد، عابد صاحب کا بہت چہیتا ہے۔ کیونکہ دونوں ہم قافیہ بھی تو ہیں۔ ؎

داغ بر گردنِ راشد

راشد کی پاک باطنی کا میں معترف ہوں۔ دل میں جو ہو گا، زبان پر بھی ہو گا ہی۔ دُکھ وہ پہونچائے گا نہیں۔ کسی اور سے اسے دُکھ پہونچے تو وہ برداشت بھی کم ہی کرے گا ــــ زمانہ آدمی کو کچی سڑک کی طرح روند کر رکھ دیتا ہے۔

اور زمانے کے اس طرزِ سلوک کے کئی کئی روپ ہوتے ہیں۔ دل کی شکستگی جہاں آگہی اور شعور بخشتی ہے وہیں کم سوادی اور جھنجھلاہٹ کا شکار بھی کر دیتی ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ آدمی آدمی کے قریب زیادہ تر درد و غم کے رشتے ہی سے پہنچتا ہے۔ فرط و انبساط، آسودگی اور خوش حالی شریکِ محفل تو ہوتے ہیں شریکِ حال نہیں ہوتے ——— راشد آذر کو زندگی نے کبھی سڑک کی طرح بہت کم برتا تو بہت کم روندا تھا۔ زندگی کے دکھ درد کے اکتساب میں اس کے محسوسات کو ذاتی ایک زمانے تک کتابی علم کی وساطت سے رہا ہے۔ مارکسزم پر اس کے یقین نے انسان دوستی کے جذبے کو ہر ظلم و استبداد کے خلاف ابھارا ہے۔

مارکسزم سے آگہی نے انسانی جہدِ مسلسل کے باوجود عدمِ مساوات سے احتجاج کو آدرش کی شکل تو دے دی لیکن کتابی علم محسوسات پر حاوی رہا۔ فاطمہ کی جدائی نے غمِ ذات کو غمِ دوراں تک پہونچانے میں راشد کی مدد کی تو کچھ اس طرح کی کہ وہ شدتِ غم میں درد و کرب کی ان منزلوں تک جا پہونچا جہاں اپنے ہی خدوخال کو پہچان لینے کی کوشش میں دوسروں کے چہروں پر آدمی خود کا گمان کرتا ہے۔ جیسے ہر غم اپنا ہی غم ہو۔ یہاں غم کی نوعیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نہ غم کی اساس کا یہاں ہر غم اپنے ہی غم سے پہچانا جاتا ہے۔ فاطمہ نے راشد کو اب اس کچی سڑک پر پھینک دیا ہے جسے روند کر زندگی بار بار گذرتی ہے اور پیوند خاک ہو کر غم کی کونپلیں زمینِ دل سے کسمساتی ہوئی جھانکتی ہیں اور پھر ایک مزاج بنتا ہے۔

فاطمہ نے راشد کو اس بانکپن سے بھی نیچے اتار دیا ہے۔ جہاں تک

وہ خالی کشکول لیے گداگروں کا ترس کھا کر نظارہ کرتا تھا - آج راشد خود اُن گداگروں میں شریک ہے - اور اپنے خالی کشکول میں اپنے ہی آنسو تلاش کر رہا ہے -

اس دولتِ غم کو پتا نہیں کب تک وہ زمانے کے دستِ برد سے بچا کر رکھ سکے گا - مجھے یوں لگتا ہے کہ فاطمہ کے بعد راشد اپنے ہی گھر کی سیڑھیوں پر پڑا ہے - جو تک کر کبھی ٹیلیفون کا چونگا جھپٹ لیتا ہے ——— کسی کھوئی ہوئی آواز کی اُمید میں ——— یہ سُرخ ٹیلیفون راشد کا اپنا وجود ہے، جو آج ہر اس آواز پر کان لگائے بیٹھا ہے جو خود اس کے سینے سے پھوٹے یا سیڑھیوں کی جانب بڑھنے والی کسی بھی چاپ کے سہارے اُس کے دل تک پہونچے ——— اپنے ہی گھر میں سیڑھیوں پر بسر کرنے والا نشکا دکھاں جاتا ہے -

••

اقبال متین

سیل بند بوتل

(ڈاکٹر غیاث صدیقی)

آمد: ۷/اکتوبر ۱۹۲۶ء

مجھے یاد نہیں کہ غیاث صدیقی سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی۔ اور کیوں ہوئی۔ میں چونکہ کبھی چہرے پڑھنے میں بڑی دلچسپی رکھتا ہوں کسی سے پہلی بار ملتا ہوں تو اپنی اسی کمزوری کا شکار ہو جاتا ہوں کہ ملنے والا خود مجھے نہ پڑھ لے۔ بہت کم شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے پہلی ملاقات کے بعد ملتے رہنے کو جی چاہے اور ذہن کچھ نہ کچھ نقوش اپنے میں محفوظ رکھ لے۔ ہاں جس سے مل رہے ہوں اس کی شخصیت کا پہلے ہی سے کوئی امیج بن گیا ہو یا اس کے کام اور نام سے واقف ہوں اور اس طرح اس کی اہمیت کا احساس ہو گیا ہو تو پہلی ملاقات سچ پوچھئے تو اصلی ملاقات نہیں ہوتی بلکہ دونوں ہی ملنے والی شخصیتیں اپنے اپنے خود ساختہ خول میں چھپ جاتی ہیں ———

غیاث کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا ——— جب میں ان سے پہلی بار ملا تھا اُس وقت میرے ذہن میں نہ اُن کے شعر و ادب کا کوئی وسیلہ تھا نہ ان کے اسٹیٹس کو پ

ڈاکٹر۔ گول مول سے چہرے پر عینک سے ڈھنکی آنکھیں نہ ہی وہ میرے لئے کوئی قابلِ توجہ شاعر تھے نہ قابلِ اعتنا STETHOSCOPE کا۔ میں ایک چمک ضرور تھی جو لگتا تھا راستہ بھٹک کر ایک ایسی مقید سی ہوگئی ہے جو صرف انھیں آنکھوں میں رہ سکتی ہے اس چہرہ پر ناک کبھی گال معلوم ہوتی ہے، کبھی ہونٹ کبھی خود چہرہ۔ یہی حال گالوں اور ہونٹوں کا بھی ہے کہ وہ سب الگ الگ بھی ہیں اور الگ الگ نہیں بھی ہیں۔ اللہ میاں نے غیاث کا چہرہ اس وقت بنایا ہوگا جس وقت وہ بے حد عجلت میں ہوں گے۔ پتہ نہیں کس عالم میں ایک ہیولے پر نظر پڑی ہوگی جو اپنے وجود کے لئے پارے کے مانند مضطرب ہوگا ـــــ "اللہ میاں نے صاف ستھری مٹی کے اس گولے کو پیار سے اٹھالیا ہوگا۔ پھر اس کو کہیں سے ابھار دیا ہوگا۔ اور اپنی اس تخلیق کے حسن و قبح پر نظر نہ کی ہوگی۔ جب یہ دائرہ کا آدمی بن گیا ہوگا تب آنکھوں میں کچھ کرنیں سی پھینک دی ہوں گی ـــــ اب یہی کرنیں غیاث کے چہرے کی جان ہیں جو آنکھوں میں قید ہیں)

غیاث سے ملا تھا تو یہ ضرور ہوا تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں ان کی شرافتِ نفس، انکسار اور نرمیٔ کلام نے متاثر کیا تھا جیسے نہ کوئی شاعر ابھرا تھا نہ پیشہ ور ڈاکٹر ـــــ ایک ایسے شخص کا تصور ضرور ذہن میں محفوظ ہوگیا تھا جو یاروں میں ہنسی بانٹ کر خوش ہوتا ہو ـــــ پھر غیاث سے ملتا رہا۔ لیکن ان ملاقاتوں کا وقتی فاصلہ اتنا طویل ہوتا کہ نہ میں ان سے قریب ہو پاتا نہ وہ مجھ سے اور وقت کا فصل ایک ملاقات سے دوسری ملاقات کے بیچ میں تکلفات کی دیوار کھڑی کر دیتا۔ آپ سے تم تک آنے میں جو ذہنی سفر ایک دوسرے کے ساتھ طے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے مواقع ہم دونوں ہی کو مدتوں نہ ملے۔ بس ہر راہے مل لیتے

غیاث بڑی محبت سے ملتے - ایک بات مزید ہوتی ـــــ اور یہ بات اتنی مزیدار ہوتی جیسے یہ نہ ہوتو گویا غیاث سے مل کر بھی ہم نہیں ملتے ان دنوں زندگی نے جہاں لے جاکر مارا ہے وہاں پل بھر کے لئے کھل کر ہنس لینا بھی بڑی نعمت ہے - غیاث ہنسنے کے معاملہ میں بڑے فراخ دل ہیں - بات میں بات نکال کر کوئی پہلو بہرحال ایسا پیدا کر لیتے ہیں کہ بے ساختہ ہنسی آجائے - پہل خود کرتے ہیں اور پھر ملنے والے کو شامل کر لیتے ہیں۔

میں جب بھی غیاث سے ملا ہوں اپنی زندگی کے سارے مسائل ان کی چوکھٹ کے باہر چھوڑ دیئے ہیں - کبھی چھوڑ نہ سکا ہوں تو غیاث سے ملنے کے بعد خود انھوں نے ان مسائل کو غیر محسوس طور پر نکال باہر کیا - لیکن زندگی سے چمٹا ہوا دکھ درد جسے میں غیاث کی چوکھٹ کے باہر چھوڑ آیا تھا، میرا منتظر رہا - میں غیاث سے ہنس بول کر چلا اور جونہی ان کے دروازے سے باہر ہوا، اس سہمے ہوئے دکھ درد نے تازہ دم ہو کر یلغار کیا ـــــ اب بولو کہاں جاؤ گے ـــــ اور مجھے یوں محسوس ہوا۔

دھماکہ بن گئیں مایوسیاں جب
بدن کے سینکڑوں ٹکڑے ہوئے ہیں

(غیاث صدیقی)

غیاث کو شاعر کی حیثیت سے میں نے بہت دنوں بعد آہستہ آہستہ تسلیم کیا کہ بڑی رچی ہوئی اور دقیع غزلیں کہتے ہیں - شعر کے مزاج میں "گداختگی اور ربودگی" سے زیادہ طنطنہ اور شوکت ملے لیکن اس کے باوجود بھی کلاسیکل رمزیت ان کے لہجے کی پہچان رہی ـــــ البتہ انھوں نے اپنے فن کے تعلق

سے کبھی بھی وہ رویہ اختیار نہیں کیا تھا جس کا طرز تشہیر آج کل عام ہو گیا ہے کہ دوسروں کے کان پر منہ رکھ کر اپنی ہی تعریف و توصیف میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاؤ۔ بلکہ وہ تو شاعری کو ثانوی حیثیت دیتے رہے دوستی کو اولیت۔ ڈاکٹری کو کونسی حیثیت دی اس کا نہ مجھے علم ہے نہ خود ان کو ـــــ اصرار پر شعر سنایا تو اس طرح سنایا جیسے آگہی کے لئے نہیں اُس کی نوا سی کے لئے ڈھونڈ رہے ہوں ـــــ لیکن جب بھی میں نے غیاث کی شاعری سنی اُن کی غزلوں کی پُروقار نغمگی میں گم ہو کر رہ گیا۔

ایک دن میں نے پوچھا ـــــ کیا تم نظمیں نہیں کہتے ہو۔ غیاث مسکرائے کہنے لگے۔ نظمیں ہی کہتا ہوں ـــــ غزلیں تو کوئی اور ہے جو اندر چھپ کر کہلواتا ہے ورنہ میں تو نظمیں ہی کہتا ہوں۔

اور بات آئی گئی ہو گئی ـــــ آج جب "آواز کا رنگ" سامنے ہے تو سوچتا ہوں کہ غیاث کو یقیناً اپنی ہی زبان سے اپنی ہی وکالت کرنے کی اہانت سے سمجھوتہ کر لینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اُن کا یہ اعتماد جو اُن کی آنکھوں کی چمک سے پھوٹتا ہے آج "آواز کا رنگ" کے ورق ورق پر بکھرا ہوا ہے جو شاعر "سکون" اکائی صفحہ ۴۳ "برسات" ندامت" امیدوں کی تھکن" احساس" نیند" یہ کون منتظر ہے" اعتراف اور اکائی صفحہ ۱۰۰ جیسی نظمیں اردو شاعری کو دے سکتا ہے اپنے فن کو اپنی انا کا جواز سمجھ سکتا تھا لیکن غیاث کے پاس ان کی عدم انانیت ہی ان کے تخلیقی فن کا پُر خلوص جواز بن گئی ہے۔

غیاث بڑے دوست نواز بلکہ دل نواز آدمی ہیں۔ کھلا پلا کر اتنا ہی خوش ہوتے ہیں جیسے کھا پی کر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک ذرا سا نکتہ ہے۔ پلا کھلا کر خوش ہونا اور پی کھا کر خوش ہونا انہیں نہیں آتا۔ ہم جیسے

آوارہ منش لوگوں کے لئے غیاث کی یہی طرحداری اور یہی رکھ رکھاؤ عذاب ہے۔ آدمی کو اتنا بھی اچھا نہیں ہونا چاہیئے کہ ہر سماجی اور مذہبی اچھائی اس کے حصے میں آجائے اس لئے ان کی کچھ برائیاں بھی ٹٹولوں کہ کہیں تو انھیں استقامتاً ہی سہی برا بھی ٹھہرا سکوں۔

ایک دن میں اور جمیل سحر غیاث کے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے گھر کے سامنے جو بیکری ہے اس کا بل آیا۔ دو ہزار آٹھ سو روپئے میں نے سوچا یہ لوگ شاید ڈبل روٹی، پلم کیک، پیسٹری، بسکٹ وغیرہ غذا کے طور پر استعمال کرتے ہونگے یا پھر بیکری والا بیکری کے نام پر کیرالتا، طعام ریتن، غلہ اور دوسری ضروریات بھی فروخت کرتا ہوگا ورنہ یہ اٹھائیس سو روپے اور بیکری کا بل ـــــ غیاث میری حیرانی پر مسکرائے پھر خود ہی قہقہے لگانے لگے۔ کہنے لگے آپ پریشان ہو گئے۔ یہ بسکٹ اور پیسٹری کا بارہ پندرہ مہینے کا بل ہے۔ میں نے کہا بارہ پندرہ مہینے کیا، بارہ پندرہ سال کا ہوتا تب بھی بہت ہے۔ بسکٹ، پیسٹری اور کھارے کی پلیٹیں میری اور جمیل سحر کی طرف بڑھائیں۔ کہنے لگے کھائیے۔ اپنے بچوں کی طرف اشارہ کرکے کہا ان کا تو بس یہی کام ہے۔ اب غیاث سے اگر کوئی پوچھے کہ بھائی دن رات تمہارا کام کیا ہے تو وہ قہقہہ لگا کر بات گول کر جائیں گے۔ حالانکہ آدھا بل بچوں کے حصے میں لگے گا تو آدھا بل غیاث کے حصے میں ان کے دوست احباب کا حصہ بھی ہوگا۔ یہ تو ہوئی کھلانے پلانے کی بات ان روپیوں میں کوئی معمولی سی سوا چھ روپئے والی وھسکی کی بوتل بھی شامل نہیں ہے۔

غیاث کی مسز ان سے بڑا پیار کرتی ہیں۔ اور اسی لاڈ پیار نے غیاث کو کم خراب کیا ہے۔ اس کے پیٹ کو زیادہ خراب کیا ہے۔ غیاث بیوی کا پیار جانتے ہیں۔ اور اسی پیار نے کچھ بری عادتیں

بھی ان میں پیدا کردی ہیں جیسے ایک عادت دروغ گوئی کی ہے۔ میں پورے
وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ غیاث نے اپنی نظم "حنا کا رنگ بگڑتا رہا" میں سفید جھوٹ
سے کام لیا ہے۔ بھابھی کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب حنا دوا کے بہلنے مطب
میں آتی ہوگی، تو سیاہ بالوں کے جوڑے سے دہکتے گالوں میں ڈمپل اور بہکی چال سے نظریں
ہٹا کر۔ بھابھی خود ہی بڑھ کر غیاث کے ہاتھوں میں استھسکوپ تھما دیتی ہوں گی اور خود
دروازے کی دراز سے اپنی ہنسی دبا کر ڈاکٹر غیاث کے عمل تشخیص مرض کا سماں دیکھتی ہوں گی
اور اس وقت تک خاموش رہتی ہوں گی جب تک کہ غیاث کھانے کی میز پر نہ آجائیں
بھابھی تو اصلی کارروائی یہیں سے شروع کرتی ہیں ـــــ اب کھانے کی میز پر نہ تلا
ہوا گوشت ہوگا، نہ مچھلی، نہ انڈے ـــ یہاں تک کہ پاپڑ بھی نہیں ہوں گے اور کچی سبزی
کی پلیٹ بھی نہیں ـــــ بڑے چاؤ سے بھابھی نے بگھاری ہوئی کھٹی دال رکھ دی
ہوگی۔ تھوڑا سا اچار بھی رکھ دیا ہوگا ـــــ کسمپرسی کے اس عالم میں آپ نے غیاث
کو نہیں دیکھا جبکہ اس کا سابقہ دال سے پڑتا ہے ـــــ میں نے دیکھا ہے اس
کا چہرہ فق ہوگیا ہے۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ـــــ اور ایسے میں بھابھی ہنسی کا
فوارہ اڑائیں گی، کہیں گی۔ دال عمدہ بگھاری ہے شروع کیجئے۔ بھابھی جانتی ہیں کہ جس
آلے سے ڈاکٹر نے حنا کا دل دیکھا ہوگا اسی سے اپنے شوہر کے پیٹ کا معائنہ
بھی کیا جا سکتا ہے ـــــ اور وہ استھسکوپ سنبھال کر غیاث کی طرف بڑھیں گی،
ـــــ ڈاکٹر صاحب ذرا آپ کے پیٹ کا معائنہ تو کر دوں۔ ڈاکٹر جل بھن کر رہ جائے
گا۔ ہنسی ہنسی میں بھابھی سے یوں لڑے گا جیسے اس کا دل پیٹ ہی میں اتر آیا
ہو ـــــ اور بھابھی قہقہہ لگا کر ڈاکٹر پر ترس کھائیں گی۔ اب آپ ہی بتلائیے

سزا کا اتنا آسان طریقہ مسز غیاث کی دسترس میں ہے تو انھیں کیا پڑی ہے جو غیاث کا اسٹیتھسکوپ چھپاتی پھریں۔ اور جب بھابھی نے آلہ چھپا لیا تھا تو غیاث اتنے دنوں تک کیا صرف نبض اور قارورہ دیکھ کر ڈاکٹری کرتے رہے۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہے ڈاکٹر شاعر ہو تو شاعری شاید اسی طرح ڈاکٹری کی چغلی کھاتی ہے۔

یہ غیاث کی بالکل نجی اور گھریلو باتیں تھیں جنھیں میں آپ لوگوں کے سامنے لے آیا ہوں لیکن قصوروار میں نہیں ہوں، خود غیاث ہیں کہ انھوں نے یہ نظم اپنے مجموعہ میں شامل کی۔ شاید وہ خود چاہتے ہوں کہ ان کے جھوٹ کا پول کھلے۔

غیاث کو آج جو مرکزیت حاصل ہے وہ کبھی سلیمان اریب کا حصہ تھی۔

دوستوں کی محفلیں دوستوں کا جمگھٹا کل صفیہ[1] بیزار تھیں آج بھابھی بیزار ہیں۔ ایک دن جب غیاث شدید بیمار تھے۔ بھابھی بے حد پریشان تھیں ـــــ مجھ سے کہنے لگیں بھائی چاہتی ہوں اب آپ کا حیدرآباد چھوڑ دوں اور پھر گلبرگہ لوٹ جاؤں یہاں تو غیاث کو منٹ بھر فرصت نہیں ملتی۔ بس صبح شام دوستوں کا ہجوم نہ وقت پر کھا سکتے ہیں، نہ وقت پر آرام کر سکتے ہیں۔ اس وقت مسز غیاث بے حد سنجیدہ تھیں۔ اس وقت ان کو غیاث کے دل کی فکر تھی۔ پیٹ کی نہیں۔ کیونکہ بھابھی جان گئی تھیں کہ غیاث پھر دل کے مریض ہو گئے ہیں۔ اور غیاث بھی ہجوم یاراں سے گریزاں سوچ رہے ہیں کہ ــــ

مجھے تو سرحد بے مائیگی پہ تو مل جائے
کسی کو دار ملے یا کسی کو تخت ملے

(غیاث صدیقی)

---

[1] صفیہ اریب

غیاث کی خرابیٔ صحت میں معاملہ دل کا نہ ہوتا تو میں کسی نہ کسی طرح انھیں ایک دن پلا کر چھوڑتا ـــــــ اتنا اچھا آدمی اور بے پیئے عمرِ عزیز کے ۴۵ سال گزار دے تو سونا کندن بننے سے رہ جاتا ہے۔ ویسے مجھے غیاث سے انتقام بھی لینا تھا۔ لیکن اب وقت گذر چکا ہے۔ اب جبکہ میں انھیں اور وہ مجھے بیحد عزیز ہو گئے ہیں۔ انتقام کا موقع ہاتھ آسکتا تھا۔ لیکن مجبوری ہے وہی غیاث کا دل بیمار آڑے آجاتا ہے غیاث نے بھابھی کے تعلق سے "حنا کا رنگ بگڑتا رہا" یعنی جھوٹ گھڑا تھا۔ وہ تو میں نے آپ کو بتلا دیا اپنے عزیز ترین دوستوں کے ساتھ اس نے جو سلوک کیا ہے وہ بھی سُن لیجئے۔

غیاث کو نہ دروغ گوئی کا چسکہ ہے نہ ملکہ۔ بعض شرفاء بھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی دشنام طرازی پر اتر آتے ہیں۔ اس عمل سے اُن کے خاندانی جذبۂ شرافت کی شاید کہیں تسکین ہوتی ہو۔ ایسے شریف تر لوگوں میں اشفاق بھائی جو اشفاق حسین کے نام سے آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے ڈائرکٹر بنے بیٹھے ہیں سرِفہرست ہیں۔ گالی یوں دیں گے جیسے آپ کو عزت و توقیر سے خطاب کر رہے ہوں اور آپ کہہ کر اسطرح مخاطب کریں گے جیسے گالی دے رہے ہوں۔ غیاث کا کاروبار اس سے زیادہ مشاقی اور ریاضت کا کاروبار ہے وہ اپنی شرافتِ نفس سے جب خود ہی بیزار ہو جاتے ہیں تو منہ کا نہیں مزاج کا مزہ بدلنے کے لئے خود کو نہیں دوسروں کو جھوٹا ثابت کر دیتے ہیں۔ میں ایک بہت معمولی سا واقعہ سُناتا ہوں جو اتنا غیر معمولی ہے کہ کیسی پیاری پیاری ہستیاں زیادہ دنوں تک انتظارِ ساغر نہ کھینچ سکیں ـــــــ

حضرت محی الدین[1] حسینی اور نوید اقبال[2] یہاں ہوں تو سن لیں کہ ڈاکٹر غیاث نے پہلے تو یہ کہہ کر ترغیب دی تھی کہ ؎

گویا ہو راز دل وہ لب گفتگو تراش
ماں کا ہاتھ چوم لے پھر آرزو تراش

(غیاث صدیقی)

اور جب آرزو ترشی ہے تو غیاث نے اس کا حشر یوں کر دیا ؎

ہر صبح اہل کے در پہ صدائے مثال مہر
ہر دم بہانہ کرم حیلہ جو تراش

(غیاث صدیقی)

اور یہ سب کچھ کس طرح ہوا سنئیے ایک رات کی بات ہے۔ ابھی سلیمان اریب کا مرض الموت شروع نہیں ہوا تھا۔ مخدوم بھائی، ادیب اور میں اریب کے سسرالی مکان موقوعہ معظم جاہی مارکٹ پر گپ لڑا رہے تھے۔ بڑی کڑکی تھی رات کے کھانے کے لئے سب کچھ تھا۔ کھانے کے لالے تو آج پڑے ہیں۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب کھانے کے لئے سب کچھ رہنے کے بعد تنگدستی کا احساس ہوتا تھا مخدوم بھائی اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑ چکے تھے۔

"کچھ تو ہو ہی جائے۔ ایپی ٹائزر کے طور پر" ——— اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے تھے۔ لیکن اپنی جیب میں انگلیاں نہیں ٹھونسی تھیں۔

ع[1] فرزند مخدوم محی الدین ع[2] فرزند سلیمان اریب ع[3] فرزند اقبال متین

میں سمجھ گیا کہ جیب خالی ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"اب تو اپنی اپنی صلیب اٹھا لینے کی سکت بھی نہیں ہے"

"ایسے میں کوئی مسیح تو پیدا ہوگا ہی ـــــ اریب کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوا کہ ڈاکٹر غیاث گیٹ میں داخل ہوئے وہی موٹا موٹا سا پھولا پھولا سا معصوم چہرہ جو جدید معصومیت کی تلاش میں ہو ـــــ موسم تھا کہ جیب و امن کا فرق مٹانے کے درپے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ غیاث سمجھ گئے کیوں کہ اریب نے ایک آدھ جملہ تو ایسا کہہ ہی دیا ہوگا کہ غیاث کا ذہن نفس مضمون کی طرف راست مراجعت کرے۔ سو یہی ہوا۔ غیاث کہنے لگے میرے پاس فرنچ وسکی کی پوری ایک بوتل میرے دادا کے زمانے سے بالکل سیلڈ حالت میں رکھی ہوئی ہے۔

ذرا سوچئے تو ایک عزیز دوست بیٹھا ہوا اپنے مزاج کا مزہ بدل رہا ہے اور ہم جانکنی کے عالم میں ہیں۔ ہم تو کیا معاف کرتے آپ بھی معاف نہ کریں گے خیر یہ نہیں تابڑ توڑ ہم نے حملے کئے کہ اسی وقت وہ بوتل فراہم کی جائے۔ لیکن ڈاکٹر غیاث نے منہ بنا کر انتہائی افسوس کا اظہار کیا۔ کہنے لگے کہ بیوی بچے سب مہمان گئے ہیں جی اچاٹ سا ہونے لگا تو میں ادھر نکل آیا ورنہ کیا بات تھی ابھی لے آتا۔

ایک تو بوتل نہ لائے اور الٹے ہم پر احسان دھر گئے کہ جی اچاٹ ہو رہا تھا ہم سے دل لگانے چلے تھے۔ اور ہم ہیں کہ اُن سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ سے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

مصحفی

اور غیاث صدیقی نے کچھ اس طرح منہ بنالیا جیسے وہ ہم سے زیادہ

غمگین ہیں۔

ادیب دخت رز کے دامن تک دستِ نارسا کی مجبوری پر صبر کرلینا نہیں

جانتے تھے۔ بعد کو جاننے لگے تھے۔ لیکن میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ وقت

ابھی نہیں تھا ـــــ چھوٹتے ہی کہنے لگے۔

"تو کیا تمہاری بیوی تمہیں گھر سے نکال کر گئی ہے۔ گھر کی ایک کنجی تمہارے

پاس بھی تو ہوگی" ـــــ

ڈاکٹر سنبھلا اور بہت اطمینان سے دست بستہ عرض کی ـــــ جناب

دروازہ کھولتے ہی بوتل ملنے سے رہی کیونکہ وہ چوکھٹ میں دھری ہوئی نہ تھی۔

میں نے تو اُسے بڑے جتن سے چھپا رکھا ہے۔ گھر میں داخل تو ہو سکتا ہوں لیکن

اُس الماری کی کنجیاں جس میں بوتل ہے وہ میرے پاس نہیں۔ اور پھر مصیبت یہ ہے کہ

الماری گودریج کی ہے ورنہ قفل توڑ دیتا۔"

سمجھئے صاحب۔ یہ دوسرا احسان تھا اصل ڈاکٹر آدمی ذہین ہے۔ وہ

جانتا تھا کہ اگر وہ پہلے ہی نہ کہہ دے کہ الماری گودریج کی ہے تو ادیب مصر

ہوگا۔ "ہٹاؤ یار الماری کا قفل توڑ دو"

مجھے یاد ہے کہ مخدوم بھائی کی اور میری آنکھوں میں کیسی چمک سی آگئی

تھی۔ ڈاکٹر غیاث پر ادیب کا ہر حملہ امید کی کرن بن کر ہماری آنکھوں کی جوت

جگاتا ـــــ لیکن ڈاکٹر غیاث ہماری آنکھوں کی چمک اپنے ساتھ لئے چلا گیا ـــــ

(دیکھئے جذبہ آدمی کو کہاں لے جاتا ہے اب ادیب نے تڑنے پر اتر آیا ہوں) اُس

رات ہم نے پی نہیں۔ صرف کھانا کھایا۔

میں سبک دست و سبک ذہن زمانے والے
رات کی رات میں دیوار اٹھانے والے

(غیاث صدیقی)

بات یہیں ختم ہو جاتی تو ٹھیک بھی تھا۔ اب کبھی اکیلے میں مخدوم بھائی غیاث سے ملتے تو ہاتھ دبا کر آہستہ سے پوچھتے وہ بوتل محفوظ ہے نا ۔۔۔ اریب یا متین کو پہنچانا تو مجھے بھی اطلاع کرنا ۔۔۔ یا پھر مجھے ہی دے جاؤ ہم شیر SHARE کر لیں گے۔

اریب الگ سے ملتا تو پوچھتا ۔۔۔ "کیوں ڈاکٹر رکھا ہے نا وہ مال چھپا کر۔ یار ایک دن چلے آؤ ۔۔۔ لے آؤ۔ میں بلا لوں گا متین اور مخدوم بھائی کو ۔۔۔ تم تو جانتے ہی ہو قطرے قطرے کا حساب دینا پڑتا ہے حشر میں اور میں اس معاملہ میں بے ایمانی سے نفرت کرتا ہوں۔

میں ملتا تو الگ سرگوشیاں کرتا کہ "پیاسے تشنگی کا احساس صرف اس امید پر زندہ ہے جو تم نے بندھائے رکھی ہے۔ اس احساس ہی کو ختم کیوں نہیں کر دیتے ۔۔۔ کہہ دو کہ بوتل ٹوٹ گئی"

اریب، مخدوم بھائی اور میں آپس میں ملتے تو ایک دوسرے سے پوچھ لیتے ۔۔۔ غیاث ملے تھے؟ بوتل لے آئے؟ اور غیاث سے الگ ملتے تھے تو ڈرتے ہوئے ملتے کہ پتہ نہیں کب اس کے منہ نکلے ۔۔۔ "میں نے بوتل اریب کو دے دی"

لیکن ڈاکٹر ہم تینوں کو دلاسہ دیتا رہا ۔۔۔ جیسے زندہ رہنے کے لئے

انحصار ہو ـــــ مخدوم بھائی غیرت دار آدمی تھے۔ دِلی جانے سے پہلے انھوں نے بوتل کی بات پھر کی ہوگی۔ پتہ نہیں کیا بھانپ گئے ہوں گے پھر دنیا بھر میں گھوم پھر کر آنے والا یہ شخص دلی کی مسافت طے نہ کر سکا۔ آئے تو ایسے آئے نہ شکوہ نہ شکایت ـــــ آواز کی وہ نغمگی جس سے سارا حیدرآباد پیار کرتا تھا۔ بے آواز ہوگئی ـــــ غیاث کو بھی بڑا دکھ ہوا۔ وہ جانتے ہیں ان کا دل بیمار رہا تا ہے۔

میں اور ادیب بچ گئے ـــــ آخرش ادیب نے بھی بوتل وصول کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ وہ شخص جو پانی کی طرح شراب، اور شراب کی طرح پانی پیتا تھا۔ جس کو رم اور پانی کے رنگ میں تمیز بھی نہ رہی تھی بوند بوند کو ترس کر مر گیا۔ اس کا مرض ہی کچھ ایسا تھا۔ حلق کا کینسر۔ کوئی چیز نہ گلے سے نیچے ہی نہ جاتی تھی ـــــ غیاث کو بہت دکھ ہوا۔ وہ جانتے ہیں ان کا دل بیمار جاتا ہے۔

اب بچ رہا میں ـــــ میں نہ تو ایسا غیرت دار ہوں نہ ایسا زود حس میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وھسکی بہر حال وھسکی ہے۔ خواہ وہ فرانس سے دادا کے زمانے میں لائی گئی ہو یا چلتے چلتے رستم فرام سے خرید لی جائے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ جب اس فرق کو میں محسوس نہیں کرتا تو غیاث کیوں محسوس کریں ـــــ مجھے دادا کے زمانے کی فرینچ نہیں چاہیئے ـــــ اس ہال سے میرے گھر تک کتنے ہی مقامات پر مجھے فرانس ملتا ہے۔ ویسے ہر بندہ خدا کا بندہ ہے اور ہر وھسکی فرانس کی وھسکی ـــــ آج موقع کو غنیمت جان کر میں کوشش کرتا ہوں۔ آپ دعا کیجیئے کہ غیاث یہ عہدہ وفا کر دے۔

تشنہ لب لائے ہیں تجھ تک ترے عارض کے سراب
پہلے تو پیاس بجھا، آگ لگانے والے

(غیاث صدیقی)

یہ بوتل قصۂ پارینہ ہوئی - لیکن کھلتی رہتی تھی کہ آج تک کھلی نہیں
میں نے ایک دن غیاث سے بہت رازدارانہ طور پر بڑے گمبھیر لہجے میں بوتل کی بات
اس طرح پوچھی کہ مذاق کرنے یا ہنس کر ٹال جانے کی گنجائش نہ تھی ـــــ کچھ خاموش
سا ہو گیا ـــــ کہنے لگا مبین ـــــ میں نے وہ بوتل پتھر سے ٹکرا کر توڑ دی ـــــ
پھر وہ سنبھل سنبھل کر کہتا گیا ـــــ ایسا بھیگا ہوا لہجہ جو صاف بتاتا تھا کہ رندھے
ہوئے گلے کو چھپا رہا ہے ـــــ کہنے لگا: میرے ذہن میں جانے کس طرح
یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ پرانی شراب اب زہریلی ہو گئی ہے ۔ آپ لوگ مانگتے تھے میں
دینے سے گریز کرتا تھا ـــــ مخدوم بھائی نہ رہے ۔ ادیب چلے گئے ۔ بوتل پر نظر
پڑتی تھی تو آپ سامنے آجاتے تھے ۔ عجیب الجھن ہوتی تھی ـــــ دے نہیں سکتا کہ
واہمہ جڑ پکڑ گیا تھا ۔ اسی عالم میں ایک دن میں نے بوتل نکالی اور پتھر سے ٹکرا کر
پاش پاش کر دی ۔ عجیب سا سکون ہوا ـــــ آپ ۔ جیسے آپ ـــــ وہ آگے
کچھ کہہ نہ سکا ۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا ۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں ۔

اشک بن کر تری پلکوں سے ٹپک جاؤں گا
یاد رکھنا مجھے نظروں سے گرانے والے

(غیاث صدیقی)

••

اقبال متین

گلہ نہیں ہے صدائے فقیر ہے بابا

(ابراہیم شفیق مرحوم)

آمد ۱۲ر فبروری ۱۹۳۴ء ـــــ ۳۱ر مئی ۱۹۷۷ء رخصت

ابراہیم شفیق کی موت کی خبر میں نے آج ہی لوٹ کر پڑھی تھی۔ مسجد میں پہونچنے کے بعد سینے کو تکتے ہوئے نشتروں کا منجمد خون پھر پھوٹ بہنے کے لئے آمادہ محسوس ہوا اور اس احساس نے مجھے غم و اندوہ، اذیت اور کرب کے اس دوراہے پہ لا کر چھوڑ دیا جس پر پہونچ کر ابراہیم شفیق نے پیروں کی گرد جھاڑ دی ہوگی اور ایک ہی جست میں آسمانوں کی بلندیوں کو چھونے کے لئے عیادت کو نہ آنے والے ساتھی کا انتظار کئے بغیر نکل پڑا ہوگا۔ میں یہ کیسے مان لوں کہ عدم کے مسافر کچھ بھی ساتھ نہیں لے جاتے۔ دل جب بند ہوتا ہوگا تو وہ حسرتیں اور محرومیاں تو اس سیپ میں آبِ نسیاں کی طرح بند ہو جاتی ہوں گی جو دل کے ٹھہر جانے تک ساتھ رہی ہیں۔

مسجد میرے دل سے زیادہ ویران تھی۔ اس ویرانی کے آثار مجھے باہر ہی سے نظر آ گئے تھے۔ میں نے ایک بزرگ حضرت سے جو برابر کی دوکان پر بیٹھے

تھے بڑی لجاجت سے پوچھا کیوں کہ موت انکسار سکھا دیتی ہے۔

"کیوں صاحب یہاں کسی کا فاتحہ ؟"

"ہاں شاید کچھ تو ہے ہی آپ اندر کیوں نہیں چلے جاتے"

کسی نے میرے سینے کے اندر سے سرگوشی کی ——— سماں پیار کرنے کے لیے ہے ڈرنے کے لیے نہیں ہے ——— اور ایک ویرانہ دوسرے ویرانے میں داخل ہوگیا۔ میں مسجد میں کھڑا تھا۔

مسجد میں بہت کم لوگ تھے۔ کچھ مرحوم کے عزیز و اقارب ہوں گے۔ لیکن ابراہیم شفیق کے رشتہ دار تو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں ——— اردو کے مقبرے جہاں جہاں ہیں ان کے سارے مجاور جانتے ہیں کہ اردو کی بے شمار لاشوں میں ایک لاش اس ابراہیم شفیق کی بھی ہے جس کی آخری کتاب پر کرشن چندر کی لاش نے اپنا آخری مقدمہ لکھا تھا۔ مجاوروں کی بات چھوڑ دیئے۔ انھیں مقبروں کی روٹی کمانی ہے ——— اور پھر ان مجاوروں کے ہاتھ ہمیں نے تو لاشے تھمائے ہیں کہ تم چاہو تو انھیں مقبرے تک لے جاؤ یا ——— انھیں احاطے کے کسی گوشے کے باہر ہی پھینک دو ——— اس مجرمانہ بے حسی کے جنم داتا ہم ہیں ——— ہم ادیب شاعر، انسانیت کے علم بردار دوسروں کو دکھی دیکھ کر تڑپ جانے والے ہم۔

دوسروں کے آنسوؤں کو اپنے دامن میں جذب کر لینے والے ہم لوگ بہت اونچے لوگ ہیں۔ جب تک ہم سانس لیتے رہیں گے تب تک ہم خود کو کرشن چندر اور ابراہیم شفیق سے ہر طرح اعلیٰ و ارفع سمجھتے رہیں گے ——— اس لئے بھی ہم اونچی اونچی ذاتوں میں بٹ گئے ہیں ہم کلاسیکل ادیب اور شاعر ہیں ——— ہم

ادب برائے ادب کے قائل ہیں ــــ ہم ترقی پسند ہیں ــــ ہم ترقی پسند نہیں، جدید ہیں
اونچی ذات کے برہمنوں کے مندر اب ان کے لئے مختص نہیں رہے لیکن ادب کے ایوانوں میں
پارٹی بندیاں ــــ اجارہ داریاں ــــ سب کچھ روا ہیں ــــ معروف ادیب شاعر
غیر معروف ادیب شاعر، لوکل ادیب شاعر، یونیورسل ادیب شاعر ــــ سوال یہ ہے کہ
ہمیں ان خانوں میں بانٹنے والے کون لوگ ہیں ــــ وہ لوگ ہم خود ہیں۔ چلئے اگر یہ
تسلیم کر بھی لیا جائے کہ صاحب آپ خدائے سخن ہیں۔ نثر بھی آپ کی باندی، نظم بھی آپ
کی کنیز ــــ لیکن جب لاد چلے گا بنجارہ ــــ نہ آپ کے حواری رہیں گے نہ میرے
ثنا خواں ــــ ساری گروہ بندیاں ٹوٹیں گی بکھریں گی کچھ دنوں تک تھکی تھکی گونج سی
کہیں سنائی دے بھی تو ہار کر چپ ہو جائے گی ــــ پھر ایک ناقد، ایک بے رحم ناقد،
ایسی کسوٹی لے کر اٹھے گا جو صرف تخلیق کو کس کر پرکھے گی ــــ ریت کے ٹیلے رہیں گے
نہ بانس کے بدے پھر ہمیں کس بات کی فکر، کس بات کا ڈر ہے ــــ کسی ساتھی
کی موت پر آنسو بہائے بغیر بھی اس کی میت میں شرکت کر لینے سے ہمارے ادبی قد
کس طرح چھوٹے ہو سکتے ہیں ــــ کسی ساتھی کی موت کو نظر انداز کر دینے سے
ہمیں عظمت کا تمغہ ہماری کون سی انا عطا کرتی ہے۔ ابراہیم شفیق کی موت ایک مشاعرہ
اور ایک ادبی محفل سے کم وقعت رکھتی تھی جن میں ہم شاعر اور ادیب اپنے خرچ سے
جیب و دامن کی بخیہ گری کا خیال کئے بغیر شرکت کرتے ہیں ــــ ابراہیم شفیق کے
چھوٹے بھائی نے ٹرک کا انتظام کیا تھا کہ ابراہیم شفیق کے دوستوں کو زحمت نہ ہو
ــ کاش سی اعظم نے سوئم کے دن ایک ادبی محفل یا ایک مشاعرہ منعقد
کر دیا ہوتا ــ

ہم سب کی طرح ابراہیم شفیق کو بھی اپنے خاندان اور اپنے قبیلے پر فخر تھا۔ اہلِ علم کا خاندان اہل قلم کا خاندان ادیبوں اور شاعروں کا اتنا بڑا خاندان ـــ اور اس خاندان کے بے شمار افراد حیدرآباد کے ہر حصے میں رہتے بستے ہیں ـــ ہم سب اکٹھا ہوجاتے تو ابراہیم شفیق کے لئے نہیں، اس کے بعد جانے والوں کے لئے ایک تسلی ایک طمانیت تو ہوتی کہ ہمارا آخری سفر اتنا شاندار ہوگا ـــ ہمارے لئے اتنے دل اُداس ہوں گے، اتنی آنکھیں نم ہوں گی۔

ابراہیم شفیق سے میری ملاقاتیں بہت سرسری اور واجبی تھیں۔ سر راہے صاحب سلامت ہوتی تو بھی اس طرح ملتے کہ ان سے ملنے کی تمنا رہتی ـــ ایک بار مصنوعات ملکی کی نمائش میں ملے تو دیر تک میرے ساتھ رہے۔ دو چار دن پہلے بمبئی ہو آئے تھے۔ کرشن چندر صاحب اور سلمیٰ حجاب نے میرے تعلق سے جو باتیں کی تھیں وہ اتنا خوش ہو ہو کر سناتے رہے جیسے ان کی تعریف و توصیف ہوئی ہو۔ میں حسب عادت خجل ہوتا رہا اور موضوع بدلنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اصرار کرتے رہے کہ میں کرشن چندر صاحب کو خط لکھوں اور لکھوں کہ جلد ہی اپنی خاموشی کو توڑ رہا ہوں ـــ اس بات سے ابراہیم شفیق کی وسعتِ قلبی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ـــ دوسروں کی تعریف سن کر وہ بھی اپنے ہی "پیشے اور فن" میں اس طرح خوش ہونا بڑی بات نہیں بہت بڑی بات ہے ان کے مزاج کا یہ شریفانہ پہلو تو بالکل واضح تھا ـــ کسی متنازعہ بات میں وہ ملوث نہ ہوئے ـــ نہ ٹولا نہ گروپ جس سے ملنا جھک کر ملنا ـــ بھلا ایسے شخص کو بھی میری برادری نے اپنا برادر نہ سمجھا۔

مسجد میں داخل ہوا تھا کوئی جانی پہچانی صورت نہیں تھی ایک صاحب اُٹھ

کر قریب آئے اور لپٹ گئے ـــــ کچھ سنبھلنے کے بعد ان کے اندازِ تکلّم اور لبوں کی جنبش نے میرے آگے ابراہیم شفیق کو کھڑا کر دیا ـــــ میرے اللہ ـــ اتنی عظیم فنکاری ایسی صناعی، ایسی صورت گری سوائے تیرے کسی کے اختیار میں نہیں ـــــ میں نے پوچھا۔

"آپ ابراہیم شفیق کے بھائی ہیں؟"

کہا ـــــ "جی ہاں - وہ مجھے نواب پکارتے تھے۔"

ابراہیم شفیق کی باتیں سُناتے رہے۔ کہا بھائی کہتے تھے کہ دواخانے سے صحت پاکر نکلوں گا اور اپنے دوستوں کو پہچانوں گا۔ انھیں بڑا دُکھ تھا کہ ان کے بہت قریبی دوستوں نے بھی انھیں اپنا نہ سمجھا ـــ انھیں محبت سے محروم رکھا ـــــ مجھے یقین ہے کہ ابراہیم شفیق صحت پا کر دواخانے سے نکلتے تب بھی وہ دوستوں کو نہ پہچانتے اور ان سے محبت کئے جاتے ـــــ اس لئے بھی کہ زندہ رہنے کے لیے بہت سوں کو پہچان کر بھی فریب کھاتے رہنا زندگی کو سہل بنا دیتا ہے۔

بعد میں کسی نے نواب کو اعظم کہہ کر پکارا تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ اعظم ہیں - جنھیں ابراہیم شفیق پیار سے نواب پکارتے تھے۔ میں اعظم کے برابر ہی مسجد میں بیٹھا رہا - اس وقت چونکا جب عاتق شاہ کو میرے پیچھے کھڑا بغور مجھے دیکھتے دیکھا ـــــ کچھ دیر بعد ہم صحن مسجد میں چلے آئے۔ عاتق شاہ اپنے مخصوص انداز میں ابراہیم شفیق کی بیماری سے موت تک تفصیل سے ایک ایک بات بتاتے رہے ـــــ حباب کے رویئے سے وہ بھی دُکھی تھے ـــ گھٹی چیخ بننا چاہتی تو مشتعل ہو جاتے پھر سنبھل جاتے ـ ہم باتیں کر رہے تھے کہ ناصر کرنولی آ گئے ـــ جو باتیں رہ گئی تھیں وہ ناصر نے بتلائیں - یا شاید میرے پوچھنے پر انھیں باتوں کا اعادہ کیا جو عاتق نے

بتلائی تھیں ـــــ مرنے کے بعد مرنے سے پہلے کے واقعات جاننا بے سود ہے لیکن اس سے اتنا ضرور ہوتا ہے کہ مرنے والے کا کسی نہ کسی بہانے ذکر تو ہوتا رہتا ہے' اس سے اُس کی یادیں بٹوری جاسکتی ہیں' دل پگھلایا جاسکتا ہے' پلکیں نم کی جاسکتی ہیں۔ اس مشینی زندگی میں یہ بھی غنیمت ہے۔

اعظم صاحب نے بتلایا کہ مزار تک چلنے کے لئے ٹرک کا انتظام کیا گیا ہے۔

ہم لوگ ٹرک کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ اکرام جاوید ملے۔ اکرام جاوید کے ساتھ ابراہیم شفیق کا نام میرے ذہن میں جانے کیوں لازم و ملزوم تھا ـــــ بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ان دونوں میں گہری دوستی تھی ـــــ دوستیاں کچھ ناموں کو اس طرح براکٹ کر دیتی ہیں کہ سائن بورڈ بنایا جائے تو " اینڈ کو" والی بات ہو جاتی ہے۔ ـــــ نہ بنایا جائے تو شاید ایک روح دو قالب ایسی ہی دوستیوں کو کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ان دوستیوں کی عمر بھی طویل ہو' مجھے یاد ہے۔

مخدوم محی الدین اور میر حسن' نظر حیدر آبادی اور سلیمان اریب' عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر' اقبال متین اور لطیف ساجد' شاذ تمکنت اور عوض سعید' مغنی تبسم اور قدیر زماں' رؤف خلش اور حسن فرخ۔ آرٹسٹ عزیز اور انور رشید۔ یہ ایسے نام ہیں جن کے چہرے میرے ذہن میں کوئی ایک نام لیتے ہی دوسرے نام کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتے ہیں ہو سکتا ہے کہ دوستیوں کے ناطے یہ میرا اپنا جذبۂ وفا ہو یا ذہنی افرا تفری ـــــ کچھ ہو ـــــ کچھ تو ضرور ہے ہی۔

ٹرک کے قریب پہونچے تو علی الدین نوید ملے۔ نوید کو دیکھ کر جانے کیوں یوں لگا جیسے کوئی میرے زخم پر مرہم رکھ رہا ہے نوید جدید تر نسل کے

نمایندے ہیں لیکن غمِ ذات کی شاید اُس منزل پر نہیں ہیں جہاں سے دوسروں کی میّت بھی نظر نہیں آتی خدا نوید کو ذات کے ایسے خول سے بچائے رکھے ـــــ ان پر مجھے پیار آتا۔

ٹرک مردانہ ہوا ہے تو زمین پر رہ کر بھی ہم زمین سے کٹ گئے ہیں ـــــ راستے کا پتہ ہے نہ سمتوں کا شعور۔ کھلی ٹرک کے بیچ کھٹے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے ہیں۔ دوکانوں کے سائن بورڈ، ہوٹلوں کے قمقمے، بنگلوں کے نیم تاریک چھجے ـــــ کبھی کچھ پہچان لیا تو پتہ چلا کہ ہم کہاں ہیں ـــــ ورنہ نظریں اوپر کو اٹھی ہوئی ہیں اور سارے مناظر اس سے پہلے بھی دیکھے بھالے کے باوجود اجنبی ہیں۔ صرف اتنا احساس ہے کہ مصری گنج دور ہے ہم ابراہیم شفیق کی آخری آرام گاہ تک پہنچنے کے لئے جن اجنبی مناظر سے گذر رہے ہیں وہ زمین ہی پر ہیں ـــــ ابراہیم شفیق اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کی محبت کی تلاش میں ہاسپٹل سے نکل کر جن راستوں پر ٹھوکریں کھانے والا تھا وہ بھی اسی زمین پر تھے لیکن وہ راستہ بھٹک کر آسمانوں کی پہنائیوں تک جا پہنچا ـــــ اس سے کون پوچھے کہ تم نے کتنے اجنبی راستے طے کئے ـــــ تم نے کتنے نامانوس مناظر اپنی بند آنکھوں میں بسائے۔ تم نے کتنی مشکل سے دوستوں کی بے وفائی کو سمجھا اور کتنی آسانی سے اپنی وفائیں بیچ کر چھپ گئے۔

ابراہیم شفیق کا کھلنڈرا پن چھپا اور شریر اکلوتا لڑکا بقول ناصر کرنولی، کہ دو روز میں جہاندیدہ شخص کی طرح کچھ بن گیا ہے۔ کیا بن گیا ہے وہ، شاید جانے والا جاتے ہوئے اس کا بچپن اپنے ساتھ لے گیا ہے ـــــ کیسی مجبوری ہوگی وہ کہ اس نے یہ سودا بھی چپکے سے کر لیا ـــــ کیا بیتی ہوگی اس پر کہ اس نے اپنے ننھے کو آگہی کے اتنے ویرانے بھٹکنے کے لئے سونپ دیئے۔

ٹرک مصری گنج میں کہیں رُک گیا ہے ٹرک کے چوبی چوکھٹے میں فٹ کیے ہوئے، سرچاپ لگے گڈوں کی طرح، اپنے اپنے لکڑی کے پیروں پر کھڑے ہو گئے ہیں ـــــ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب کے سب گوشت پوست کے ذی روح بن گئے شیشوں کی آنکھیں حرکت میں آ گئی ہیں ـــــ

بائیں جانب ٹیک پر مسجد ہے۔ مغرب کی اذاں خاموشیوں کے دوش پر سوار ہو کر روحوں تک پہنچ رہی ہے۔ مسجد کے برابر ٹیک پر پھیلے ہوئے شہر خموشاں کو زندگی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہوگی ـــــ یہ بات ہم میں سے کوئی نہیں جانتا ـــــ زندگی اور موت کے درمیان جو طویل فاصلے ہیں وہ وقت اور فاصلوں پر فتح پانے والے اس مشینی دور کی گرفت سے باہر ہیں۔ صرف موت ہی جانتی ہوگی کہ موت کیا ہے۔

ابراہیم شفیق اپنی آخری آرام گاہ کے احاطہ سے نکل کر آرہا ہے۔ نظریں چار ہوئی ہیں تو میں نے نظریں جھکالی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کی موت کی خبر اخباروں میں اتنے غیر اہم طریقے پر چھاپی گئی ہے کہ اس کی کہانیوں کے مجموعوں کی اشاعت کی خبریں بھی اہتمام سے چھپی تھیں ـــــ ہم سب کو شرمسار دیکھ کر ابراہیم شفیق مسکرا رہا ہے ـــــ لوگ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر آرہے ہیں اپنے رشتہ داروں کا پاس ولحاظ ہوگا اس کو ـــــ تب ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا قبرستان کی چار دیواری کی طرف آرام لینے کے لئے لوٹ رہا ہے کہ سب ہی اس کو نصیحت کریں گے۔ تمہیں تو آرام کی ضرورت ہے ـــــ عثمانیہ ہاسپٹل سے ڈاکٹروں کی چوری سے بھاگ کر گھر آجانے والا ابراہیم شفیق۔ پھر گھر کا سکھ چین چھوڑ کر

حیدرآباد نرسنگ ہوم میں خود ہی شریک ہو جانے والا ابراہیم شفیق ۔ عثمانیہ دواخانہ کو دوسری بار لے جائے جانے تک اپنی بیوی اور اپنے بچے کو خیالوں میں بسائے رکھنے والا ابراہیم شفیق ۔ عثمانیہ دواخانہ سے پھر ایک بار فرار ہو جانے کی سکت کھو کر سر جھکا لینے والا ابراہیم شفیق اب کس قدر اطمینان سے اپنی قبر کی طرف جا رہا ہے کہ دوسرے دکھی نہ ہوں اُسے آرام کی ضرورت ہے ۔

چادر گل، پھول، فاتحہ، سب کچھ ہو چکا ہے ۔ شام ڈوب رہی ہے ۔ چراغ جل رہے ہیں ۔ کوئی نوجوان اعظم کے قدم پکڑ کر بلک رہا ہے ۔ بین کر رہا ہے ــــــ اب آپ ہی ہمارے سرپرست ہیں ــــــ ابراہیم شفیق کے ننھے کو لوگ سینے سے لگا کر دلاسا دے رہے ہیں ــــــ اس طرح نہیں روتے ــــــ نہیں روتے اس طرح، بابا کی روح کو تکلیف ہو گی بیٹا ــــــ لوگ لوٹ رہے ہیں ــــــ میں قبرستان کے دروازے سے پہلے رک گیا ہوں ــــــ فاتحہ کے لئے پھر ہاتھ اٹھ گئے ہیں ــــــ کوئی صاحب مجھ سے دو تین قدم آگے سر جھکا لیے کھڑے ہیں ۔ کون ہیں میں نہیں پہچانتا ہوں ــــــ آنکھیں بھیگ گئی ہیں ۔ آہستہ آہستہ گالوں پر اترنے والی گرم بوندوں کی لکیریں سرد ہو رہی ہیں ۔ دوبارہ فاتحہ پڑھ کر دروازہ تک چلا آیا ہوں ۔ دروازہ تک پہنچ کر ذرا سا ٹھہر گیا ہوں کہ اپنا چہرہ درست کر لوں تو باہر نکلوں ۔ پشت پر کسی کھردرے ہاتھ کا نرم لمس محسوس کرتا ہوں ــــــ

ابراہیم شفیق ہے ۔ ابھی مسکرانے کی کوشش کر رہا ہے ــــــ پوچھ رہا ہے کہ آپ میری موت پر رو رہے ہیں یا میری موت کی کسمپرسی پر ــــــ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے تک رہا ہوں ــــــ اس کو کیا جواب دوں ؟

آخرش دل کی بات زبان پر آگئی ہے میں تمہاری موت میں اپنی موت کا تماشہ دیکھ رہا ہوں۔

ابراہیم شفیق نے شاید میری بات سُن لی ہے۔

وہ جا چکا ہے۔



جون ۱۹۷۷ء

اقبال متین کا شعری مجموعہ

"صریرِ جاں"

شائع

ہونے کے مراحل

میں

مولانا سیّد فخرالدین

(ایک ناتراشیدہ بُت خودساختہ)

ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد میں یادوں کا ایک سلسلہ باتیں ہماریاں کے عنوان سے شروع کر رکھا ہے۔ اسی عنوان کے تحت ایک لڑکے کا ذکر تفصیل سے کیا تھا جس کو میں نے یہاں مختصر کر دیا اسلئے جب یہ لڑکا مولانا ہو کر اپنے اصلی روپ میں آیا تو اس نے خود اپنی یادوں پر شب خون مار دی۔"

کِس کو گرفت میں لے لوں، کون گرفت سے باہر ہے۔ ماضی یادوں کا ایسا کاروبار سود و زیاں ہے کہ جو اپنا ہے سو بھی اپنا نہیں ہے اور جو پرایا ہے، وہ پرایا کہاں ہے۔ کتنے مجھے اپنا لیں گے کتنے منہ پھیر کر گذر جائیں گے۔ یادیں اپنی عافیت کا سودا کرنے نہیں دیتیں۔ قلم مصلحت پسند ہو جاتا ہے تو ضمیر ہاتھ سے قلم ہی چھین لیتا ہے۔ جو سچ ہے وہ اپنی موت آپ مر ہی نہیں سکتا۔ آپ سچ کو قتل کر دیجئے۔ وہ اپنے لہو کی بوند بوند سے پھر جی اٹھے گا خواہ اس کو امتدادِ زمانہ وقت کی مٹی میں دبا کر ہی کیوں نہ رکھے۔ شک نہیں کہ اس کو زندہ ہو کر اٹھنے میں وقت لگے گا۔ لیکن یہ وقت ہی ہے جو اسے جاگنے کے لئے اکساتا ہے اور ایک دن جھنجھوڑ کر کھڑا کر دیتا ہے۔ قاتل فقیہ شہر بھی شحنۂ شہر بھی مسند نشین بھی۔ کیا یہ مقتول "سچ" وقت کے ہاتھوں قاتلوں کی نس نس میں زہر نہیں بن

جائے گا۔ قاتلوں کو مقتول ورثے میں ملتے ہیں تو وقت بھی سزا کے لیے قاتلوں کی وراثت قبول کر لیتا ہے۔ ایسا اگر نہیں ہے تو ہم جیسوں کے لیے زندگی کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ چھوٹا اور بڑا اور بڑا سب جھوٹ ایک ہی قطار میں کھڑے ہیں۔ صرف قد چھوٹے بڑے ہیں —— اسی لیے وہ جو یاد آتا ہے وہ بھی مجبور ہے۔ اور وہ جو یاد کرتا ہے وہ بھی مجبور ——

ایک لڑکا یاد آتا ہے —— مجھے تو آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ لڑکا ہمارے خاندان میں کس طرح داخل ہو گیا۔ اسد یا اس سے بھی چھوٹے بھائی سعادت شبیر کا دوست تھا —— بچپن سے آمد کی جاوک شبیر میاں کے ساتھ شروع ہو گئی تھی۔

ہمارے خاندان میں پسندیدہ اجنبی کی طرح آتا جاتا رہا۔ پھر خود ہی اپنی انکساری اور فرماں برداری کے باعث ہر ایک کے ذہن سے اجنبیت دور کی اتنی تیزی سے آگے بڑھا کہ ہمارا ہر گھر اس کا بھی گھر ہو گیا۔

آج اس کا بچپن اس سے اسطرح کٹا ہے کہ جانے اس نے اس لڑکے کو بھٹکنے کے لیے کہاں چھوڑ دیا۔ مجھے برسہا برس تک یہ نہ معلوم ہوا کہ اس کا اتا پتا کیا ہے۔ مجھ سے عمر میں چھوٹا رہنے کے باوجود وہ مجھے اس درجہ عزیز ہوا کہ عمر کے تفاوت نے بھی ایک دوسرے کی طرف بڑھنے سے نہ روکا۔ اس کی آدا جانی نے ہمارے خاندان کے چند مخصوص گھروں کو جیسے اپنی ہی ملکیت بنا رکھا تھا اور وہ ان گھروں میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ آفس میں میرا اپنا گھر بھی تھا۔

اس کے والد ماجد کے بارے میں عجیب عجیب باتیں میرے کانوں تک

آتی تھیں۔ ان کی خانقاہی زندگی کی نقیر نفسی نے دنیاداری کا ایک پہلو بھی اپنے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ وہ صاحبِ اولاد ہوئے تو ہوتے ہی رہے۔ اور رزق کی فراہمی کا فرض اللہ میاں کو سونپ دیا۔ اس لیے کہ انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ بعد میں شاید گھر پر خانقاہ نے فتح پائی۔

نہ کشش بدہن، نہ راوی کا اعتبار۔ نہ مجھے ان باتوں سے دلچسپی ؟ وہ میرا ہوا، میں اس کا ہوتا گیا۔ اپنے بچپن سے مسیں بھیگنے تک وہ ہمارے خاندان کے فرد فرد سے واقف ہو چکا تھا۔ سب کا ہنیں تو بہت سوں کا چہیتا تھا ——— میں تو اتنا جانتا تھا کہ وہ منیرہ کے سب سے چھوٹے بھائی سعادت شبیر کا جانی دوست ہے اور اس دوستی نے لڑکپن سے عنفوان شباب تک کھیل کھیل میں کئی سربستہ راز اپنے سینوں کے نہاں خانوں میں اپنے بزرگوں سے مخفی رکھے ہیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ دونوں نے ایک ہی لڑکی کو چاہا۔ پھر جب سعادت شبیر پاکستان چلا گیا تو اس وقت بھی ان دونوں کی عمریں محبت تو جان سکتی تھیں، محبت کی محرومیوں کو آزارِ جاں بنا لینا ابھی شاید ان کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ سعادت شبیر اپنے بڑے بھائی راز قاسمی کے ساتھ پاکستان چلا گیا تو یہ بات کم از کم میرے ذہن میں واضح ہو گئی کہ اس داستان کے آغاز ہی سے ایک کڑی اس حد تک بودی تھی کہ ساری زنجیر دوسرے کے ہاتھ میں تھما گئی۔ بعض لوگ اسے حق دوستی کہتے تھے۔ میرا جی نہیں مانتا۔ پھر یہ لڑکی میری بنتِ عم بڑی ناشائستہ سازشوں کا شکار ہوئی۔ اس کے اپنوں نے جن سے زیادہ اس

کیلئے کوئی نہ تھا اُس کے ساتھ گھناؤنی آلائشوں کو روا رکھا لیکن اس جبر و استبداد نے بھی اس کا دامن آلودہ نہ کیا۔

میں نے باتیں ہماریاں کے کسی پچھلے باب میں ایک لڑکی کا ذکر کیا تھا میرے خاندان کی سب سے صابر و شاکر لڑکی تھی۔ اللہ میاں نے اس کے صبر جمیل کا اجر اس کو دیا۔ یہ لڑکا سید فخر الدین میری آپی بہن اختر سلطانہ کا سہاگ بن کر آخر اس گھر کا ایک ایسا فرد ہوا جس نے ہر دل میں جگہ بنالی۔ میں اعتراف کرتے ہوئے پس و پیش کیوں کروں کہ فخر میرا دیوانہ تھا اور مجھے بھی بہت عزیز۔ اقبال بھائی، اقبال بھائی کہتے اس کی زبان سوکھتی تھی۔ اس نے سلطانہ سے مثالی شوہر کا سلوک کیا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ سلطانہ کے خلاف سازشوں میں وہ بھی ملوث تھا۔ قرائین اس کے بالکل خلاف ہیں۔ میں اس سے قربت کی بنا پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس نے ہر حالت میں سلطانہ کا خیال رکھا۔ اس کی دل جوئی کی۔

بُرے دن کس پر نہیں آتے۔ حیدرآباد کے جاگیردارانہ سماج میں مفت کی نعمتیں بٹورنے والے سارے معاشرے کے سینے پر مونگ دلتے رہے اور انھیں اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی ضرورت بھی نہ پیش آئی کہ اُلّو خود سیدھے ہو جاتے تھے۔ لیکن وہ اعلیٰ متوسط طبقہ جس کو مر مر کر اپنی آبرو بچانی تھی۔ اپنی عزت کا تابوت کندھوں پر اٹھائے پھرنا تھا۔ ہمارا خاندان ایسے ہی پٹے ہوئے مہروں کی شطرنج تھا جو چار خانوں چت نہیں پورے ۶۴ خانوں چت تھا۔ نوابی نام کا تجزیہ بن کر چغلی کھاتی تھی۔ فخر الدین اسی ہانپتے ہوئے نوابی خاندان میں خانقاہی فقر

کی گٹھڑی اٹھائے ہوئے داخل ہو گیا تھا ـــــــ اللہ پہلے توکل کیجیے - توکل کو جزو ایمان سمجھتے ہوئے اس نے اس نوع کی عبادت اور بیوی کی محبت میں کوئی فرق نہیں کیا - عزلت جائز لیکن عزل کو کبھی جائز نہیں سمجھا - چنانچہ میری بہن سلطانہ جب بھی ملتی حاملہ ملتی ـــــــ میں اسے ستاتا - وہ شرماتی تو میاں فخر بھی کچھ نادم سے لگتے - اس ندامت میں دخل تھا تو انھیں بڑے دنوں کا جو معاشی بدحالی کے سبب زندگی کا حسن چھین لیتے ہیں -

میاں فخر نے کبھی ہمت نہیں ہاری، پامردی سے بیاد راتوں اور مشکل اداس دنوں کے لئے جگنو پکڑتا پھرتا رہا - اس کے تیرہ دنوں میں کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا - دکھ کی بات یہ ہے کہ اس کی برائیاں ان لوگوں نے بھی کیں جن کا وہ کفیل تھا لیکن اس نے ان کا بھی آخری دن تک ساتھ دیا - یہاں تک کہ ان لوگوں نے اپنا آخری سفر اسی کے گھر سے کیا ـــــــ فخر نے کبھی ان کی برائی نہیں کی - یہ بڑے ظرف کی بات ہے، ہر ایک کے بس کا روگ نہیں -

جب وہ اکاؤنٹس کے کسی عہدے پر جدہ چلا گیا تو اس کے دن پھرے - اس نے جب سلطانہ کو اور اپنے بچوں کو ہر قسم کی آسائشیں بہم پہنچائیں - خاص طور پر سلطانہ کی ہر محرومی کو اس نے مسرتوں کا لبادہ اڑھا دینے کی ہر ممکن کوشش کی، ہنسایا، خوش رکھا - جدہ سے جتنے دن کے لئے آتا اسے رجھاتا، چاؤ کرتا، جتن کرتا، محبتیں نچھاور کرتا - چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنی زود رنجی بلند صدائی کا سلطانہ کے احتجاج پر گلا گھونٹ لیتا وہ مجھے اشارہ کرتی - "آپ تو بھی سمجھاؤ"

میں کبھی کامیاب ہو جاتا کبھی ناکام - ایسے میں بھی اُس نے کبھی اپنے اقبال بھائی کو نہیں بھولا - بہت بے تکلف ہوا تو مستین جانی کہہ کر مخاطب کیا - گویا یہ اس کا لاڈ تھا -

اختر سلطانہ کی بیماری میں اُس نے ہوش و حواس کھو کر اُسی کا ہو رہنے میں اطمینان قلب کے سامان کئے - اپنی آرام جاں کے لئے اپنا آرام تج دیا - روپے کو ٹھیکری سے زیادہ نہ سمجھا لیکن سلطانہ نے بھی شاید طے کر لیا تھا کہ عورت کا سہاگن اٹھنا ہی شادی مرگ ہے - اور اُس نے اپنے گھر سے جاتے جاتے ہر خوشی بٹور لی - فخر کے علاوہ اس کے گھر میں سلطانہ کے غیاب کے اداس سائے ہر طرف پڑنے لگے تھے - میں نے فخر کی سب سے چھوٹی بیٹی پروین کو ماں کے بعد پھر اس طرح نہیں دیکھا - ساری کی ساری نہ تھی لگتا تھا ٹوٹ کر بکھر بکھر گئی ہے اور خود کو چن چن کر جمع کرتی پھرتی ہے -

کسی کی موت کے ساتھ کوئی نہیں مرتا - مر کر بھی زندہ رہ جاتا ہے موت کا صرف اتنا کام ہے کہ سانسوں کا حساب رکھے - آہوں اور آنسوؤں سے اسے کوئی سروکار نہیں - وہ ان کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی - موت ہر زندگی کے بعد خود کو بچا کر دوسری زندگی کا پیچھا کرتی ہے - پھر وہی بات آتی ہے کہ کسی کی موت کے ساتھ کوئی نہیں مرتا - یہاں تک کہ موت بھی نہیں مرتی - زندگی فانی ہے تو شاید موت جاوداں -

میاں فخر الدین کے مزاج میں شروع سے تلون تو تھا ہی - اپنے

الی اوصاف کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بدمزاجی کے بھینٹ چڑھا دینا۔ اُن کو احساس
راحت سے ہمیشہ بے نیاز رکھتا۔ سلطانہ کے بعد اُس میں دیکھتے ہی دیکھتے
ی تبدیلیاں آگئیں کہ اس کے قریبی متعلقین اس سے دلبرداشتہ ہونے لگے۔
آشنا دل تنگ مزاج اور تند خو شاذ ہی ہو سکتا ہوگا۔ ایسی مثالیں
یں کے برابر ہونگی۔ یا پھر وہ غم نہیں ہے کسی کمی سے اپنے آرام میں خلل کا شدید
ماس ہے جو منہ کھولنے نہیں دیتا اور اندر ہی اندر بپھرتا رہتا ہے۔ لیکن
پھر اور کب تک۔

میں نے جتنی شکایتیں سنیں ان میں شاکیوں کا جذبہ یہی تھا کہ فخر
ائے میرے اور کسی کی بات نہیں سنتا۔ میں اس کے پاس[۱] بات کا مجاز ہوں
اس کی ذاتیات کے تعلق سے بھی بات چھیڑ سکوں۔ سبھوں نے اپنا اپنا
کھ درد میرے سامنے رکھا۔ اس بات کی خواہش نہیں تھی کہ میں بیچ
ں پڑوں۔ فخر کی اس محبت میں نہ کبھی میر تقی میر اور اسد اللہ خان غالب کی
اعری درمیان میں آئی نہ اقبال متین جیسے چٹ بھیئے افسانہ نگار کا افسانہ۔

فخر نے کچھ عرصے سے اپنا یہ شعار بنا رکھا تھا کہ زبان کو ایسا ہتھیار
ـا کر استعمال کرے جس سے اگر دوسروں کی دل شکنی ہو تو ہو لیکن اس کی
ی فوقیت کا کوئی پہلو نکلے۔ اس نے اپنے اس ہتھیار سے کئی مواقع پر خود
ے مجروح کیا تھا۔ وہ اپنے اور اپنے بچوں اور اپنے اجداد کے سوا کسی کو اہمیت
دیتا تو دور رہا لائق اعتنا بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس فوقیت

کا اور چھور کیا تھا۔ کس کنارے سے یہ شروع ہوتی تھی اور کس کنارے پر اس کا انت تھا اس کا علم سوائے اس کے کسی کو نہ تھا۔ اللہ میاں کو بھی نہیں۔ بس ایک خودساختہ فضیلت تھی جس کو وہ اپنے خاندان میں تبرک کی طرح تقسیم کرتا پھرتا۔

ایک دن وہ اور میں اسی کے گھر میں پی رہے تھے۔ اس نے میرے چچا تمکین صاحب کے تعلق سے بہت سی اوٹ پٹانگ اور تکلیف دہ باتیں کیں۔ پھر اپنی مردانگی اور مردمی کے وہ وہ جوہر جن کی آب اتر چکی تھی بیان کیے اور حکیم حاذق محمود علی صاحب مرحوم کی عنایات کا ذکر کیا جس کی صراحت ممکن نہیں۔

میں نے اسی وقت طے کر لیا کہ فخر کے ساتھ جب تک دو تین احباب اللہ بھی نہ ہوں۔ جام ٹکرانا دختِ رز کی بے توقیری ہے۔

میری غزل جیسی بھی ہو فخر کی دین ہے۔ جو اس کے گھر سلطانہ کاٹیج سے نوید کے گھر الماس منزل جاتے ہوئے شروع ہوئی تھی اور دو تین شعر ہو گئے تھے۔

گمان و وہم نہیں ہیں مرا یقیں ہیں اب
مرے قدم مرے احساس کی زمیں ہیں اب
میں جام اٹھا کے یہی سوچتا رہا اکثر!
نشہ بھی لے گئے وہ لوگ جو نہیں ہیں اب

میں فخر میاں کی ذات گرامی کا ہر بھی پہلو چھپا چھپا کر رکھتا جیسے وہ ڈھانک کر رکھتے رہے ہیں پھر مجھ سے یہ تصور سرزد کیوں

ر اس کی تفصیل آگے آئے گی اور آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مخلوق خدا کو دھوکا
یتے دیتے آدمی اتنا مشاق ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی دانست میں خدا کو چکمہ دے کر
ی مطمئن رہ سکتا ہے اور اس عمل کو مجھ جیسے حقیر بندوں کے سامنے اپنی ذہانت
ر علم و فضل کا کرشمہ سمجھتا ہے۔

زیب داستان کیلئے تھوڑی بہت مبالغہ آرائی گفتگو کی چاشنی کیلئے
ارا کی جاسکتی ہے لیکن وہ کبھی کبھی ایسی مضحکہ خیز ڈینگیں مارتا کہ سننے والا انگشت
اں رہ جاتا۔ ایسی باتیں گوارا ہوں کہ نہ ہوں دوسروں کا جوں کہ کچھ نقصان
ہیں کرتیں اور کہنے والے کا ہی ایمج بگاڑتی ہیں سو ان باتوں کی کسی کو پرواہ
تھی۔

مجھے ایک بات کا احساس ہمیشہ ہوا کہ میں فخر میاں کے ذہن میں
س درجہ بس گیا ہوں کہ آج وہ اس کے منکر تو ہو سکتے ہیں اور آئندہ کیلئے
ستاط بھی لیکن جب میں اُن کا تھا میری کہی ہوئی باتوں کو وہ ذہن میں محفوظ
کھتے اور کچھ ہی دن بعد اس قدر صفائی سے اپنی بنا کر بڑے اعتماد سے
برے سامنے دہرا دیتے۔

ایک دن کہنے لگے کہ عارف رؤف کسی محفل میں غزل سرا ہیں
ور ان کے کسی قریبی دوست نے اس محفل کا اہتمام کیا ہے۔ رات یوں
زر جاتی ہے اور احساس تک نہیں ہوتا کہ پو کھٹ گئی۔ اصرار کیا کہ میں
ی چلوں۔ یہ ان کی مجھ سے چاہت کے دن تھے۔ میں نے معذرت کر لی۔

کہا کہ اگر چلوں بھی تو گھنٹے سوا گھنٹے میں اٹھ آؤں گا۔

حیرت زدہ ہو گئے کہا "ہاں اُٹھ آنا مگر مجھے یقین ہے کہ تم خود نہیں اٹھ سکو گے"۔

میں نے کہا عارف رؤف کو میں سُن چکا ہوں۔ اُن میں اتنی یکسانیت ہے کہ وہ رات بھر ایک ہی انداز میں ساری غزلیں گا لیتے ہیں۔ تنوع کا فقدان بڑا اجیرن ہو جاتا ہے۔ میرے لئے اُن کی گائیکی گلے میں سُر ہونے کے باوجود آدھے پون گھنٹے میں اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ رؤف بھائی کی بات اور تھی ــــ مسکرا کر باپ کا مکھڑا بنا لینے سے اور آواز کی کشش سے تھوڑا بہت سامعین کو رجھا لینے سے پَو کہاں پھٹ سکتی ہے بھائی۔

کچھ ہی دن بعد موقع نکال کر انھوں نے اپنے چند احباب میں عارف کا ذکر چھیڑا۔ سُننے والوں میں میں بھی تھا۔ من و عن یہی بات میرے اور دوسروں کے سامنے بڑے رکھ رکھاؤ سے دہرا دی کہا ــــ میں تو گھنٹے آدھے گھنٹے سے زیادہ انھیں نہیں بھگت سکتا۔

اس وقت شاذ بے اختیار یاد آ گیا ــ شاذ کی بعض کوتاہیاں اسے عامیانہ پن تک لے جاتی تھیں۔ اپنے بارے میں وہ اس حد تک نرگسیت اور خود پسندی کا شکار تھا کہ اس کی خود آرائی کہاں کہاں سبک ساری کا باعث ہو رہی ہے اس کو تک وہ بھول جاتا تھا۔

ایک رات اُس نے عارف رؤف کی غزل سرائی کا اہتمام کیا۔ قریب ترین

ایسے دوستوں کو بلایا جن کی وفا شعاری اور دوست نوازی پر وہ شبہ نہ کر سکتا تھا۔ یہ سرے سے کوئی محفل ہی نہیں تھی۔ اپنے گھر میں عارف رؤف سے اپنا کلام گوا کر وہ اسے ریکارڈ کر رہا تھا۔ رات ساری اسی طرح گزر گئی۔ شاذ نے مار کر رکھ دیا۔ بڑی ناگواری اس وقت ہوتی تھی۔ جب شاذ اپنی بیاض یا مطبوعہ مجموعہ کلام جس سے عارف غزل گا رہے تھے۔ اپنے ہاتھ میں تھام کر ان کی نظروں کے سامنے لے جاتا کہ عارف کوئی غلطی نہ کر دیں یا غلط پڑھ کر بے سر نہ ہو جائیں۔ یہاں اہمیت عارف رؤف کی نہیں ہے۔ کسی بھی گانے والے کے ساتھ شاذ یہ سب کچھ کر سکتا تھا اگر وہ اس کی غزلیں گا رہا ہو۔

بے چارے فخر میاں کو میں نے کبھی لطیف ساجد کو یاد کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ سٹی کالج سے فرار ہو کر ہم دن دن بھر آصفیہ لائبریری میں گزارتے تھے جو اب اسٹیٹ لائبریری ہے۔ بہت دن بعد اتفاق سے میں اور وہ لائبریری کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ فخر میاں نے فرمایا کہ میں اور میرا ایک دوست کالج چھوڑ کر دن دن بھر یہاں مطالعہ کیا کرتے تھے۔

ایسی باتیں کسی کو تکلیف پہنچانے کا باعث نہیں ہوتیں میاں فخر کے مضحکہ خیز افتخار کو ظاہر کرتی ہیں اور بس۔ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ایک دن میں پوری ایک بوتل وہسکی کے ساتھ سالم ایک ہرن کھا گئے تھے۔ چلئے صاحب تسلیم جوانی دیوانی ہوتی ہے اور مئے کی طرح آپ ہو کہ آہو چشم کا ہوسے رم خوردہ اردو شاعری کی موضوعاتی کشش

کا باعث ہیں۔ انھوں نے پینے کیلئے مئے اور کھانے کے لئے ہرن چُن لیا۔ چناں چہ ایک حلقے میں ان کو احباب ہرن وہسکی صاحب کے نام سے یاد کرتے تھے۔

ایسی باتیں تو ان کی شخصیت کا لازم وملزوم حصہ تھیں۔ تضادات کو یکجا جمع کر کے کسی خاکی پتلے میں جان ڈال سکیں تو فخر میاں سامنے کھڑے ملیں گے۔ ہمدرد اتنے کہ دوست احباب کے بڑے وقت کو اپنے برے وقت سے زیادہ سمجھیں گے۔ دن دیکھیں نہ رات اس کیلئے وہ سب کچھ کریں جو وہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کا مشورہ ایسے میں بے چون و چرا تسلیم کر لینا ضروری ہوتا ہے۔ میں نے اپنے خاندان میں ایسے "بعض" اوصاف والا شخص نہیں دیکھا جو میاں فخر کے لئے مختص ہو گئے تھے۔ برائیوں کو نیکی کا روپ دے دینا پھر نیکی کے بطن سے برائیاں پیدا کر کے کرشمہ دکھانا فخر میاں کے بائیں ہاتھ کا داؤ تھا۔

ایک بار ایک چھوٹی سی محفل میں، ناصر کاظمی، مصطفیٰ زیدی اور شکیب جلالی کی بات چل نکلی تھی دو چار سنجیدہ لوگ تھے جو مزے میں تھے۔ میں نے مغنی تبسم کی شاعری میں احساسِ غم کی نئی جمالیات کی بات چھیڑ دی تھی۔ وہسکی اپنا کام کر رہی تھی ـــ فخر میاں دنیا کا کوئی موضوع ہو اس کے تعلق سے اپنے ذرین خیالات کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔ خاموش رہ کر کچھ سننا اُن کے لئے اس بات کا اعلان تھا جیسے اُن کے کچھ نہ جاننے کا راز

ب پر عیاں ہو گیا ہو۔ چناں چہ ارشاد ہوا کہ۔

"بریانی اور پلاؤ کھانے کے بعد سادہ خشکہ کون کھا سکتا ہے"

"میں نے دریافت کیا، یہ بریانی اور پلاؤ کیا ہے"

کہا ۔۔۔ میر اور غالب۔

جب گفتگو کی ادبی سطح پکوان کے دیگوں کی خوشبو بن گئی تو میں نے
نے کی حضور والا میں میر و غالب کے ماہروں میں نہیں ہوں، کبھی مجھ پر عنایت
ئیے۔ میں نے بھی انھیں شد بد پڑھ رکھا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ حقیقت بھی ہے لیکن میرے کہنے میں لہجے کی کاٹ
رہ شاید فخر میاں کو کھل گئی۔ وہ ناگواری سے خاموش ہو گئے ۔۔۔ اس
یے کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ کاش انھیں اس بات کا اندازہ
تا کہ ۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اس بات کو اتنا عرصہ ہو گیا اور ویسے بھی میرے ذہن میں اس
بار چھ دن رہ جانا ہی شاید ممکن تھا۔ فخر میاں اور اردو شعر و ادب
یا "زبان سے خندق پار" کے مصداق تھا۔

اللہ میاں نے زبان جیسی نعمت جو آنکھوں سے کچھ ہی کم ہو گی عطا
ی ہے تو اس لئے نہیں کہ آدمی دل شکنی کرتا پھرے۔ یہ موذی کبھی منہ میں
صری گھولتی ہے۔ کبھی نطق کے پھول بکھیرتی ہے، کبھی تلوار سے زیادہ گہرے

زخم لگاتی ہے جن کے بھرتے بھرتے عمر تمام ہو جاتی ہے۔ ۳۲ پہرہ داروں اور تالو کی چھت کے نیچے محصور و مقید اس تجربہ کا پر تر سارے حصار توڑ کر نکل پڑتا ہے۔ پھر نیندیں اچاٹ ہوتی ہیں۔ خون خرابے ہوتے ہیں۔ سننے والا صبر و تحمل کا اثاثہ ساتھ لیے لیے پھرتا ہے۔ تو پھر نہ اپنی نیند سوتا ہے نہ اپنی نیند اٹھتا ہے۔ ہائے کیسے کیسے زخم رستے ہیں۔ میں کہتا ہوں اللہ سو گناہ کر ڈالے لیکن اس ایک گناہ سے بچائے۔

مغنی تبسم کے پاس قاضی سلیم ملنے آئے تھے۔ میں تھا، راشد آذر تھے اور انور معظم تھے۔ قاضی سے کئی برس کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ دو لوگ جب بھی حیدرآباد آتے اپنی محبتیں لٹا کر چلے جاتے۔ ٹوٹ کر محبت کرنا ان دونوں سے سیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ ایک قاضی سلیم دوسرے نجم الثاقب شحنہ۔ قاضی سے برسہا برس بعد ملاقات ہوئی تھی۔ ہماری شفقتیں، صحبتیں بزم آرائیاں سب یاد آرہی تھیں۔ شاید سر کے درد کو ہنسی خوشی کے لئے "دردِ سر" بنا لینا، پھر بھی مسکرانا قاضی ہی کا اعجاز تھا۔ ان کی قوتِ برداشت سے ہمدردی ہوتی تھی اور ان پر پیار آتا تھا۔ اس بات کو طے سمجھیے کہ ہماری محفلیں دخترِ رز سے اظہارِ عشق کے بغیر رنگ پر نہیں آتی تھیں۔ اکثر قاضی ہمارے مہمان ہوتے ہوئے بھی میزبان بنے رہتے تھے۔ ساقی گری کی شوم کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ پندرہ سال سے قاضی اور بنتِ عنب کے تعلقات اس قدر کشیدہ تھے کہ معلوم ہوا قاضی نے طلاق

نہیں دی خود بنتِ عنب نے خلع کے لئے اصرار کیا۔ قاضی نہ مانے بات عدالت تک پہنچی۔ اب قاضی کو کسی قاضی القضات کی حاجت تھی۔ یہ "چیف جج" قاضی ہی کے بھانجے ڈاکٹر قمر انصاری کو سونپی گئی اور انہوں نے قاضی کے سسر اور سینے کو مجرم ٹھہرایا اور فیصلہ بنتِ عنب کے موافق کر دیا۔

یہ وہی ڈاکٹر قمر انصاری ہیں جن کے انکسار و خوش خلقی اور ہمدردی کی باتیں زبان زدِ خاص و عام ہو رہی ہیں۔ اپنے ہنر میں اس درجہ یکتا ہیں کہ شاہ فہد کے طبی بورڈ میں شامل کئے گئے۔ شاہ کی والدہ بیمار تھیں تو حیدرآباد سے ان کے علاج کے لئے جدہ پرواز کرتے تھے۔ ڈاکٹر قمر سے ملتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے کہ چلو ایک جوان سال، ڈاکٹر سید عبدالمنان پیدا ہو گیا ہے وہ آج بھی اپنے ماموں قاضی سلیم کے معالج ہیں۔ ایک دن بتا رہے تھے کہ قاضی سلیم کا وزن (۷) پونڈ بڑھ گیا ہے۔

اس دن قاضی نے دو عمدہ نظمیں خاص طور پر "وعید" جس کو اردو شاعری کے کرشمے سے کرشمے انتخاب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

عہدِ حاضر کی سفاکی کے اظہار میں استعاراتی دروبست، شکست خوردہ انسانیت کا المیہ۔ قتل و خون کی ارزانی، بےحسی کے امڈتے بادل، بادلوں سے ہونے والی لہو کی بارش کا جان لیوا تصور۔ ذہن پر، دل پر، سانس پر کمند زیاں کی گرفت۔ ہر سانس میں خوف پھر خوف۔

قاضی سلیم کا فن اظہار کے حسین و جمیل چیدہ پیکروں کی ذوق گری

اور پیچیدہ پیوند کاری کا ہنر ہے۔ ان کی اکثر اچھی نظمیں الگ ہے جب ہم نظم پڑھتے پڑھتے کسی بند کی تکمیل پر ٹھہرتے ہیں تو نظم ہمارے سامنے اپنے معانی کا دفتر لیئے ختم ہو گئی ہے لیکن ان کے احساس کی استقامت اور فن کی صلابت معنوی تہہ داری اور غنائی کشش کو ساتھ لیکر آگے بڑھ جاتی ہے اور نظم کے ختم ہونے تک ایسے دو چار مقام اور آسکتے ہیں اور یہ بند دفتر ورق ورق کھلتا ہے۔ الفاظ میں امیجری کو اس کی دبیز اور گہری تاثیر وسعتوں کے ساتھ سمیٹ سمیٹ لینا قاضی سلیم کا وصف خاص ہے۔ کتنے ہی معروف شعراء جو آزاد اور شعر انظم کے رسیا ہیں ان سے قاضی سلیم کو ممیز کرنے والی اُن کی نظم میں تہہ در تہہ پنہاں گیرائی و تازہ کاری ہے۔ نظم کو میڈیا اور اظہار کی گرفت میں رکھنا۔ مٹھی کھول کر اسرار حیات کو بکھیر دینا پھر چن چن کر نظم کی قبا میں ٹانک دینا قاضی سلیم کی شاعری کو بوجھل اور بے درک ہونے نہیں دیتا۔ نظم شروع ہوتے ہی آپ قاضی کے ہو لیتے ہیں۔ قاضی کی نظم کو کاغذ پر پڑھتے وقت اس کا "نیک و بد" سامنے آتا ہے۔ ورنہ وہ سنانے اتنے اچھے انداز سے ہیں کہ سنانے وقت لفظ لفظ میں ان کے احساس جذبات کی آنچ نظم کے اطراف ایک دودھیلی روشنی سی بکھیرتا ہے اور آنکھیں بعض وقت چندھیا جاتی ہیں۔

میں فی الوقت ان کی نظم "وعید" کے صرف پہلے ایک بند پر اکتفا کروں گا۔ جہاں نظم کو تکمیل کی صورت دے کر آپ آسانی سے

قاری کی نذر کر سکتے ہیں۔ لیکن قاضی سلیم کو اختصار کے پیرائے میں وسعتیں بھر لینے کا ہنر خوب آتا ہے۔ آج کل جو چھوٹی چھوٹی نظموں کا طومار سا چل نکلا ہے۔ انھیں پڑھ کر شاعر کے عجز و بیان کی غمازی کھل کر اجاگر ہوتی ہے۔ چند ہی نظمیں ایسی نکلتی ہیں۔ جو اکہرے پن سے بچ جاتی ہیں۔ قاضی سلیم کے اظہار کی صلابت انھیں اپنے شعر میں ادھورا رہنے سے باز رکھتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شعر میں ادھورا رہنے، بے عیاں رہنے اور بلیغ رہنے میں بڑا فرق ہے۔ اب "وعید" کا یہ پہلا بند دیکھیے۔ کیونکہ اس نظم کے تعلق سے مزید باتیں کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ؎

وقت کی صدا ہے خوف
کس قدر گھنا ہے خوف
لوگ سہم سہم کے
سوکھے ٹھنٹھ پیڑ بن گئے
جسم کی نسوں میں
راڈوں کے تار تن گئے
بے بسی کی بے گناہ آنکھ سے
ایک دوسرے کو گھورتے ہیں
ایک دوسرے سے بولنے کا وقت اب کہاں

••

کیا یہ نظم اپنی معنوی گہرائی کے وصف کے ساتھ مکمل نہیں ہے ــــ لیکن نہیں۔ آگے آگے دیکھیئے قاضی سلیم زندگی کے کتنے اسرار و رموز اپنے شعور کی ربودہ بے باکی کی نذر کرتا ہے۔

قصہ مختصر محفل برخواست ہوئی تو راہ میں "ماں صاحب ٹینک" پر میاں فخر مل گئے۔ پوچھا کہاں سے آرہے ہو۔ قاضی سلیم کا نام سُن کر کہنے لگے۔
"ارے قاضی بہت پینے لگا ہے۔ بی پی کراس نے اپنی جو حالت بنا رکھی ہے ــــ مر جائے گا۔"

میرا منہ فق ہوگیا۔ میں انھیں تکتا رہا۔ میں نے کوشش کی کہ گوش گزار کروں۔ بھائی پندرہ سال سے قاضی سلیم نے ایک قطرہ بھی زبان پر نہیں رکھا۔ لیکن میری گویائی کو ان کی سماعت نے ٹھکرا دیا۔

اُس دن بھی قاضی سلیم سادہ چائے (سلیمانی DECOCTION) سے انتقام لیتے رہے ورنہ منفی تبسم کی نوازشیں میرے ساتھ انھیں بھی شرابور کر سکتی تھیں۔ انور معظم کو "سلیمانی" سے بھی عار سا ہے۔ ان کی شرافتیں ان کے سر چڑھ کر بولتی ہیں۔ اگر دل چڑھ کر بولتا محاورۃً ہو سکتا تو جیلانی بانو ان کے دل و دماغ سے بولتی رہتیں۔

رہ گئی قاضی سے فخر میاں کی بے تکلفی سو میں نے یہ سوچ لیا کہ فخر میاں بزمانہ ملازمت عرصے تک اورنگ آباد میں رہے ہیں۔ قاضی کو بھی ان دنوں "تین پتوں" یا "رمی" کا شوق رہا ہوگا۔ ورنہ کوئی دوسری قدرِ مشترک

تو ہے نہیں۔

ایسی باتیں جو دوسروں کو دکھ پہنچاتی ہیں ان سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیئے جس کی نصیحت آگے چلکر میاں فخر نے مجھے کی ہے۔ اس نصیحت کے تیور بھی دیکھنے کے ہیں کہ والا جناب کا کیسا انکسار رعونت کے سوروپ میں ابھرتا ہے۔

میں گھر گیا ہوں تو اپنے سارے اسلام کے ساتھ جس میں غیبت جیسا بڑا گناہ شامل ہے۔ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے فرمایا۔

"وہ آپ کے دوست کا لونڈا جس کے سبب کتنے ہی مسلم گھرانوں میں "رودم راٹ" اٹھی ہوئی ہے۔

میں نے درمیان میں پوچھا۔

"کس کے بارے میں کہہ رہے ہو"۔

جواب ملا۔

"اجی وہی اوصاف سعید"

جناب والا' اوصاف سعید اور جنت حسین جیسے عہدیدار ہندوستان کا مقدر بن سکیں تو یہ چیونٹی بھر اکیاب۔ پھر سانس لینے لگے۔ میں نے پاسپورٹ آفس کے احاطے میں برقعہ پوش عورتوں کو اوصاف سعید کو دعائیں دیتے سنا ہے۔ بلا تخصیص مذہب و ملت ہندو لڑکیوں اور بوڑھی خواتین کو اوصاف سعید کی تعریف کرتے سنا ہے۔ قطار (QUEUE)

میں کھڑے جواں سال لڑکوں کو شوخی سے یہ کہتے سُنا ہے کہ اب کوئی ماروتی کار ہم سے آگے نہیں جا سکتی۔

"آؤ آؤ مالک کیو میں آجاؤ"

اور ماروتی کار سے اترنے والے مالک سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہوئے سنتریوں سے الجھ کر چپ کے سے کیو میں آگئے۔

اوصاف سعید بے حد دیانتدار، فرض شناس، زود رس، بے ریا اور بے باک عہدہ دار تھے۔ میں اپنے بیٹے مجید اقبال کے دوست عتیق احمد کے کھوئے ہوئے پاسپورٹ کی تجدید کے ضمن میں اُن سے ان کے دفتر میں ملتا رہا ہوں۔ جس دن اُن سے قبل از قبل میں وقت نہیں لے سکا۔ اُس دن اُن سے میرا ملنا کوشش کے باوجود ممکن نہ ہوا۔ اس سے مجھے رنج نہیں خوشی ہوتی تھی کہ ان کی اتنی حفاظت کی جاتی ہے۔ میں دُعا کرتا تھا کہ اللہ ان کی حفاظت کرے۔

اوصاف سعید اسم با مسمّٰی ہیں۔ جس عہدیدار نے پاسپورٹ آفس میں آتے ہی آتے وہاں کے نظم و نسق کی گندگیاں اس طرح دور کیں کہ خود اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ رشوت کھا کر پاسپورٹ کے جعلی کاروبار انجام دینے والی ایسی ٹولی کی ٹولی گرفتار کروادی۔ جس نے غریب نادار اہلِ غرض لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا اور بے غل وغش رشوت کھا کر اہلِ ثروت کے کام نکالتے تھے اور بات یہاں تک آپہنچی تھی کہ پاسپورٹ آفس کے

علاوہ بعض گھروں سے بھی پاسپورٹ اجراء ہونے لگے تھے۔ اس مجرمانہ فعل میں آفس کے عملے کے علاوہ عہدے دار بھی ملوث تھے۔

ہم کو اپنے چھوٹوں کی بھی اگر وہ کردار میں ہم سے بڑے ہیں نہ صرف عزت کرنی چاہیئے، اپنا محاسبہ بھی کرنا چاہیئے کہ ہم بزرگ ہوتے ہوئے بھی ان سے کتنے چھوٹے ہیں۔ گول گول گورے گٹھے اوصاف سعید جب اسکول سے پڑھ کر خاکی نیکر اور سفید شرٹ میں گھر کی سیڑھیاں چڑھتے تھے اور میں عوض سعید کے گھر اس وقت موجود رہتا تو اوصاف سعید کے سر پر ہاتھ پھیر کر لڈو میاں کہا کرتا۔ آج بھی اس لڈو میاں سے پاسپورٹ آفس میں ملتا تھا تو انھیں ہمیشہ تم سے مخاطب کرتا۔ دل میں اوصاف کے اوصاف حمیدہ کی منزلت کے باوجود تم سے مخاطب کرتا۔ میری نیاز کی غمازی نہ کرے بھی تو تحفظ ضرور کرتا تھا۔

آئی اے ایس میں نے بہت دیکھے ہیں۔ وہ بھی جن کی سرکاری ملازمت میں، ماتحتی میں نے کی اور وہ بھی جو میرے ملنے جلنے والوں میں تھے اور ہیں۔ لیکن میں نے راج مولکر، اوصاف سعید اور جنت حسین جیسے آئی اے ایس نہیں دیکھے۔ سعید الدین جیسا نائب تحصیلدار نہیں دیکھا۔ ثناء اللہ جیسا منتظم نہیں دیکھا۔ نارائن راؤ جیسا گرداور مال نہیں نور محمد نور جیسا عہدیدار کمرشیل ٹیکس نہیں دیکھا اور ہاں سعد حسین سعد جیسا آئی اے ایس آفیسر دیکھا اور ایس ایم سعدی جیسا بل کلکٹر نہیں دیکھا۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کی آغوش میں انسانیت پرورش پا سکتی ہے۔ میں کیوں مبارک ہے وہ ماں

جس نے اوصاف سعید جیسا بیٹا پیدا کیا۔

فخر میاں بے نقط سناتے رہے۔ مجھے بہت ناگوار ہوا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چلنے لگا تو پکار کر کہا۔

"کیا چنگا لگ رہا ہے اپنے دوست کے بیٹے کو بولے تو"

میر مزاج اس انداز تکلم کا عادی نہیں۔

میاں فخر نے میر و غالب کو بھی عربی میں پڑھا ہو گا کہیں کہ اردو زبان کو وہ سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان کی منطق میں ہر وہ بات جائز ہے جو ان کی زبان سے نکلے۔

میں تو قاضی سلیم کو یہ مشورہ بھی نہ دے سکا کہ ہرن دہکی سے علاج کریں اور اپنی شاعری کو ارفع بتانے کے لئے میر و غالب کو عربی میں پڑھیں۔

میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ غرور و تکبر کے لباس فاخرہ سے تن ڈھانک لینے کے بعد آدمی روح کا احترام کہاں چھوڑ دیتا ہے وہ اپنے معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ کر سر بہ سجود ہوتا ہے اور سلام پھیر کر مخلوق خدا کو پھر اسی حقارت سے کس طرح دیکھ سکتا ہے۔

غم انسانی فطرت کا وہ سمندر ہے جس میں غوطہ زنی روح کی تطہیر کا باعث بن سکتی ہے اگر سہہ جانے کا ظرف ہو۔ سلطانہ کے بعد میاں فخر کے مزاج کی تاناشاہی سے جب ان کے متعلقین دلبرداشتہ ہو گئے تو میاں فخر کے اقبال بھائی یا متین جانی کے بارے میں ان کا خیال ہوا کہ اس شخص کو

انصاف رسانی کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے جو میاں فخر کے ایوانِ شاہی کی زنجیر ہلانے کی جسارت کر سکتا ہے۔

مجھے ان زخم خوردہ حضرات کی دل گرفتہ باتوں پر شک وشبہ کی گنجائش اس لئے نہیں تھی کہ میں خود میاں جی کی فضیلت کا بارِ گراں اٹھا کر ان کی محفل سے خود کو اٹھائے گیا تھا ـــــ میں نے عرضِ تمنا کے جواز کی فراہمی کے لیئے ضروری سمجھا کہ ان کے دل میں اتنا گداز تو پیدا کر سکوں کہ وہ کسی دکھ کو پوری طرح سننے کے اہل ہو جائیں۔ اللہ نے ان سب کو بچا لیا۔ نام بنام ساری باتیں ان کے سامنے آتیں تو غیض وغضب جوان کے مزاج کا وصف خاص ہو گیا ہے اپنی فضیلت کے تکبر کو ساتھ لیکر نکل پڑتا۔ اور قتل عام ہو جاتا۔ مجھ جیسی گناہوں کی پوٹ پر اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ فخر میاں کی علم و دانش کی زبان و بیان کی صرف و نحو کی املا اور انشاء کی ریل گاڑی دندناتی میرے سینے پر سے گزر گئی اور میرے پرخچے اڑ گئے اور وہ لوگ جو مجھ میں سوار تھے بکھر بکھر کر بال بال محفوظ رہے۔

اب یہاں سے میاں فخرالاسلام کے تفضل کے ابواب بہ انداز دگر انھیں کی تحریر میں وا ہوتے ہیں۔ انہوں نے خود ہی اپنے کردار کی بلندی علم ودانش کی فضیلت، مذہب اسلام کی تعلیمات پر ان کی عالمانہ دسترس، تصوف کے روحانی نکات سے ان کی عملی آگہی کو رقم کیا ہے۔ اور وہ یہ سب کچھ میرے ایک پوسٹ کارڈ کے چند جملوں کے جواب میں ہے جو

جو بارہ پندرہ صفحات پر محیط ہے۔

مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ انھیں بھی میرے چند اور کرم فرماؤں کی طرح اقبال متین کے شعر و ادب میں دخل در معقولات سے شدید حاسدانہ بیر ہے۔

انہوں کی خدمت میں یہ شعر نذر کروں ؎

بے شجر، دھوپ میں تپتا ہوا آنگن ٹھہرا
آج تو میرا قلم ہی مرا دشمن ٹھہرا

پہلے اردو زبان و ادب کی موت کا تعین کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں اور اپنے جنبش قلم کے لئے سفاکانہ دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں کہ میں نے اردو زبان کا کوئی مسئلہ موصوف سے رجوع کیا تھا۔ میں آگے اس کی صراحت کروں گا۔ جو دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ پہلے ارشادات سُن لیجئے۔

"آپ کس اردو زبان کی بات کر رہے ہیں۔ آپ کا اشارہ اس زبان کی طرف تو نہیں جو ہندستان میں ٹکسالی کے روپ میں جنم لی پھر اردو کے نام سے پکاری گئی عنفوانِ شباب کو پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ موت سے ہمکنار ہو گئی۔ نہ اس کی اپنی کوئی انفرادیت ہے اور نہ ہی سرمایہ حتیٰ ایں کہ رسم الخط

بھی مانگے تانگے کا ۔ تقریباً ۷۰ فی صد عربی اور فارسی
کے الفاظ اور بقیہ سنسکرت پر مشتمل ایک ایسا آمیزہ
جس میں سے اگر مستعار لئے ہوئے دوسری مسلم زبانوں
کے الفاظ علیحدہ کر دیئے جائیں، سوائے چند بے معنی
الفاظ کے کچھ نہ رہے۔"

دوسرا ارشاد اپنی عالمانہ بصیرت اور زبان پر دسترس کے بارے
میں ہے ۔ جو ان الفاظ میں ہے ۔

"جہاں تک علم کا معاملہ ہے" مجھکو" زیادہ حصہ مالک
کے کرم سے ورثے میں ملا ہے اور پروردگار کی دین ہے ..
بچپن ہی میں صرف و نحو پر عبور حاصل کیا ہے ۔ میں علم کے
معاملہ میں" مطمعین" (اع بشامل ہیں) ۔" مجھکو" نام و نمود
سے غرض نہیں ۔ اپنے کردار اور علم سے میں اور میرا ضمیر
"مطمعین" ہے ۔ ہر معاملہ میں حرص و" تمع" سے دور ہی رہا
میرے" مطمع نظر" ہمیشہ حال ہی رہا ہے ۔ قال سے بہت
ہی کم سروکار رہا ہے۔"

(میں نے اقتباسات من و عن نقل کئے ہیں اور مدیر محترم
سے ملتجی ہوں کہ بغیر کسی اصلاح کے من و عن نقل کریں ۔)

ایک اور ارشاد ۔

"میں کہانیوں کا آدمی نہیں ہوں بلکہ عملی دنیا کا بشر
ہوں۔۔۔۔۔ وہ نہیں ہوں جس کی ساری عمر قصے
کہانیوں۔ پنڈدوں کے فرسودہ تصانیف کے پڑھنے
میں صرف ہو گئی۔"

میں اسی سلسلے کی دوسری قسط میں مذہب اسلام پر قرآن شریف کو پیش نظر رکھ کر دالا تبار حضرت فخر الاسلام سے ایسے زرین خیالات کی نقول پیش کروں گا جو امتِ رسول کو اپنی نظروں سے گرا کر اپنی بلندیوں کا تعین کرتی ہے۔

فی الوقت اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں کہ آئندہ نیچے لکھے ہوئے الفاظ کا املا اور عبارت میں تذکیر و تانیث کا خیال اور نے کے استعمال پر توجہ دے لیں تو بچپن سے صرف و نحو میں کھلی ہوئی آنکھیں زیادہ روشن اور دور بیں ہو جائیں گی۔

حضرت فخر کے لکھے ہوئے الفاظ	ان الفاظ کا صحیح املا۔ صراحتِ زبان	
وطیرہ	وتیرہ	عربی
گھٹیہ	گھٹیا	اردو۔ ہندی
مطمعٔ نظر	مطمحِ نظر	عربی
علحٰدہ	علیحدہ	عربی
متزکرہ	متذکرہ	عربی
تمع	طمع	عربی

بے نیل ومرام	بے نیل مُرام	عربی
ماٹی کا لعل	ماٹی کا لال	ہندی
بڑھپن	بڑاپن	اردو
بٹہ	بٹا	ہندی
مطمعن	مطمئن	عربی

ایک اور گزارش

نازیبا و گھٹیا ۔ یہاں واو عطف کا استعمال غلط ہے ۔

توقف و جھجک ۔ یہاں بھی واو عطف کا استعمال غیر صحیح ہے توقف عربی کا لفظ ہے جھجک ہندی کا۔

نام نمود ۔ نام و نمود صحیح ہے ۔یہاں واو عطف ضروری ہے ۔

میں اگلے جنم کا قائل نہیں ہوں ورنہ میں بھی بارگاہِ ایزدی میں ورثے میں علم عطا کرنے کی دُعا کرتا کہ یہ لوہے کے چنے مجھے بھی چبے چبائے مل جاتے ۔ آپ کی قسمت پر رشک کرتا ہوں کہ وہ ساری کتابیں جو آپ نے خواب میں بھی نہیں دیکھیں گنجفہ بازی میں گنجفے کا ورق سامنے رکھ کر سطر سطر پڑھ ڈالیں ۔ دیکھئے کیسا حاسد ہے آپ کا متین جانی جس کو آپ کی عنایت و محبت نے اقبال متین بنا کر رسوا کیا اور وہ آج بھی آپ کے اعجاز کا قائل نہیں ۔

(۲)

میں نے باتیں ہماریاں کے پچھلے باب میں ایک لڑکے کی یادوں
کا سہارا لیکر اس کے لڑکپن کی بات چھیڑی تھی۔ پھر یہ لڑکا سیانا ہوا ہمارا
رشتہ دار ہوا، جدہ جاکر دولت کمائی اور پھر از خود رفتہ ہو گیا۔ سوچتا
ہوں کہ وہ جو بچپن سے ہمارے خاندان ہی کا ایک فرد بلا کسی رشتے کے بن
گیا تھا اور رشتہ داروں سے بڑھ کر تھا وہ کوئی اور لڑکا تھا۔ اور یہ جس نے
اپنی گھریلو زندگی میں معاشی حالات کی بہتری کے باعث گھر بیٹھے کوڑیوں کے مول
علم و فضل خرید لیا اور عالم فاضل ہو کر اپنی شناخت کا اعلان نامہ خاندان
بھر کے گھر گھر کی دیواروں پر چسپاں کرتا پھرا، جہاں بھی اس کی رسائی ہو سکتی
تھی؛ یہ کوئی اور ہی شخص ہے۔ اب اس کی عالمانہ فضیلت کے جوہر اپنی خود پسندی
اور پندار کے سہارے اس کے اپنے ددھیال اور ننھیال میں تقسیم ہونے
لگے تو وہ اپنے خاندان کا صائب الرائے شخص سمجھا جانے لگا۔ اس برتری میں
اس کے مزاج کے تلوّن اور اس کی زود رنج سرشت نے اسے بہت سہارا دیا۔
اور حسین میاں نے جب اپنی ددھیال اور ننھیال کو سینت لیا تو جیسے سند یافتہ
تاراج گر ہو بیٹھے۔ اب ان کو اپنی علمیت اور فضیلت کے آگے اپنے سسرالی

یزوں کو جھکانا تھا۔ یہ کاروبارِ تمکنت شاید انھیں مہنگا پڑا۔ اور اس
مہنگا پڑا ہوگا کہ ان کی سسرال کو ورثے میں علم نہیں ملا تھا۔ ورثے
میں تونگری، ورثے میں جاگیرداری، ورثے میں زمین داری، ورثے میں علم کی
برداری ان سب کا یہی حشر ہوتا ہوگا۔ جو حسین میاں اور فخر میاں میں
ن کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ ان کے اپنے خاندانی عزیز، ان کی
نیت سے خائف رہنے لگے اور ان عزیزوں کی نئی نسل نے پیٹھ پیچھے
نیاں اڑانے کو اپنا وتیرہ بنا لیا۔

ایسے حالات میں میری ہی مت ماری گئی تھی جو میں خود زخم خوردہ
نے کے باوجود دوسروں کا دکھ درد شانوں پر لادے بار یاب ہو گیا۔
گٹھریاں زمین پر رکھ کر کھولی بھی نہیں تھیں۔ ابھی تو عرضِ مدعا کے لئے
یاں ہی دیکھ رہا تھا کہ ورثے میں ملے تیوریوں کے بل شکل سے نکلتے ہیں۔
ں چھیڑ چھاڑ نے انھیں اتنا برانگیختہ کر دیا کہ وہ وراثت میں ملی روشنیوں
میری آنکھیں خیرہ کرنے کے درپے ہو گئے۔

میں سوچتا رہ گیا کہ شاید میں ہی وہ اقبال متین نہیں ہوں جس
بھی علامہ فخر سے دوستانہ، رفیقانہ، مربیانہ، بے تکلفانہ تعلقات تھے۔

رمضان کا مہینہ تھا یا ختم ہوا تھا۔ میں نے کارڈ پر لکھا تھا
کارڈ میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے طویل خط میں پوسٹ کارڈ
میرے جملے نقل کئے تھے)

"کیا روزوں میں رمی کھیلی جاسکتی ہے جبکہ رمضان
میں روزے اپنے نفس پر احتساب کیلئے تھے"

پہلے میرے ڈیر (DEAR) لکھ کر مخاطب کرنے پر عالمانہ تحریر کا نمونہ پیش کیا گیا مجھے سمجھایا گیا کہ ڈیر انگریزی کا لفظ ہے۔ میں نے فوراً ڈکشنری دیکھی تو واقعی ڈیر انگریزی کا لفظ نکل آیا۔ موصوف کے انگریزی علم نے بہت متاثر کیا مجھے کیوں کہ اس لفظ کے صحیح استعمال میں اخلاقیات بشر پر روشنی ڈالی گئی تھی اور مجھے غلط استعمال میں ابشریت سے خارج کیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ ایک جگہ complex کا لفظ لکھ کر اس کے معنی توسین میں (احساس) لکھے تھے۔ مجھے صحیح معنی معلوم تھے اس لئے میں نے ڈکشنری نہیں دیکھی۔ پھر نفسِ مضمون پر یوں خاصہ فرمائی کی گئی تھی کہ مجھ جیسے بے علم و بے عمل کے لئے اس کا سمجھنا مشکل تھا۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"روزہ سفیدی سحر کے نمودار ہونے سے قبل سے آفتاب
کے غروب ہونے کے بعد تک، ترکِ غذا۔ امساک
طعام و شربت و مباشرت کا نام نہیں ہے۔ یہ جو
روزہ عوام الناس رکھتے ہیں مجازی روزہ کہلاتا
ہے حقیقی روزہ تو کچھ اور ہی چیز ہے۔ سرکار دو عالم صلعم
کا ارشاد ہے۔ اس کے بعد جو عربی لکھی گئی ہے اس کے معنی مولوی ثناء اللہ صاحب نے یہ بتلائے (۱) روزہ کا رکھنا چھانٹ سے ہے (حدیث)

(۲) اللہ تعالیٰ نے کہا (قرآن کی آیت کا جز) (۳) بے شک میں نے روزہ رکھا۔ رحمٰن کے لئے۔ عربی کے اس مفہوم کو ذہن میں رکھ کر۔ مولانا فخر کی عالمانہ توضیحات

ملاحظہ ہوں۔

یہی حقیقی روزہ ہے جس کی ابتداء اللہ تبارک تعالیٰ سے ہوتی ہے اور آخر بھی اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ اسکی تشریح و توضیح مناسب نہیں سمجھتا کہ اسکا سمجھانا میرے لئے اور سمجھنا آپ کیلئے مشکل ہے۔ کسی عالم دین سے اسکی تشریح اگر خواہش ہو تو حاصل فرمالیجیے یا پھر بخاری شریف کا مطالعہ فرمائیے۔ وہ بھی کسی رہبر کامل و عالم کی موجودگی میں جس کو ماہیت روزہ اور اقسام روزہ کا علم میسر نہ ہو وہ اس خصوص میں کیا کہہ سکتا ہے۔ نفس کیا ہے اس کو سمجھنا اور پہچاننا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے۔

"جس نے اپنے نفس کو پہچانا وہی اپنے رب کو جانا"

...... "روزہ حقیقی میں روزہ دار کا ہر فعل فاعل حقیقی کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اس میں قبیح و غیر قبیح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ....

یہ حکمت کی باتیں قرآن و حدیث کی ہیں، قصے کہانیوں
کی نہیں"۔

مولانا فخر نے غور فرمایا ہوتا کہ اس ساری فلسفہ طرازی میں میرے معمولی سے سوال کا جواب کہاں پوشیدہ ہے۔ یہ پنہاں پنہاں قریب آسا اظہار کا برگزیدہ انداز تو اسی درجے اور اسی پائے کے عالم و فاضل کے پلے پڑ تا ہے جو میاں فخر الاسلام کے مقابل آسکے۔ مجھ جیسا کم علم اور گناہ گار تو یہ بھی سمجھ کر بغلیں بجا سکتا ہے کہ مجازی روزے میں جوا نہیں کھیلا جا سکتا اور حقیقی روزے میں کھیلا جا سکتا ہے۔ "روزہ مجازی" جو عوام الناس رکھتے ہیں اور سارا عالم اسلام شاید ایسے ہی عوام الناس میں آتا ہوگا۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ حقیقی روزہ جو میاں فخر الاسلام رکھتے ہیں وہ تو بقول موصوف کے کچھ اور ہی چیز ہے۔

یہ ان کا کرم ہے کہ مجھ فرسودہ قصے کہانیوں کے آدمی کو "بخاری شریف" کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ یہ نہیں لکھا کہ کونسی "بخاری شریف" جو امام المحدثین حضرت علامہ شیخ محمد بن اسمٰعیل بخاری کی مرتبہ ہے۔ میرا کیا حشر ہوتا کہ اگر وہ مجھے مشورہ دیتے کہ حضرت اسمٰعیل بخاریؒ کی ان تصانیف سے استفادہ کروں "مثلاً جامع کبیر، سند کبیر، تفسیر کبیر، کتاب الاشربۃ، کتاب المبسوط، اسامی صحابہ، کتاب العلل وغیرہ۔ تو میں ان کی فراست و آگہی کا کیا بگاڑ لیتا۔ اس لئے کہ یہ ایسی تصانیف ہیں جو صرف

بیان میں آئیں مگر جن کو دیکھا نہیں گیا"۔

تجرید صحیح بخاری شریف صفحہ نمبر (۱۱)

میں حضرت فخر الاسلام سے گذارش کروں کہ کیا موصوف نے مجھے اسی بخاری شریف کے مطالعہ کے مشورے سے نوازا ہے۔ جس کے بارے میں ابو زید مروزی رح بیان کرتے ہیں۔

"ایک دن حرم مکّہ میں سو رہا تھا کہ خواب میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے دیکھا کہ حضور انور مجھ سے فرما رہے ہیں کہ تو امام شافعی کی کتاب کو کب تک پڑھے گا۔ ہماری کتاب کو کیوں نہیں پڑھتا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ حضور انور کی کتاب کونسی ہے۔ حضور نے فرمایا۔ صحیح بخاری جو محمد بن اسمٰعیل بخاری نے تالیف کی ہے"۔

"امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ تین لاکھ حدیثوں کا حافظ ہوں۔ تین لاکھ میں سے ایک لاکھ حدیثیں صحیح ہیں اور دو لاکھ غیر صحیح ہیں"۔

اور پھر یہ وہی صحیح بخاری شریف ہے جس کے مرتب کے بارے میں بکر ابن منیر بیان کرتے ہیں کہ۔

"ایک دن امام بخاری رح نماز ادا کر رہے تھے" بھڑ

نے نماز کی حالت میں آپ کے جسم میں سترہ مقام پر
کاٹا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے لوگوں سے
فرمایا کہ دیکھو نماز میں مجھے کس چیز نے تکلیف دی ہے۔
دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ بھیڑ نے آپ کے جسم میں
سترہ جگہ کاٹا ہے اور جسم سوج گیا ہے' لیکن
نماز کی حالت میں امام صاحب کو جس طرح نماز
ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح آپ نے اس کو پورا
کیا۔" (تجرید بخاری صفحہ ۹)

حضرت بخاری کی اس فضیلت و عظمت کے اعتراف کے
بعد میں حضرت علامہ فخر سے گزارش کرنے کی جسارت کروں کہ تجرید بخاری
شریف جلد اول میں روزے کا بیان صفحہ ۱۴۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۵۴ تک
ہے۔ ان چھ صفحات میں حضرت نبی کریم صلعم کی (۴۸) احادیث یعنی ان کے
اقوال و ارشادات ہیں۔ یہ تمام تر روزے کے بارے میں ہیں۔ اور جتنی برگزیدہ
ہستیوں سے ان کا ذکر منسوب ہے ان کی صحت پر شک و شبہ کی کوئی گنجائش
ہی نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت امام بخاریؒ نے بہت چھان پھٹک کے بعد
ایک ایک حدیث کو بخاری شریف میں شامل کیا ہے۔ کسی ایسے
روزۂ حقیقی کا ذکر سرے سے ہے ہی نہیں۔ جس کی صراحت مولانا فخر
نے فرمائی ہے۔ سب کی سب ایسے ہی روزوں کی باتیں ہیں جنہیں علامہ فخر

روزۂ مجازی گردانتے ہیں جنھیں عوام الناس رکھتے ہیں۔ مجھ جیسے ہیچ مداں کے لیے بخاری شریف کے مطالعہ کی تجویز کرنا مولانا محترم فخر کے اوٹ پٹانگ دعوؤں کا بھرم رہ جائے اور حوالہ دینے سے گریز کرنا کہ اپنے بیان کی تکذیب سامنے نہ آئے ان کے فضائلِ علم کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ لیکن مجھ بے حیثیت کی ان کی تکریم سے گزارش ہے کہ کم از کم دینی مسائل میں جھوٹی شان اور ہٹ دھرمی سے گریز ان کی عقوبت کے لئے بہتر ہے۔ تمتعاتِ دنیوی تو آج بھی اسی باری تعالیٰ کے رحم و کرم سے حاصل ہیں۔ جن کی واضح تعلیمات میں فسق و فجور کو شامل کر کے وہ بندگانِ خدا کو گمراہ کر رہے ہیں۔ آدمی اپنے ضمیر کو احتساب کا حق دے تو تکبر بھی انکسار سیکھ سکتا ہے۔

اب اگر والا تبار اوپر دیئے گئے عربی کے مفہوم کو کسی حقیقی روزے کی حمایت سمجھتے ہیں تو اپنے خط کی طباعت کے اخراجات اٹھانے تیار ہو جائیں کسی معتبر شخصیت کے مواجہ میں جس کا اعتبار والا تبار کو بھی ہو خط طبع کرالیں۔ اس کے بعد وہ جس مسجد کا منبر چاہیں میں فراہم کرنے کی سعادت حاصل کر دوں اور حیدرآباد کی جتنی برگزیدہ مذہبی علوم کی فاضل ہستیاں ہیں جو فقہ اور تصوف سے آگہی رکھتی ہوں انھیں بصد التماس زیر منبر جمع کرلوں۔ اس کے بعد مولوی فخر میاں (گدی ملکاپوری) کے ارشادات سے وہ سب بھی استفادہ حاصل کریں اور یہ کم تر و بدتر بھی جس کو مولانا نے اپنے صحیفۂ فضائل میں بڑے بڑے خطابات سے نوازا ہے۔

کیوں کہ یہ بیچ مدان تو حقیقی روزے کی تعریف صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ
ایسا روزہ، جو موصوف کے مجازی روزوں کی ساری پابندیوں کے علاوہ اپنے
کانوں کو غیبت سے اور جھوٹ سننے سے بچا سکے۔
زبان کو جھوٹ بولنے اور غیبت کرنے سے بچا سکے۔
آنکھوں کو حسن کے اس پرتو سے بھی بچا سکے جو جذبات کو برانگیختہ
کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ شاید حقیقی روزہ کہلاتا ہے جس سے موصوف کی
زبان میں جو "مجازی" روزے ہیں ان کی اہمیت سے روگردانی ممکن نہیں۔

بہار شریعت حصہ پنجم مولفہ جناب مولانا حکیم ابوالعلا محمد امجد علی اعظمی میں
روزے کا بیان صفحہ ۶۳ تا صفحہ ۷۴ یعنی گیارہ صفحات پر محیط ہے ان میں (۳۷)
احادیث منقول ہیں۔ جناب کے بتلائے ہوئے روزے کی کہیں توضیح نہیں
ہے صفحہ ۶۹ پر علامہ موصوف گدی ملکاپوری کو روزوں کے ان تین مدارج کا علم
ہو سکتا ہے لکھا ہے۔ "روزے کے تین درجے ہیں۔ ایک عام لوگوں کا روزہ کہ
یہی پیٹ اور شرم گاہ کو کھانے پینے اور جماع سے روکنا۔ دوسرا خواص کا روزہ
کہ ان کے علاوہ کان، آنکھ، زبان، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء کو گناہ سے
باز رکھنا۔ تیسرا خاص الخاص کا جمیع، سوا اللہ سے اپنے کو بالکلیہ جدا کر کے
صرف اس کی طرف متوجہ رہنا۔ (جوہرہ نیرہ)

"غالباً حضرت گدی ملکاپوری اسی خاص الخاص روزے
کو فقہ اور تصوف کی عالمانہ موشگافیوں کا رہین منت

جان کر اپنی شخصیت کی پردہ پوشی کا پیراہن تار تار بنائے
ہوئے ہیں - اور انشاء ان پر رحم فرمائے جو ان تعلیمات
کی زد میں آ رہے ہیں"
میں نے علامہ موصوف سے اردو زبان کا کوئی مسئلہ رجوع نہیں کیا -
یہ اپنی جگہ نہ صرف دروغ گوئی کی حد ہے خود کو فوقیت دینے کا عامیانہ
طریقہ بھی - بھلا ہندوستان اور پاکستان میں کوئی ایسی شخصیت نہیں رہ
گئی تھی جو میں زبان و ادب کے لئے " ادیب شہیر حضرت فخر گڈی ملکاپوری "
سے رجوع ہوتا -

نواب محمد علی خاں میرے اور علامہ موصوف کے عزیز دوست ہیں.
علامہ موصوف سے ان کا سمدھیانا بھی ہے تعلیم شد بارہے لیکن بے حد
مرنجاں مرنج 'جانِ محفل' دوست باش اور قہقہہ نواز آدمی ہیں . . .
بالو جانی، شوکت مرحوم، نواب، علامہ موصوف اور راقم الحروف کی جب
بھی نشستیں ہوتیں وہ محفل کی خوشی بنے رہتے - وھسکی سے یارانہ نہیں
نبھا سکے - طوعاً و کرہاً کٹوری سے دوستوں کے اصرار پر پی لیتے - کم رو آدمی
ہیں لیکن اندر کا حسن ان کی شخصیت کو اس درجہ پرکشش بنائے ہوئے
ہے کہ ان کے بغیر محفل سونی سونی لگتی ہے - میں نے فخر میاں کو ان کے
اقبال بھائی یا متین جانی کے رشتے سے لکھا تھا کہ -
" اردو لکھنا نہیں آتا ہے تو نواب سے جواب لکھوا دو -

اس جملے میں جو مزاح کی چاشنی تھی وہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔
پہلے بھی اس جملے سے ہم لطف اٹھا چکے تھے لیکن آسمانی سلطانی شاید اسی طرح وارد ہوتی ہے۔ میرے شان گمان میں بھی نہ تھا کہ میاں فخر کی ذات کے خول میں کوئی اقبال متین جنم لے چکا ہے اور وہ اپنی ذات میں میر و غالب کی کھرچن اور مسلم و بخاری کی تہ دیغن بن کر فخر الاسلام ہو بیٹھے ہیں۔

چنانچہ اردو زبان کے بارے میں حکیمانہ موشگافیوں سے پہلے صنف افسانہ اور ناچیز کی افسانہ نگاری پر لعن طعن کی پھر اردو زبان کے تعلق سے اس کی اصلیت پر روشنی ڈال کر ششدر کر دیا۔ یہ سب کچھ آپ مضمون کے پچھلے باب میرے باب میں پڑھ چکے ہیں۔

میاں فخر اتنے بھولے نہیں ہیں کہ اُس جملے میں چھپے ہوئے مزاح کو انھوں نے نہیں سمجھا جبکہ خاندان کا ہر فرد اور خود نواب اپنی پولیس کی وردی میں چھپی " زبان دبیان " دشنام وکلام " اور لوح وقلم " کو تصور میں لا کر ثانئے بھر میں قہقہے کی بتیسی دکھا سکتا ہے لیکن انھیں تو اپنے تبحّر علم اور طباعی کا دمامہ پیٹنا تھا سو بات کا بتنگڑ بنا کر بیٹھ لیا اور بزعم خود ٹانگوں میں بدے باندھ کر اپنا قد اونچا کر لیا اور قد آور سراسا کی طرح دونوں ہاتھ پھیلا کر نیئے آنگن میں کھڑے ہو گئے۔ ایک ہاتھ میں شعر و ادب، ایک ہاتھ میں حدیث و فقہ اور مطمئن ہو گئے کہ ایک چٹ بھیئے کا ہم نے پڑا کر کے رکھ دیا۔

دل اس طرح نہیں توڑے جاتے۔ یہ سلطنتیں جہاں جہاں تاراج ہوتی ہیں۔ وہاں وہاں سائنس کی آمد و شد ان کی نیو ڈالتی ہے۔ لیکن فرعونیت اپنے احتساب سے منکر ہے۔

دوسرے ارشادات کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے چند معمولی باتوں کی طرف توجہ دلاتا چلوں۔

جناب تحر کے لکھے ہوئے الفاظ		صحیح املا اور صحیح نگارش
"ہونیسے"	(ہونے اور سے دو جدا لفظ)	"ہونے سے"
"جسکی"		"جس کی"
"ابتداء"	(غلط املا)	"ابتدا"
"اسکی"		"اس کی"
"اسکا"		"اس کا"
"لئے"	(غلط املا)	"لیے"
"لیجئے"	(غلط املا)	"لیجیے"
سفیدیٔ سحر	(غلط املا)	"سفیدیِ سحر"

میں نے تحر میاں کو از راہِ تفننِ طبع لکھا تھا اور اسی کھردے سے لکھا تھا کہ یہ بات بھی ان کے لیے نئی نہ تھی اور نوشت و نقل کی محفلوں میں ہم نے کئی بار ان کو چھیڑا تھا۔ یہ چھیڑ چھاڑ صرف اس لیے رہتی تھی کہ ان کی راج ہٹ کا مزہ اٹھائیں۔ بیتے وقت ایک بار انھوں

نے کہا تھا کہ قرآن شریف میں کہیں بھی شراب کے حرام ہونے کا ذکر نہیں ہے
میں نے بہتیرا سمجھایا کہ بھائی گناہ کرو تو کیا ضروری ہے کہ اس کو نیکی بنا لینے
کا جواز بھی فراہم کرو اور وہ بھی قرآن شریف کو درمیان میں لا کر۔
فخر میاں) کہہ چکے تھے اور بس یہی قولِ فیصل تھا "یہی حرفِ آخر۔
اب وہ کسی کو خاطر میں لاتے ہی نہ تھے۔

ایک دن میں نے کہا' دیکھو فخر' حافظ کے اس شعر سے تم چاہو تو اپنی
اصلاح کر سکتے ہو۔ یہ نشست بادجانی کے بنگلے کے گھر پر ہوئی تھی جو معظم جاہی
مارکیٹ میں واقع ہے اور این ٹی آر ہماری خوش نصیبی سے ان دنوں اپوزیشن
میں تھے۔ ایسے بُرے دن نہ تھے جو ان کے دورِ حکومت میں ظلم بن کر ہم جیسے
رندوں پر ٹوٹے ہیں۔

میں نے بہ اصرار حافظ کا شعر گوش گزار کیا ۔؎

پیالہ گیر کہ مئے را حلال می گویند
حدیث گرچہ غریب است' راویاں ثقہ اند

کیا سمجھے کیا نہ سمجھے اس کا علم مجھے نہیں ۔ نہ آہ کی نہ واہ ۔ خود مجھے
زبان کھولنی پڑی کہ پہلا مصرعہ ان کو مزید گمراہ کر دے گا۔

میں نے کہا کہ حافظ نے بھی یہ بات مان لی ہے کہ شراب حلال
نہیں ہے کیوں کہ دوسرے مصرعے میں انھوں نے شاعرانہ تعلّی کے بعد کہ راویاں
ثقہ اند کہہ کر حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

ان پر کسی بات کا کبھی اثر نہیں ہوا۔ کئی بار ان کے جانی دوست محمد علی خاں نے دبا دبا احتجاج کیا اور ہر بار میاں فخر نے ان کو جاہل کہہ کر خاموش کر دیا۔ نواب بے چارا قطرہ زبان پر رکھے بغیر ہنسنے ہنسانے کے سامان فراہم کرتا رہتا۔ نُقل کے طور پر تلن کرتا۔ پسی ہوئی کالی مرچ نہ ہو تو پیس کر دیتا لیکن لیکن فخر میاں کے اس فتوے کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ لیمو کاٹتے کاٹتے گرگوشت پر نچوڑتے ہوئے بڑبڑاتا "قرآن شریف کو جاگیر بنا لیا ہے" فخر میاں کی عالمانہ فوقیت کا اس نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ دوستوں میں سب ہی کا منظورِ نظر فخر میاں سے علانیہ ڈرتا تھا۔ ہم بھی تو انھیں برداشت کرتے تھے۔

چنانچہ اس پوسٹ کارڈ میں انھیں میں نے لکھا۔

"تم تو قرآن سے شراب کو جائز ٹھہرانے کے درپے ہو"

جواب میں مجھ پر لعن طعن کرتے ہوئے انھوں نے اپنے اس ارشاد کو دروغ گوئی کی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ اور اپنی علمی فضیلت کو یادہ گوئی کا مرکبِ تازی بنا کر اس پر سواری کی ہے۔

دُکھ اس بات کا نہیں کہ میاں فخر الاسلام نے مجھ سوء بے وقعت کو اپنی اوقات بتا دی۔ میری ضلالت کو آئینہ دکھایا کہ میں اپنے معبود کے آگے گڑگڑانے کا حق بھی نہیں رکھتا۔ شعر و ادب میں میری حیثیت کا تعین کیا۔ مجھے اپنی اس زبان کی علمی اور تخلیقی بے بضاعتی سے روشناس کیا۔ جس پر بڑا ناز تھا مجھے۔ میر و غالب کی بریانی اور پلاؤ دکھا کر

انھیں کی رکابیوں میں اتنا بڑا سوراخ کر دیا کہ اب پانی کا ایک قطرہ ایک ثانیے کے لئے بھی ان میں نہیں ٹھہر سکتا کیوں کہ اردو زبان ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

دکھ اس بات کا بھی نہیں کہ اپنے تبحرِ علم، احتساب نفس، نصِ قرآنی کے بارے میں بزعم خود ناقابل تردید معلومات، اپنے صادق الاعتقاد ہونے کے دعوے۔ اپنی صاعقہ بار صفت ممدوح کی تشہیر۔ یہ سب انھوں نے اپنے نفسِ امارہ پر کڑے احتساب کے طور پر اپنی دانست میں روا رکھی ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں خال خال ملتے ہیں ـــــ پھر دکھ کس بات کا ہے۔

دکھ صرف اور صرف اس بات کا ہے کہ وہ اپنے اعمال "غیر قبیح" کے اعلان نامے میں قرآن شریف اور یہاں تک کہ سرکار صلعم کو بھی بزعم خود اپنے فسق و فجور کے ناقابل تردید برتری کا پرچار کرنے والوں کی طرح (نعوذ باللہ) شامل رکھنے کی جسارت کرتے ہیں۔

دوسرا دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ میں نے ان کی شخصیت کو اہمیت دی اور یہ اہمیت نہ چاہنے کے باوجود اس لئے دینی پڑی کہ اس تماشں کے خود ساختہ عالموں کو کچھ نہ کچھ راستہ تو نظر آنا چاہیئے جن کی آنکھیں اپنے ہی زائیدہ اور ناندہ علم کی روشنی سے اس حد تک خیرہ ہو گئی ہیں کہ وہ مخلوق خدا کو گم راہ کرنے کے لئے اپنی فوقیت کا علم اٹھائے گلی کوچوں میں پھرتے ہیں جہاں جہاں ان کے متعلقین کے گھر میں اور جہاں جہاں ان کی

شنوائی ممکن ہے۔

اب اس بلاغت پر غور کیجئے۔ میرے پوسٹ کارڈ میں درج اس ایک متذکرہ و محولہ جملے کے بارے میں تحریراً ارشاد فرماتے ہیں۔

"فی الواقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی اور میں نے نادانی سے ایسے شخص کے آگے قرآن کی بات کہہ دی جس کی ساری عمر قصے کہانیوں۔ بندوں کی فرسودہ تصانیف کے پڑھنے میں صرف ہو گئی جس کو اللہ اور اس کے رسولِ پاکؐ کے کلام کو پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی .... شراب شرب سے مشتق ہے۔ اس کے معنی پینے کی چیز کے ہیں۔ اس کا تعلق نشہ اور نشئے سے نہیں ہے بلکہ اس کے معنے شربت کے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں شراب کو حرام نہیں کہا گیا ہے بلکہ نشہ کی ممانعت کی گئی ہے۔ اپنی اپنی سمجھ کا قصور ہے"۔

بس مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ اپنے عمل قبیح کو شرع بنا کر پیش کرنا بہترین قسم کی خود فریبی تو ہے ہی، مخلوق خدا کو گمراہ کرنے اور پھر قرآن اور سرکارِ صلعم کا اسم مبارک کا نام لے کر اپنی یاوہ گوئی کو تقویت پہنچانے سے بھی اگر گریز نہیں کیا جا سکتا تو اس سے بڑھ کر منافقت کیا ہو سکتی ہے۔ اس سے بڑھ کر گناہ کیا ہے۔

والا تبار سے میں صرف اتنا عرض کروں کہ میں نے کبھی ہرن دہسکی کا مزہ نہیں چکھا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں تھا - میں کبھی بھی ایک بوتل دہسکی پی کر ایک ہرن نہیں چٹ کر سکتا - یہ بھی حضرت ہی کا اعجاز ہے - شاید اس لیے بھی کہ وہ شراب کو شربت سمجھ کر پیتے ہیں - رہ گیا ہرن سو وہ آہو ئے حرم ہو سکتا ہے -

دوسری گزارش یہ کروں کہ "شراب" اپنی مادری زبان اردو کا لفظ نہیں ہے جیسا کہ خود آپ نے فرمایا - اس ادنیٰ زبان کا لفظ نہیں ہے جو آپ کی دانست اور منطق میں سرے سے زبان ہے ہی نہیں اور جو ابھی جوان بھی نہیں ہوئی تھی کہ مر گئی - یہ تو خالص عربی کا لفظ ہے - اس زبان کا لفظ ہے جس کی بلاغت سے انکار ممکن نہیں - اسی زبان کا لفظ ہے جس میں قرآن حکیم کا سرکار محمد صلعم پر نزول ہوا تھا -

(ان جملات میں سرکار صلعم کا نام لیتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں - اس وقت مجھ پر جو بھی گزر رہی ہے اس کا علم اللہ کو ہے)

میں اتنا گناہ گار ہوں کہ ایسی باتیں مجھے نہیں جچتیں - زیب نہیں دیتیں اس کے باوجود میاں فخر الاسلام سے ایک گزارش کروں کہ وہ اپنی نیکیوں کے پرچار کے لئے بہتر ہے کہ پہلے دنیا بھر کے مطبوعہ لغات خرید لیں - جب ان کی ملکیت ہو جائیں تب مٹی کا تیل چھڑک کر جلا دیں - جب جل کر راکھ ہو جائیں اس وقت ڈھول بجا کر ناچتے ہوئے ہر ایک کو سنائیں -

" شراب کے معنی شربت "
" شراب کے معنی شربت "
سنو دوستو شراب بلا شبہ عربی کا لفظ ہے لیکن اس کے معنی شربت
کے ہیں۔
" شراب کے معنی شربت "
اور سنو دوستو۔ شرابِ دو آتشہ۔ شراب ناب، شراب ارغوانی۔
شراب طہور۔ یہ سب جدہ میں بنائے ہوئے شربتوں کے نام ہیں۔ کیونکہ میں نے
جدہ میں ملازمت کی تھی اس لئے مجھے عربی میں مہارت وہیں حاصل ہو گئی تھی
چنانچہ میں جب کبھی دوستوں کی محفلوں میں شراب پیتا رہا ہوں اس کو کبھی
شراب نہیں سمجھا۔ ہمیشہ شربت ہی سمجھا ہے۔ یہ تصوف کی کونسی ارفع منزل
ہے یہ میں ہی جانتا ہوں۔

بہ بانگ دہل اِس ارشاد کے بعد مولانا موصوف ذرا سا اپنی بلندیوں
سے اتریں اور "سورۃ المائدہ" (قرآن مجید) (کنز الایمان" صفحہ نمبر (۱۷۸) اگر وہ رو
سکتے ہیں تو رو رو کر پڑھیں کہ اس غبار کے چھٹنے سے صحیح راستہ نہ سہی اس
کی لکیر ہی علامہ موصوف کے علم کو کچھ انکا ادبھی سکھلا سکے۔
" ترجمہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی" مولانا گدی ملکاپوری یہ
جانتے ہوں گے کہ احمد رضا خاں بریلوی کی اسلام کی تعلیمات اور علوم دینیہ،
حدیث، فقہ و تصوف میں اپنی صدی کی سب سے بڑی شخصیت تھی۔

میں بہت دلچسپ باتیں علامہ کوثر نیازی کی وساطت سے حضرت احمد رضا خاں بریلوی کے تعلق سے یہاں چھیڑ سکتا ہوں جس کا محل بھی ہے لیکن کیا کروں کہ طوالت مانع ہے۔ فی الوقت مولانا گدی ملکاپوری، احمد رضا خاں صاحب کے اس ترجمہ پر اکتفا کریں۔ جو قرآن شریف کی سورہ المائدہ کا ہے۔

"اے ایمان والو شراب اور جوا اور بت پانسے
ناپاک ہی ہیں۔ شیطانی کام - تو ان سے بچتے رہنا
کہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان یہی چاہتا ہے کہ تم میں
بیر اور دشمنی ڈلوادے شراب اور جوئے میں اور تمہیں
اللہ کی یاد اور نماز سے روکے"

اس پوسٹ کارڈ میں کہیں بھی میں نے مولانا موصوف حضرت فخر کی ذات پر حملہ نہیں کیا ہے۔ ان کے میرے اور نواب محمد علی خاں کے تعلقات کی بنیاد پر چھیڑ چھاڑ کی تھی کہ پہلے ہنسنے بولنے کا ماحول بنا لوں تو پھر سلطانہ مرحوم کے غم کا سہارا لیکر فخر میاں کو آمادہ کر سکوں کہ وہ ان ساری باتوں سے احتراز کریں جو ان کے دوست احباب سے لیکر افرادِ خاندان کے لیے دل آزاری کا باعث بن رہی ہیں۔

میں نے ابھی لب کشائی نہیں کی تھی - میں نے ابھی کسی کا کہا اُن کے گوش گزار کرنے کی جسارت نہیں کی تھی کہ وہ میری ان باتوں سے برانگیختہ ہوکر آپے سے باہر ہو گئے - ان میں کتنا جھوٹ شامل تھا کتنا سچ،

کتنی بدنفسی شامل تھی۔ کتنا مزاح اور پھر جب انھوں نے کچھ کیا ہی نہیں تو پھر اپنی ذاتیات کو ان باتوں کا عنوان کیوں بنا لیا، اس کا انکشاف وہی کر سکتے ہیں۔

میں نے توسین میں جہاں جہاں ان کے اقتباسات دیے ہیں من وعن نقل کیے ہیں اور اصل بہت جتن سے اٹھا رکھا ہے کہ کل اس کی موصوف کو ضرورت پڑے اور اشاعت و ترویج کا خیال آئے تو خدا کے ان بندوں کا بھلا ہوگا جن کی دل آزاری کے بعد بھی میاں فخر ٹس سے مس نہیں ہوتے اس لیے کہ ان کو "فرہنگِ صوفیہ" میں اس کے کوئی حقیقی یا مرادی معنی نہیں ملتے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ ان کے اس صحیفۂ اسرار و رموز کو اتنی اہمیت نہ دوں اور ذہن سے نکال پھینکوں کیوں کہ اس میں دل آزاری نہ کرنے کے ادعا کے ساتھ دل شکنی کا کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا گیا۔ اور یوں بھی میاں فخر الاسلام کی ایسی ہستی ہرگز نہیں ہے جس کو کسی طرح اہمیت دی جائے لیکن حیف کہ مدت مدید کے بعد بھی ان کو اپنے کیے کا کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ وہی خصلت زبان اور رعونت بیدار کی کارفرمائی آج تک روا ہے۔

حافظ کا شعر بھی شاید طبع نازک پر گراں گزرا ہو۔ شعر و ادب کے ہر موضوع سے ان کو اللہ واسطے کا بیر ہے۔ اور وہ اس لیے ہے کہ ان کا پول کھل جاتا ہے۔ شعر خواہ کسی کا ہو شاید انھیں ایسا لگتا ہے جیسے ان کی ذاتیات پر حملہ کیا جا رہا ہے ورنہ مجھ ہیچ مدان سے بیر رکھنے میں انھیں کیا ملتا تھا۔ میں نے کبھی اپنی مہمل شاعری کا ایک مصرعہ بھی ان کے گوش گزار

نہیں کیا۔ اپنے افسانے کی ایک سطر تو دور رہی عنوان کا ذکر تک کبھی نہیں کیا۔ میرے قریب ترین شاعر و ادیب دوست احباب جانتے ہیں کہ میں اپنے بارے میں کبھی بھی بات نہیں کرتا ہوں۔

مولانا فخر پہلے ہی اردو زبان کے عنفوانِ شباب میں مرنے کے بعد بھی انھوں نے میر و غالب کو زندہ دکھ لیا۔ کس زبان میں زندہ رکھا ہے وہ مجھے نہیں معلوم لیکن اپنی اس دیوانگی کو کیا کروں کہ ان کی مرضی کے خلاف آج تک اوٹ پٹانگ لکھے جاتا ہوں ــــ کسی بھی ماہر لسانیات کو یہ بات شاق تو گزر سکتی ہے نا، سو گزری ہو گی۔

ان کے لیے ان کی ذاتی و صفاتی خوشی کے لیے ایک بات بتا تا چلوں میں اردو کے ان ادیبوں اور شاعروں میں ہوں جن پر نہیں کے برابر دو لفظ لکھے گئے ہوں گے۔ کبھی کسی سے خواہش نہیں کی کہ وہ مجھ پر یا میرے فن پر خاص قربانی کرے۔ کبھی اپنی کسی کتاب کا کہیں رسم اجرا نہیں کیا کہ احباب میری اور میرے فن کی میرے سامنے منہ دیکھی تعریف کریں اور مجھے پھول پہنا کر دلہا بنا دیں اور سامعین باراتی بنے بیٹھے رہیں۔ میں نے اس رسم کو ہمیشہ اپنے لئے اہانت سمجھا۔

ایک بار پروفیسر مغنی تبسم نے کہا کہ پروفیسر یوسف سرمست سے انھوں نے سب رس میں میرے گوشے کے لیے میرے افسانوں پر مضمون لکھنے کا وعدہ لیا ہے۔ یوسف سرمست نے وعدہ کیا۔ لکھنا شروع بھی کیا پھر نہ لکھ سکے۔

میں نے دو بار مغنی تبسم کے حوالے سے ان کی یاد دہانی بھی کی - پھر اس کے بعد کبھی نہیں پوچھا آخر شش سب رس میں ان کے مضمون کے بغیر میرا گوشہ شائع ہو گیا۔

میں کچھ اس طرح سوچتا ہوں کہ فنکار کی تخلیق میں اگر اتنا کس بل ہو تو وہ خود لکھوا لیتی ہے - مجھ میں کس بل نہیں ہوگا جیسے مولانا بھی بخوبی جانتے ہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ وہ سب رس کو پابندی سے شائع کرنا چاہتے ہیں اور اس کے معیار کو مزید اونچا کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ میں سب رس کیلئے زیادہ سے زیادہ آج تک لکھوں لیکن تعمیل کیلئے جا رہا ہوں، انھوں نے دو بار سب رس میں میرے گوشے شائع کیے - دوسروں کے گوشوں میں ان کے بارے میں فٹ نوٹ لگائے اور کچھ نہ کچھ لکھا - میرے لیے ایک لفظ بھی کبھی نہیں لکھا۔ وہ مجھ سے محبت اور احترام سے ملتے ہیں - میرا لکھا خوشی سے سب رس میں چھاپتے ہیں - کیا میرے لیے یہی کافی نہیں ہے۔

اب شاید یہ بات فخر میاں صاحب کے لیے ملال کا باعث ہو کہ ہندوستان میں میرے بعد کی نسل کے لکھنے والے شاعروں اور ادیبوں میں کتنے ہی ایسے ہیں جن کی تمنا ہے کہ میں ان پر کچھ لکھوں - میں نے تمنا کا لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے - جناب کی ناخوشی کے لیے نہیں - موٹا اندازہ کروں تو بھی بیس پچیس تک تعداد جاتی ہے - میرے وعدے نہ انھوں نے لکھوا لیے ہیں نہ میں نے لیکن کیا کروں کہ حتی المقدور کوشش کے باوجود شرمندہ رہتا ہوں۔ وہ جو تھک کر بھول گئے اور میں نے شرمندہ رہ کر بھلا دیا وہ الگ ہیں۔

جناب سے اور جناب کی طرح خاندان میں چند اور چاہنے والوں سے بصد ادب التجا کروں کہ بھائی میں ادیب ہوں کہ نہیں ہوں۔ شاعر ہوں کہ نہیں ہوں اس میں آپ لوگوں کے لئے کونسی سبکی اور رسوائی کی بات ہے۔ کچھ نہیں ہوں کسی کا اقبال بھائی، کسی کا متین بھائی تو ہوں۔ جاہل سہی خاندان بھر میں آپ سب سے زیادہ سال خوردہ تو ہوں۔

میرے چاہنے والے مجھے بھرے بازار میں نیلام کا مال بنا کر کوڑیوں کے مول بیچ دیتے ہیں۔ پھر اس کے بعد مطمئن ہو کر چین کی نیند نہیں سو جاتے کہ حسن کم جہاں پاک۔ جانے کیوں ان کا ضمیر انھیں بے آرام رکھتا ہے۔ مصالحت کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں تب بھی مصلحتوں کی بڑی دبیز چادر میں خود کو لپیٹے رکھتے ہیں۔ اسی چادر سے ہاتھ باہر نکالتے ہیں لیکن یہ ہاتھ اتنی بلندی پر ہوتے ہیں کہ میں اچھل اچھل کر بھی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور میرا ضمیر ان بلندیوں کو چھونے سے انکار کرتا ہے۔ پھر بھی بلندیوں سے مسلسل آواز آتی ہے کہ ہم آپ سے مصالحت کرنے کے تمنائی ہیں لیکن بروقت معذرت خواہی فلاں صاحب ہم میں موجود نہ رہیں، فلاں خاتون تو ہمیں کسی قیمت پر گوارا نہیں۔ ان میں سے کوئی نہ رہے جن کے نتیجہ ہم نے آپ کو کہیں کا نہ رکھا۔ ذلیل کیا ـــ وہ کوئی نہ رہے جس نے ہمارے اچھالے ہوئے کیچڑ کو آپ کے ملبوس پر آنکھوں اور پیشانی پر اپنی کبھی کبھی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایسے میں اپنے آپ کو اظہار موانست کی تمنائی سے بچاتے پھرنے میں بڑی تسکین ہوتی ہے۔

میرے بھائی فخر میاں نے اپنے کردار کی بلندی کا اپنے کسی معمول آتش فشاں سے ایسا لاوہ راست میرے دماغ میں انڈیلا ہے کہ سوائے میرے دماغ کی مہین شریانوں کے ہر چیز جل کر راکھ ہو گئی۔ صرف دماغ کی شریانیں ہ گئیں اور میں سوچ بچار سے عاری نہ ہو سکا۔

یاد کیجئے آپ نے اپنے ہی گھر میں لان پر بٹھا کر مجھے اپنے ساتھ پلاتے ہوئے اپنی مردانگی کے کیسے کیسے قصے سنائے ہیں اور اپنے ان کارناموں کے بعد حکیم محمود علی صاحب ناظم طبابت کے کیسے کیسے احسانات کا ذکر کیا ہے لیکن اس وقت بھی آپ کے انداز بیان کا طنطنہ وہی تھا جیسے حکیم محمود علی صاحب کی یاری آپ کے کسی ہم عمر کی طرح تھی۔ آپ نے اپنے گرامی نامے میں اپنی برتری کا ذکر کسی پہلو سے بھی نہیں چھوڑا ہے۔ لیکن ان سارے اوصاف سے مجھے مرعوب کرنے کی آخر آپ کو ضرورت کیوں پیش آئی۔ میں تو آپ کے تین چوتھائی گرامی نامے کی تاب لا چکا تھا۔ آپ کی علمی، ادبی قابلیت، دانشوری اور مذہبی برگزیدگی کے آگے سر جھکا چکا تھا کہ آپ نے اپنے کردار کی عظمتوں کو پیٹھ پر لاد دیا اور کمر دوہری کر دی۔ گویا آپ کا سرفراز نامہ مجھ تک بہ حفاظت پہنچانے والا کوئی لفافہ نہ تھا خریطہ تھا۔

اپنے احوال سے دوسروں کی مطابقت ناگزیر ہو جائے تو ایک بات کا ضرور خیال رکھا کیجیے۔ شخص ثانی کو آپ کے تعلق سے کھلا کر نہ کیوں پہنچے علم و شعور کے باعث نہیں، عمر اور رشتے میں بڑا ہونے کے سبب عرض کر رہا ہوں۔

میرے آگے ڈاکٹر سید عبدالمنان سے اپنے قریبی تعلقات کے اظہار کی ضرورت آپ کو کیوں پیش آئی - اس نفسیاتی مرض کا میں اندازہ کر سکتا ہوں۔

ایک دن آپ نے فرمایا کہ آپ کے بڑے بھائی تقی الدین صاحب اور ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ ان میں تو تو میں میں، ڈھول دھپا اور گالی گلوج کی دوستی اور بے تکلفی تھی۔

حالانکہ اپنی بات کو آپ ڈھنگ سے بے تکلفی تک محدود رکھ سکتے تھے۔

تقی بھائی کو میں شخصی طور پر جاننے لگا تھا - بہت ثقہ اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے - جامہ زیب تھے - میرے ابا انھیں بہت پسند کرتے تھے - مزاج کی یکا نگت تعلق خاطر کا باعث ہوئی ہو گی - آپ نے ان کی جوانی کے ساتھ جن عامیانہ باتوں کو جوڑ دیا ہے اس کا آپ کو خونی حق ہے کیوں کہ وہ آپ کے بڑے بھائی تھے - لیکن آپ نے ڈاکٹر منان کو کس آسانی سے رگید کر رکھ دیا -

تقی بھائی بھی آپ کی طرح میرے کرم فرما بھی تھے - میں آپ کی اس محبت کو کس طرح بھول سکتا ہوں جب آپ نے مجھے منیر کو اور بابا جی کو اپنے گھر لے جا کر پیار سے رکھا تھا - میری دل جوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا انھیں دنوں تقی بھائی نے فرید مرحوم کی تربت کا کتبہ اپنے ہی ہاتھ سے بہت ہی خوشخط تحریر کیا تھا - حروف کے نوک و پلک کی نزاکت پتھر پر

کندہ کئے ہوئے کتبے پر بھی کاغذ کے نقوش کو شرماتی ہے۔ انھوں نے اپنے کسی خاص سنگ تراش سے اپنی نگرانی میں کتبے کی عبارت کندہ کروائی تھی۔ ہمارے قبرستان میں اتنا خوش خط کتبہ آج تک بھی نہیں ہے۔ خیر چھوڑیئے بھی۔ آپ کے نوزائیدہ غرور و تکبر نے کسی غریب شہر کو بہت مجروح کیا ہے۔ اور شاید۔

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

میر تقی میر کی بریانی پر ہاتھ مار کر آپ صرف ہڈی چباتے رہ گئے۔ اسلیے کہ آپ کی انانیت میر کو بھی کھرچن کھلا گئی۔

میر آپ سے بہت زیادہ بد دماغ آدمی تھے لیکن یہ نہ بھولیے وہ خدائے سخن تھے۔ جن کا کلام آپ نے عربی میں جدہ میں پڑھا ہوگا۔

میر کے تعلق سے چند باتیں آپ کے مزاج میں شگفتگی پیدا کرنے کے لئے نقل کی ہیں۔

"میر کی رائے پر ان کی انانیت، خود پرستی، گروہ بندی ذاتی تعلقات اور عناد کا گہرا اثر ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میر صاحب فطرتاً کینہ پرور تھے اور ان کے ہاں معافی کا کوئی خانہ نہیں تھا لیکن ان کے یہ سارے عیوب ان کی شاعرانہ عظمت نے چھپا لئے ہیں . . . ."

...... قرائن بتاتے ہیں کہ "نکات الشعراء"
کے نقش اول میں دوسرے شعراء کے کلام پر اصلاح کا یہ
اشتعال انگیز عمل بہت زیادہ تھا۔ ممکن ہے سودا کا کلام
بھی زیر اصلاح آیا ہو اور اسی لئے سودا نے نو شعر کا ایک
رنجیدہ یہ قطعہ لکھا جس میں میر کی اصلاح کو سہو کاتب
قرار دیا۔

"تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اول صفحہ ۵۲۵"
ڈاکٹر جمیل جالبی

بہ ہر حال یہ باتیں میر و سودا کی ہیں کسی ایسے شخص کی نہیں جس کے
سر میں سودا ہو۔

"نکات الشعراء" کے بارے میں محمد حسین آزاد نے میر تقی میر کے حوالے
سے لکھا تھا۔

میر "فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے اس
میں ہزار شاعر کا حال لکھوں گا۔ ان کو نہ لوں گا جن کے
کلام سے دماغ پریشان ہو"۔

آزاد کہتے ہیں کہ "ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں
اور ملامتوں سے نہیں بچا"۔

آزاد نے میر صاحب کے اس دعوے

کی بھی نفی کی ہے کہ نکات الشعراء (فارسی) پہلا تذکرہ ہے

"آب حیات صفحہ ۲۲۲، محمد حسین آزاد"

اب یہ باتیں تو میں میاں فخرالاسلام کا جی بہلانے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ آخرانہوں نے کس بطیخ کی بدیانی کھائی ہے۔ میں اچھا ہے اان کے ہم عصر نہ ہوئے آج ہوتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ کس جیّد ہستی سے سابقہ پڑا ہے۔

"میر کا قلم بے باک، تلخ اور زہر میں بجھا ہوا ہے انھیں دوسرے برداشت کرنے میں مزا آتا ہے۔ کوئی ایسا موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

- عشاق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ایک شخص ہے کھتری، شعر ریختہ بہت نامربوط کہتا ہے۔"
- قدر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اس کی زبان آوارہ لوگوں کی زبان ہے۔"
- عاجز کے بارے میں کہتے ہیں کہ "اخلاق سے گرا ہوا ذلیل و بداطوار آدمی ہے۔"
- قدرت اللہ قدرت کے بارے میں کہتے ہیں کہ۔ "اگرچہ تخلص قدرت ہے مگر عاجز سخن ہے۔"

یہ میر کا مزاج ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں تلخ سچائی کے اظہار میں عام طور پہ خطا نہیں کرتے۔

• آبرو ایک چشم تھے۔ اس بات کو مزے سے کہ اس طرح بیان کیا ہے۔

"دجال صفت" دنیا کی بے توجہی کے باعث اس کی ایک آنکھ بیکار ہو گئی تھی۔

• میاں شرف الدین مضمون جن کے نزلے کے سبب دانت گر گئے تھے آرزو کے حوالے سے انھیں شاعر بے دانہ کہا۔

• ثاقب کے بارے میں "ہر چیز میں دخل دیتا ہے اور کچھ نہیں جانتا ہے"

(صفحہ ۵۳۷ تاریخ ادب اردو جلد دوم حصہ اوّل ڈاکٹر جمیل جالبی)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے نکات الشعرا کے حوالے سے یہ ساری باتیں لکھی ہیں جو میر تقی میر کی ہی تصنیف ہے۔

اب میاں فخر غور فرمائیں کہ اگر وہ میر کے زمانے میں ہوتے تو میر ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے کیونکہ میر کو اپنی شاعری پر بڑا گھمنڈ تھا اتنا کہ انھوں نے بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لایا۔ اور میاں فخر نے بڑے افتخار کے ساتھ اردو زبان یا "ریختہ" کی موت کا بہت پہلے ہی اعلان کر دیا تھا۔ اپنے کرم نامے میں انھوں نے لکھا ہے۔

"علم رکھنے کے باوجود بھی بحث سے احتراز ہی کرنے

میں عافیت جانا۔ علم بھی اللہ کی دین ہے۔ جس کو
جس قدر اہل سمجھتا ہے عطا فرما دیتا ہے"۔

اسی قسم کے کئی دعوے گرامی نامے میں کیے گئے ہیں۔ ہر دعوے کے
بعد ارشاد ہوا ہے کہ

"کسی عالم دین سے اس کی تشریح حاصل کر لو"
"کسی رہبر کامل سے رجوع کرو"۔

"اصطلاحات صوفیہ میں مے کے مرادی معنی عشق کے ہیں
دیکھو فرہنگ صوفیہ... کسی ذی علم انسان سے اس
کی تردید کروا دو"

"سرکار دو عالم صلعم کا ارشاد ہے کہ۔ ہر ایک شخص سے
اس کی سمجھ اور حوصلے کے موافق گفتگو کرنی چاہیئے تاکہ وہ
سمجھے اور مستفید ہو (سرکار ص کے اس ارشاد میں آپ کا نفس
کہاں چھپا ہے وہ آپ کے سرفراز نامہ سے ظاہر
ہو سکتا ہے)

آپ کیا جانیں کہ موت کے اقسام کیا ہیں اور اس کی اصلیت
کیا ہے۔ موت کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری اور
ایک بے اختیاری۔ موت سے قبل اختیاری موت
حاصل کرنے کی ہدایت ہے"

اب یہ ہدایت کہاں ہے کس کے لئے ہے کن حالات میں ہے اور کیوں ہے۔ مولانا فخر کے دعوے کو ان نکات کی تفہیم کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ خود ان کے پلّے کچھ نہیں پڑا ہے۔ ان کا خود ساختہ تبحر علم کوئی آوازہ پھینک دیتا ہے پھر فوری ایک اور آواز گوش زد ہوتی ہے۔ کہ یہ حکمت کی باتیں ہیں تصوف کی باتیں کسی رہبر کامل سے رجوع کرو۔

مذہبی بے علمی جب کسی کی ذات میں خود زائیدہ علم کی صورت پکڑ لیتی ہے تو شیطنیت توانا ہو جاتی ہے۔ علامہ موصوف نے جا بجا اپنے اعمال قبیح کو تصوف کی دریدہ چادر اڑھا کر اپنی گندگی کو چھپانا چاہا ہے۔ میرو غالب کا سارا طنطنہ اقلیم شعر و سخن میں تھا یہاں مولانا فخر کے وسعت علم کی نہ حد مقرر ہے نہ سمت۔ چار دانگ میں ان کی روشنیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ایسی سفاکانہ دروغ گوئی اور مبالغہ آرائی اپنے کردار کی وکالت میں کی گئی ہے کہ الحفیظ والامان اور قدم قدم پر قرآن اور سرکار کا سہارا لیا گیا ہے۔ فلسفۂ تصوف جہاں بشر کی اللہ تک رسائی کے علل فراہم کرتا ہے۔ وہاں علم و دانش، جذب و شعور کے پر خاکستر نہیں ہوتے۔ یہی فلسفہ جب ناپختہ اور بے بصر دیے علم احساس بلوغیت کے ہاتھ لگتا ہے تو مولانا فخر الاسلام جیسی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسی ہستیاں بے ضرر نہیں ہوتیں۔ اگر انھیں کھلی چھوٹ دے دی جائے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں اپنی تفضیلت کے لئے ملّی اعتقاد و اعتماد کی جبر احتوں کا باعث بنتی ہیں۔ میرو غالب کی بد دماغی نے ہر وقت قرآن اور

سرکار کے آگے سر جھکایا ہے۔ ان ہستیوں کے ساتھ مولانا فخر میاں کے نام کا بار بار اعادہ اور "بکی" روشنائی میں اس کی اشاعت و ترویج کسی رنگ میں ہو ان کی شہرت کا باعث بن رہی ہے۔ سولہ صفحات کا گرامی نامہ جو اغلاط سے پُر ہے تقسیم کیا جائے تو بندگانِ خدا کو ان کی اصلیت بھی نظر آسکتی ہے اور وہ مذہبی لبادہ جسے اوڑھ کر انہوں نے اپنے کذب و افترا کو زہد و تقویٰ کی عبا پہنا دی ہے "ننگا" ہو کر سامنے آسکتا ہے۔

میں کیا میری حیثیت کیا۔ جس شخص کو قدم قدم پر اپنے گناہگار ہونے کا احساس ڈستا رہتا ہے وہ میں ہوں۔ لیکن میں اپنے اس حق سے کیوں دستکش ہو جاؤں جو میرے معبودِ حقیقی نے مجھے دیا ہے کہ مجھ سے مانگو۔ وہ دے یا نہ دے اس کی مرضی۔ مانگنا میرا کام ہے۔ آج بھی میں اس سے یہی مانگتا ہوں کہ میرے مالک ہم سے دو برائیاں چھین لے۔ دروغ اور تکبر۔ اس کے بعد ہم سب سدھر جائیں گے۔ میرے آقا۔

اس وقت ذرا خود کو سنبھال لوں تو ہنس بھی سکوں۔ مولانا نے کا ایک لطیفہ بیان کرنے سے پہلے ان کی بلیغ بیانی میں وہ نکات و رموز جو اختیاری اور بے اختیاری موت سے متعلق ان کی دانست میں پنہاں ہیں اور جو کچھ ایسے ادق نہیں ہیں جو ان کے سوا کسی اور کو سمجھ میں نہ آسکیں اس کی مزید توضیح کی گزارش کرتے ہوئے عرض کروں کہ اردو شاعری اس موضوع سے ناآشنا نہیں ہے۔ لیکن اپنی فضیلت کے لئے عامتہ الناس کو گمراہ کرنے کا مشاقانہ دانستہ طریقہ یہی ہے کہ تصوف کی آڑ میں بے علمی چھپ سکے۔ ورنہ علمان

کے لیے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ موت کی تمنّا نہ کرے ۔

• "حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اگر نبی گرامی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ فرمایا ہوتا کہ موت کی تمنا نہ کیا کرو تو میں ضرور موت کی تمنا کرتا۔"

• "حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں کسی شخص کو موت کی تمنا نہ کرنا چاہیئے کیوں کہ اگر وہ نیک شخص نیک ہے تو اس کی نیکی میں زیادتی ہوگی اور گناہگار ہے تو ممکن ہے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرے"۔

"تجرید صحیح بخاری شریف صفحہ ۳۷۶ اور ۳۷۷"

میری ذاتیات سے جو سلوک مولانا نے اپنے گرامی نامے میں روا رکھا ہے اور جس جس طرح مجھے نوازا ہے مجھے اس کا دکھ اس واسطے نہیں ہے کہ جس شخص کا ضمیر خود ستائی کی بیماری سے مر چکا ہو - اس کے لئے کسی کی طبعی یا غیر طبعی اخلاقی یا غیر اخلاقی، انسانی یا غیر انسانی، صفاتی یا غیر صفاتی موت کوئی معنی نہیں رکھتی اور پھر میری اپنی ذاتیات کو نفس مضمون کا جز بنانا نہ صرف میرے لئے تضیع اوقات ہے پڑھنے والوں کے لئے بھی ۔

میرؔ بہ غالبؔ سے سوا کسی کو خاطر میں نہ لانے والے علامہ نے میرؔ کی شاعری سے نہیں تو ان کی زندگی ہی سے کچھ تو سیکھا ہوتا ۔

میں نے موصوف کو ان کے سولہ صفحات کے خط کے جواب میں یہ بھی لکھا تھا کہ -

اپنے غیض و غضب کے عالم میں آپ کو سلطانہ کی وہ آوازیں بچھا کرتی ہوئی شنائی کیوں نہیں دیتیں کہ -

"چپ بیٹھو جی کیا دیوانہ بکوا کرتے ہو"

مولانا موصوف کا شیخ سعدی کی طرح " درگلو تم سنت پیغمبر است " والا معاملہ بھی نہیں تھا - یہاں تو بات برعکس تھی -

آج سوچتا ہوں کہ اسی ایک آواز کے احتساب و احتجاج نے مولانا کو سنبھال سنبھال کر رکھا تھا اور ان کی اصلیت کو پوری طور سے عیاں ہونے نہیں دیا -

دیکھئے جس اردو نے مسیں بھیگ رہی تھیں کہ آپ کی آغوش صدالتفات میں دم توڑ دیا "اسی اردو کا ایک شاعر جو صرف ۳۲ سال کی عمر میں مر گیا " کیا بات کہہ دی ہے - کس دل سے کہی ہوگی - کتنے جان لیوا تجربوں سے گزر کر -

آخر آ خر شکستگی دل کی
زندگی کے شعور تک پہنچی
(لطیف ساجد)

میں نے اس معمولی سے چند سطری پوسٹ کارڈ کے ایک جملے میں کبھی نہ مولانا کی ذات بابرکات پر کوئی حملہ کیا ہے نہ مراسم خسروانہ کے پیش نظر مزاح کو بھی حدود آداب سے تجاوز کرنے دیا -

میرے دل میں ان فخر میاں سے اخلاص و محبت آج بھی ہے جو سلطانہ کی زندگی میں مجھ سے ملتے رہے - جس غم کی شدت کا اظہار انھوں نے

اپنے گرامی نامے میں کیا ہے اس غم سے ان کا دل موم بن سکتا تھا لیکن تیغ و تبر بن گیا۔ میرے دل میں مولانا سے تباغض کا دور دور تک کوئی شائبہ نہیں - میں جو کچھ بھی ہوں اس سے وہ خوش نہ ہوتے، لیکن ناخوش اور غمزدہ ہونے کی تو بات نہ تھی۔ جب ان کے اپنے غم ہی ان کی تحریر سے کہ بہت ہیں - یہ ان کا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے انھیں اُن کی ایذا پسندی سے دور رکھنے کے لئے کیونکہ میں ان کا اقبال کھائی اور مستین جانی تھابات اس طرح شروع کی تھی۔

"تم میں جو تبدیلی سلطانہ کے بعد آئی اس نے مجھے بہت محروم کیا غم کا بوجھ اٹھا کر آدمی دیکھی دیکھی آنچ میں موم کی طرح پگھلتا ہے لیکن تم غرب کے شتر بے مہار بن کر کیوں رہے"

تسلیم کہ اس جملے میں تلخی ہے لیکن اس جملے کی بنیادی وابستگی مولانا کے غم کا سارا اثاثہ اٹھائے ہوئے ہے کہ نہیں۔ مولانا نے سول صفحات میں آیات وجدانی سے نوازا۔

میری بریانی مولانا نے اتنی کھائی کہ ان کا حافظہ و ہاضمہ بیک وقت خراب ہو گئے۔ اور خود میر کا حال محمد حسین آزاد کی زبانی سُنیے۔

"جب نواب آصف الدولہ مر گئے سعادت علی خان کا دور ہوا تو
میر دربار جانا چھوڑ چکے تھے۔ وہاں کسی نے طلب نہیں کیا۔
ایک دن نواب کی سواری سامنے آئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔
میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے۔ سید انشاء خواصی میں تھے۔
نواب نے پوچھا کہ انشاء یہ کون شخص ہے؟ جس کی تمکنت

نے اسے اٹھنے نہ دیا۔ عرض کی کہ جناب عالی یہ دہی گدائے متکبر ہے جس کا
ذکر حضور میں اکثر آیا تھا۔ گذارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی
فاقہ ہی سے ہوگا۔ سعادت علی خاں نے آ کر خلعت بحالی کی اور ایک ہزار روپیہ
دعوت کا بھجوایا۔ کہا یہ گنہگار آنا محتاج نہیں۔ سعادت علی خاں جواب سن کر
متعجب ہوئے مصاحبوں نے پھر سمجھایا۔ غرض نواب کے حکم سے سید انشا خلعت
لیکر گئے اور اپنی طرز پر سمجھایا کہ نہ اپنے حال پر بلکہ عیال کے حال پر رحم کیجیے اور
بادشاہ وقت کا ہدیہ قبول کیجیے۔ میر صاحب نے کہا کہ صاحب! وہ اپنے ملک
کے بادشاہ ہیں۔ میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔ کوئی ناواقف اس طرح
پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف میرے حال سے واقف۔
اس پر اتنے دنوں بعد ایک دس روپے کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔
مجھے اپنا فقر وفاقہ قبول ہے۔ مگر یہ ذلت نہیں اٹھائی جاتی۔

سید انشا کی لسانی اور لفاظی کے سامنے کس کی پیش پیش جا سکتی۔
میر صاحب نے قبول فرمایا اور دربار میں بھی کبھی کبھی جانے لگے۔ نواب سعادت علی خاں
مرحوم ان کی ایسی تعظیم کرتے تھے کہ اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتے تھے۔
اور اپنا پیچوان پینے کو عنایت فرماتے تھے۔"

(صفحہ ۲۲۳۔ آب حیات۔ محمد حسین آزاد)

دیکھئے اس اکبر کے آگے احترام سے سر جھک جاتا ہے۔ اس اکڑ سے خون اور غرور پہ
پیار آتا ہے۔ اس انا سے ربوبیت کے آگے خاک بن جانے اور کائنات کا سر تسلیم
خم کرنے کا عجز سکھانے کا ہنر آتا ہے۔ آپ نے واقعی اردو شاعری میں صرف اور صرف میر

ہی کو پڑھا ہوتا تو آپ یہ نہ ہوتے جو آج ہیں۔

میرے زندگی کے مختلف ادوار میں جس معاشی زبوں حالی کا صبر و تحمل سے مقابلہ کیا ہے۔ زمانے کے جتنے سرد گرم دیکھے ہیں۔ جن سیاسی معاشرتی اور تہذیبی طوفانوں سے گزرتے ہوئے بھی اپنا سر بلند رکھا ہے اس کا اندازہ کرنا شاید آپ کے لئے اس وجہ سے ممکن نہیں کہ آپ کے مزاج میں میر کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ میر نے غم کو زندگی کا روپ دے کر انسانی جذبات و شعور کا حصہ بنا دیا ہے۔

آپ کو خدا کے فضل و کرم سے ہر قسم کی آسائشیں حاصل ہیں۔ بیٹے اور داماد کا شاہی محل ہے۔ اللہ رکھے آپ کا برخوردار بیٹا افتخار سلمہٗ آپ کی گھریلو زندگی کے سارے اخراجات کا کفیل ہے۔ اس کے علاوہ سنا ہے کہ صرف آپ کے جیب خرچ کے لئے اتنی رقم نذر کرتا ہے جس میں آپ اپنے سارے شوق و ذوق پورے کر سکتے ہیں۔ اگر میں کہوں تو آپ یاد کریں گے کہ میں تو یہی جان کر دل ہی دل میں خوش رہتا تھا کہ چلو سلطانہ کے بعد میرے فخر کو معاشی صعوبتوں کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا جو زندگی اور موت کی تفریق مٹا سکتا ہے۔

ہائے میر کا ایک شعر سنیئے 'اردو' میں ہے۔

اب جان جسمِ خاکی سے تنگ آ گئی بہت
کب تک اس ایک ٹوکری کو ڈھوئیے

اب اس شعر پہ بات ختم کروں۔ آج "سیر" کو مذکر نہیں باندھا جا سکتا۔ لیکن شعر دیکھیے فانی زندگی کی کن تماشہ گاہوں سے کن کیفیات کے ساتھ گزارتا ہے۔

ملائے ہے خاک میں کس کس طرح کے عالم یاں
نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزار دن کی

..

لیل و نہار

تعارف نامہ

نام :- سید مسیح الدین

عرف :- اقبال

تخلص :- متین

قلمی نام :- اقبال متین

والد کا نام :- سید عبد القادر ناصر صاحب (مرحوم)

حقیقی والدہ :- سیدہ اصفیاء بیگم صاحبہ مرحوم

علاتی والدہ :- محبوب بیگم صاحبہ مرحوم جو مجھے حقیقی والدہ کے برابر تھیں

تاریخ پیدائش :- ۲/ اکتوبر ۱۹۲۴ء

مقام پیدائش :- فرحت منزل، رام کوٹ، شہر حیدرآباد (بھارت)

تعلیم :- انٹرمیڈیٹ

درسگاہیں :- مدرسہ وسطانیہ بشیر آباد (نادندگی)

مدرسہ فوقانیہ چیتاپور

سٹی ہائی اسکول حیدرآباد

ایم-اے-او- انسٹیٹیوٹ، عابڈس حیدرآباد

سٹی کالج حیدرآباد

دارالعلوم کالج حیدرآباد

چادر گھاٹ کالج حیدرآباد

شریک حیات (پہلا اور آخری معاشقہ) سیدہ بدرالنساء بیگم منیر مرحوم

دختر اشعر :- شاہ جہاں بیگم رابعہ

اولاد سید فرید اقبال مرحوم

سید نوید اقبال

سیدہ ماریا شہناز

سید نشید اقبال مرحوم

سید معید اقبال مرحوم

شبانہ اقبال

سید مجید اقبال

سید وحید اقبال

سید سدید اقبال

پہلی کہانی :- چوڑیاں :- ادب لطیف لاہور جون ۱۹۴۵ء

پہلی نظم :- کب تلک :- سب رس ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد

پہلی کتاب :- اجلی پرچھائیاں - ۱۴ افسانے - اگست ۱۹۶۰ء

مطبوعہ تصانیف

(۱) اُجلی پرچھائیاں — (افسانے) ۱۹۶۰ء
(آندھرا پردیش ہندی ساہتیہ اکاڈمی اوارڈ)

(۲) بکھرا ہوا البم — (افسانے) ۱۹۷۳ء (اتر پردیش اردو اکاڈمی اوارڈ)

(۳) چراغ تہہ داماں — (ناول) ۱۹۷۶ء
حیدرآباد کے سرکردہ ادیبوں شاعروں ناقدوں اور دانشوروں کی جانب سے ۲۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کو لائبریری ہال انوار العلوم کالج حیدرآباد میں ناول کی پذیرائی میں خیر مقدمی جلسہ کیفہ زد کی پیشکشی اور آندھرا پردیش اردو اکاڈمی کی دھاندلی پر احتجاجی تقاریر کہ جبس کے بورڈ نے اس ناول کو UNIQUE قرار دے کر انعام اول کے لئے نامزد کیا۔ لیکن ارباب نظم ونسق نے بخش قرار دیگر انعام سے محروم رکھا۔ پروفیسر عالم خوندمیری کا احتجاجاً استعفا۔ ہندوستان کے بیشتر ادبی جرائد میں احتجاجی اداریے اور مضامین

(۴) خالی پیالیوں کا مدار۔ — (افسانے) ۱۹۷۷ء
(آندھرا پردیش اردو اکاڈمی اوارڈ)

(۵) آگہی کے ویرانے (افسانے) ۱۹۸۰ء
(اترپردیش اردو اکاڈمی اوارڈ)

(۶) ضربِ لفظ (افسانے) ۱۹۸۹ء
شائع کردہ آندھرا پردیش اردو اکاڈمی

• ادبی خدمات کے اعتراف میں ہم عصر ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی جانب سے خیر مقدمی تقریب، تقاریر اور گراں قدر کیسہ زر کی پیشکشی۔
۹ر دسمبر ۱۹۸۹ء بمکان محمد عبدالقدوس صاحب ایڈوکیٹ مہدی پٹنم حیدرآباد (ہند)
• ادبی ٹرسٹ کا تحفۂ اعتراف۔ دسمبر ۱۹۸۹ء
• اترپردیش اردو اکاڈمی اوارڈ۔ ۱۹۹۰ء

(۷) میں بھی فسانہ تم بھی کہانی۔ (افسانے) دسمبر ۱۹۹۳ء
آندھرا پردیش اردو اکاڈمی اوارڈ
اترپردیش اردو اکاڈمی اوارڈ

ان کے علاوہ توصیف نامے (اسنادات)

★ اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنو۔ سند اور رقم (۳۰۰) روپے مارچ ۱۹۹۰ء
★ سلطان العلوم اوارڈ۔ سند اور مومنٹو برائے سال ۱۹۹۰ء
★ آندھرا پردیش اردو اکاڈمی۔ ادبی خدمات توصیف نامہ اور مومنٹو (۵۰۰) روپے ۱۹۹۳ء
★ اترپردیش اردو اکاڈمی توصیف نامہ اور مومنٹو۔ ۱۹۹۴ء

ادبی انجمنیں

(۱) سابق نائب صدر ۔ انجمن معمارِ ادب حیدرآباد
(۲) سابق صدر ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین آندھرا پردیش

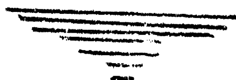
ادارت

(۱) سابق نگراں ماہنامہ گلبانگ ادب (بمبئی)
(۲) مدیر برائے جنوبی ہند سہ ماہی تناظر (فکشن انتھالوجی)
افسانوی انتخاب (دہلی)

پتہ

اقبال متین "سکہانی" کتاب نگر۔ نظام آباد
(اے پی) ۵۰۳۰۰۱ (انڈیا)





"بسیرے"

والد محترم حضرت سید عبدالقادر صاحب ناصر کی اضلاع کی ملازمت کے دوران میں بہ غرض تعلیم مجھے حیدرآباد بھجوا دیا گیا ــــ میں اپنی امی جان (امّی) سیدہ اصفیا بیگم صاحبہ اور بے مثال بابا سے جن سے میری امیؓ پوچھا کرتی تھیں کہ "صاباں" آپ کے دل میں کتنی ماؤں کی محبت ہے۔ مڈل کلاس (جماعت ہفتم) کامیاب کرنے کے بعد جدا ہو گیا ــــ اپنی علاتی ماں محبوب بیگم صاحبہ کے پاس رہا ــــ میری مماں نے مجھے میری امیؓ سے کم پیار نہیں دیا ــــ میرے ہی گھر موقوعہ دبیر پورہ ریلوے لائین میں انتقال کیا۔ انھوں نے میرے ساتھ میری شریک حیات سیدہ بدرالنساء بیگم منیر کو بھی اپنی محبتوں سے نوازا ــــ منیرہ نے بھی آخری دنوں میں اُن کی بہت خدمت کی۔

اس کے بعد سے آج تک جن چھتوں کے نیچے زندگی بسر ہوئی اُن

گھروں کی سنہ واری فہرست میں بطور یادداشت محفوظ کرلی ہے۔
ماضی کے ان سنین میں جن پتوں کا ذکر ہے ان میں نمبروں کا لزوم
اس لئے نہیں رکھا جاسکا کہ ان کی مصدقہ تفصیلات میسر نہ آسکیں۔

١- ٢٣-٢-٨ اندرون کمان ساجدہ بیگم
نزد خواجہ کا چلّہ مغلپورہ۔ حیدرآباد-٢ — ١٩٣٧ — ١٩٤١ء

٢- ١٠٤٩ - پٹیلا برج نزد مکان
کالے حکیم صاحب۔ حیدرآباد — ١٩٤١ء — ١٩٤٢ء

٣- ٤٣٣٤ - گھانسی بازار - نزد مکان
جہانگیر علی صاحب وکیل۔ حیدرآباد — ١٩٤٢ — ١٩٤٣

٤- ٨٠١ - گوندکی باؤلی۔ حیدرآباد — ١٩٤٣ء — ١٩٤٥ء

٥- "آب و گلاب" مکان مراد علی صاحب مرحوم
(محلّہ باغ موسیو ریمون) موسیٰ رام باغ
حیدرآباد — ١٩٤٥ - ١٩٤٦ء

٦- 316-3-16 راحت کدہ روبرو دیوڑھی
نواب دولھے خاں۔ چنچل گوڑہ حیدرآباد — ١٩٤٦ء — ١٩٥٠ء

٧- سرور نگر - روبرو چوڑی
حیدرآباد — ١٩٥٠ء - ١٩٥١ء

٨- ٨٦١-١٢-S-1 نزد دبیر پورہ
ریلوے لائین۔ چنچلگوڑہ۔ حیدرآباد — ١٩٥١ء - ١٩٥٥ء

۹۔ دیوڑھی نواب مسیح الدین خاں بڑے بخشی۔
میر مجلس پائیگاہ آسمان جاہی۔ کوچہ مکھن لال
مغلپورہ۔ حیدرآباد۔۲
۱۹۵۵ - ۱۹۵۹ء

۱۰۔ ۲۰۱۔ سردار منزل۔ چراغ علی گلی۔
حیدرآباد۔۱
۱۹۵۹ء - ۱۹۶۷ء

۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء کو دیدہ و دل سید فرید اقبال ہم سے جُدا ہو گئے۔ میں تو ان کا سایہ تھا —— ان کا پیکر آخر ش بے سایہ ہوا اور میرا سایہ آخر ش بے پیکر۔ ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو میرے اور منیرہ کے گوشۂ رفاقت کا پہلا چراغ جلانے والا صرف ۱۳ برس اجالے پھینک کر ۱۹۶۰ء کو تاریکیوں میں کھو گیا۔ فرید اقبال اصفیا باغ دبیر پورہ بازار میں پیوندِ خاک ہوئے ؎

ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بے درد کوئی کیا ہو گا

(ناصر کاظمی)

میرے بابا بھی فرید کے عاشق اور بچھڑ دل فگاروں میں تھے۔ اپنے پوتے کے برابر دفن ہونے کے لئے وصیت نامے کا پہلا فقرہ یہی لکھا کہ "مجھے میرے پوتا فرید کے برابر دفن کیا جائے" میرا خاندانی اور اجداد کا قبرستان اب میرا نہیں ہے۔

میں بھی مٹ جاؤں گا اک حرفِ غلط کے مانند
لوگ کل میری کتابوں سے مجھے پوچھیں گے

(اقبال متین)

۱۱- R.T -۳-۴-۲۷۴ وجے نگر کالونی حیدرآباد { ۱۹۶۷ء — ۱۹۶۸ء

۱۲- ۵۹۴-۱-۱۲ سید علی گوڑہ - حیدرآباد - ۲۸ { ۱۹۶۸ — ۱۹۶۹ء

۱۳- ۲۹۳-۳-۱۰ لیل و نہار - ہمایوں نگر حیدرآباد - ۲۸ { ۱۹۶۹ — ۱۹۷۰ء

شریک زندگی بدرالنسا بیگم منیر ۲۱ مارچ ۱۹۷۰ء کو اپنے بیٹے فرید اقبال سے جا ملیں - گھر سجانے والی اس موہنی نے کیسے کیسے اپنی تنہائی ہوگی -

۱۴- ۳۴۸/۱-۲-۱۰ آصف نگر حیدرآباد -۲۸ { ۱۹۷۰ء - ۱۹۷۰ء

۱۵- ۱۶۴-۱۰-۱۸ - پی او کیشو گری بارکس، یسرم - حیدرآباد { ۱۹۷۰ء - ۱۹۷۱ء ۱۷ ستمبر ۱۹۷۰ء کو شاہ جہاں بیگم راحت سے عقدِ مسعود

۱۶- ۴۳۶/۱-۵-۲۰ دانی کھیت - روبرو مسجدِ فریدیہ - شکر گنج حیدرآباد { ۱۹۷۱ء — ۱۹۷۱ء

۱۷- ۶۷۲/۱-۷-۲۰ فاطمہ منزل - بنگلا - فتح دروازہ - حیدرآباد { ۱۹۷۱ء — ۱۹۷۲ء

۱۸- ۳۸۷-۲-۲۳ دم دمہ - مغلپورہ حیدرآباد - ۲ { ۱۹۷۲ء - ۱۹۷۶ء

لختِ جگر سید معید اقبال نوشاد بیٹے ۲۵ / اگست ۱۹۷۳ء کو اپنی امّی سے جا ملے۔ آصفیا باغ میں امی ہی کے پائینتی سپرد خاک ہوئے۔ ۹ / اپریل ۱۹۶۳ء کو سردار منزل چراغ علی گلی میں تولد ہوئے تھے۔

میں وہ نم آنکھیں - وہ پیاری اداس صورت - وہ ٹھہری ہوئی ایک گھڑی زندگی بھر نہیں بھول سکتا - جب میری اس چھوٹی سی جان نے مجھ سے اشاروں میں کہا تھا کہ وہ بے قصور ہے اور اس نے کچھ نہیں کیا۔

آج بھی یہ صورت ہر چھوٹے بڑے ظلم کے خلاف میرے سامنے سوالیہ علامت بن جاتی ہے۔ میں اسی لئے ہر ظلم سے نفرت کرتا ہوں - خواہ وہ کسی روپ سے سامنے آئے - ہماری روزمرہ کی زندگی میں آج کسی کی دل شکنی ایک لمحے کے لئے بھی ہمیں اداس نہیں کرتی - ہم جانتے ہی نہیں کہ ہم نے کعبہ کتنی آسانی سے ڈھا دیا ہے - ہم اپنے میں مگن ہیں - اور یہ دیکھنے کے لئے زندہ رہ گئے ہیں کہ ہر چھوٹا بڑا جان لیوا تماشہ انسانیت کو صرف حیوانیت کے نہیں، درندگی کے حوالے کر رہا ہے۔

آج جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے سارے آدرش مجھ سے پوچھتے ہیں کہ پیچھیا اور گردونی میں بھی ہمیں تلاش کرو۔

۲۳ / مئی ۱۹۷۶ء کو لختِ دل و جاں نشید اقبال نشو نے اپنی زندگی آخرش اللہ میاں کی نذر کر دی اور اپنے چھوٹے بھائی کی دلجوئی کے لئے دنیا چھوڑ دی - یہاں تک کہ میرے چاہنے والے نے مجھے بھی اسی گھر میں چھوڑ دیا۔ جہاں بچپن ہم سے جدا ہوا تھا - جب تک جیتے رہے اپنا نام

رشید پین لکھا کیے ۔ اور میں اپنی غیرت پر روتا رہ گیا ۔ ۱۱/ اگست ۱۹۵۸ء
کو ڈیوڑھی میں تولد ہوئے تھے ۔ ـــــہ

جی لیے بھی تو سہارا نہ ملا اشکوں کا
دل اکیلا تھا کہ بے اشک بھی روتا ہی رہا
(اقبال متین)

آج روئے ہیں بہت ۔ روئے تھے کب یاد نہیں
عمر پھر اور ہی راہوں میں بھٹک جائے گی
(اقبال متین)

۱۹ - ۲۶/۷/۹ - ۳ - ۲۲ - یاقوت پورہ حیدرآباد } ۱۹۷۶ء - ۱۹۷۸ء

۲۰ - سی - ٹی - ۸۰ (C.T. 80) ڈیم سائیٹ
Dam Sight - پوچم پاڈ - ۵۰۳۲۱۹
ضلع نظام آباد } ۱۹۷۸ء - ۱۹۷۹ء

۲۱ - بی - ٹی - ۴۵ (B.T. 45)
دودھ گاڈن ریوینیو کالونی -
(Revenue colony)
پوچم پاڈ ۔ ضلع نظام آباد ۔ پی سی ۵۰۳۲۱۹ } ۱۹۷۹ء - ۱۹۸۰ء

۲۲ - ۱۷ - ۱۱ - گاندھی چوک ۔ رودور
تعلقہ بودھن ۔ ضلع نظام آباد } ۱۹۸۰ - ۱۹۸۱ء

٢٣- بنگلا لب سڑک - نیشنل ہائی وے نمبر ۷
رددور تعلقہ بودھن - ضلع نظام آباد
١٩٨١ء - ١٩٨١ء

٢٤- اندرون بستی - رددور - تعلقہ بودھن
ضلع نظام آباد -
١٩٨١ء - ١٩٨٢ء

٢٥- بی ٹی - ٥١ (B.T. 51) دودھ گاؤں
ریوینیو کالونی (Revenue colony)
پوچم پاڑ ضلع نظام آباد
١٩٨٢ء - ١٩٨٤ء

٢٦- اے ٹی - ٢٠ (A.T. 20) دودھ گاؤں
ریوینیو کالونی (Revenue colony)
پوچم پاڈ - نظام آباد
١٩٨٤ - ١٩٨٨ء

٢٧- وینکٹ رمنا اپارٹمنٹ - فلیٹ نمبر بی - ١٠٤
(B. 104) اے سی گارڈس - حیدرآباد ٢٨
١٩٨٨ء - ١٩٨٨ء

٢٨- ٩-١٤-٥٣/١ احمد کرہ - روڈ نمبر ٣
احمد پورہ کالونی - نظام آباد
١٩٨٨ء - ١٩٨٩ء

٢٩- ٩-١٥-٩٠/٤ نزد عرفات مسجد - احمد پورہ
کالونی - نظام آباد - پی سی - ٥٠٣٠٠١
١٩٨٩ء - ١٩٨٩ء

٣٠- ٩-١٥-٣٧/١ والمیکی نگر - نظام آباد
پی سی (٥٠٣٠٠١)
١٩٨٩ - ١٩٩١ء

٣١- کہانی - کتاب نگر ٧-١١-٢٤/٨
نظام آباد (٥٠٣٠٠١)
١٩٩١ - تا اپریل ١٩٩٥ء

مصنف کی زیرِ طبع کتابیں

(۱) صریرِ جاں .... (شاعری)

(۲) باتیں ہماری .... (یادیں)

(۳) جے دلی اپنا پتا پوچھے ہے ..... (افسانے)

(۴) آنگن میں سہاگن .... (طویل مختصر افسانے)

(۵) تار تار .... (افسانے)

کیسٹس cassettes

(۱) دھرا سا منظوم کہانی اور دوسرے افسانے (۶۰ منٹ) اقبال متین

(۲) صریرِ جاں ... غزلیں .... اقبال متین

★ موسیقار :- حبیب علوی (۹۰ منٹ)

(۳) صریرِ جاں .... غزلیں .... اقبال متین

★ موسیقار :- مرزا مقصود بیگ (۹۰ منٹ)